حکیم الاسلام
قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ

آیات و احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ ۱۲۰ خطبات کا مجموعہ

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کے ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے
مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے
جس کا مطالعہ قلب و نظر کو بالیدگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

۱۱

مرتب
مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ
بانی و مدیر: دار العلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق زیر نگرانی
مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب

خطباتِ حکیم الاسلام

جلد — ۱۱

آیات احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج وتحقیق کے ساتھ ۱۲۰ ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب ونظر کو بالیدگی اور فکر وروح کو بصیرت وتازگی بخشتا ہے

مرتب: مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ
بانی ومدیر: دارالعلوم رحیمیہ ملتان

تخریج وتحقیق

مولانا محمد اصغر صاحب
فاضل جامعہ دارالعلوم کراچی

مولانا راشد محمود راجہ صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

مولانا ساجد محمود صاحب
متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

تقدیم ونگرانی: مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

بیت السلام
پبلشر۔ کراچی۔ پاکستان

فلسفۂ نماز

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ . وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَاوَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ،اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّابَعْدُ!فَاَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ،بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.٥

تمہید...... اما بعد ! مجھے جس عنوان پر لب کشائی کی ہدایت کی گئی ہے اور جو عنوان میرے مضمون کے متعلق شائع کیا گیا ہے وہ ہے "فلسفۂ نماز" سال گذشتہ بھی اسی خیر المدارس کے سالانہ جلسہ پر جو مضمون مجھے دیا گیا تھا اس کا عنوان تھا "فلسفۂ ارکانِ اسلام"....

سمجھ میں نہیں آتا کہ یہاں کی مجالس سے فلسفہ ہی میرے حصے میں کیوں آیا ہے؟ حالانکہ نہ تو میں فلسفی ہوں اور نہ میری تعلیم پر فلسفہ کا غلبہ ہے اور نہ جس جماعت کی طرف میرا انتساب ہے وہی کوئی فلسفیوں کی جماعت ہے اس لیے کسی نہج سے میری طرف یہ تفلسف اور فلسفہ کا انتساب میری سمجھ میں نہیں آتا۔

فلسفے کے تین (۳) طبقے...... قدیم فلاسفہ کے (۲) دو ہی مشہور طبقے ہیں۔ 1 مشائیہ اور 2 اشرافیہ۔ مشائی کائنات کی حقیقت پر عقلی سوچ بچار سے بحث کرتے ہیں اور استدلال کے رنگ سے دنیا کی حقیقت کا سراغ لگانے کی تگ ودو میں رہتے ہیں۔ نظر وفکر ان کا علمی سرمایہ ہے اور دماغی اختراعات کا ذخیرہ ان کی پونجی۔

فلسفہ اور دین...... ظاہر ہے کہ دین اور اس کی حکمیات کو نہ دماغی اختراع سے تعلق ہے اور نہ نظر وفکر اور سوچ بچار سے وہ معرض وجود میں آیا ہے۔ وہ تو ایک خدائی پروگرام ہے جس کا تعلق نظری عقیدت اور عملی اکتساب سے ہے، اس کے حقائق برتنے سے کھلتے ہیں نہ کہ دماغ لڑانے اور عقلی گھوڑ دوڑ سے۔ اس لیے اسے مشائیہ کی عقلی تگ وتاز سے بھی کوئی نسبت نہیں ہو سکتی۔

ہاں! اگر دین کی جمع وترتیب عقلی اتار چڑھاؤ کا ثمرہ ہوتی اور وہ کسی رسمی فلسفی کی کاوش ودماغ کا ثمرہ ہوتی تو اسے عقلی چیستانوں سے حل کیا جا سکتا تھا، جیسے ہندو مذہب کہ اس کی موجودہ ہیئت ترکیبی کا پرداز رہی فلسفیانہ انداز

کا ہے اور فلسفیوں ہی کی کاوشوں کا رہین منت معلوم ہوتا ہے۔ نیز ہندوستان کا فلسفہ مشہور بھی ہے اس لیے ان کے مذہب پر فلسفہ کا دباؤ بعید از قیاس بھی نہیں۔ اس لیے اگر اس جیسے مذہب کو فلسفیانہ نقطۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو ایک بات بھی ہے لیکن اسلام ایک سادہ اور صاف خدائی مذہب ہے جس کی ابتداء وانتہاء اور اصول وفروع سب کچھ نقل صحیح اور عقل کلی کا ثمرہ ہیں۔ اس لیے جزوی عقلوں کے تفلسف کے اندازوں سے کلیۃً بالاتر ہیں اور اس لیے اس کے احکام کو مشائیانہ فلسفہ کے طرز وانداز سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہوسکتی کہ مجھ سے اس کی کسی عبادت کا فلسفہ بیان کرنے کا مطالبہ کیا جائے، یوں بھی دین کی اساس عشق ومحبت حق پر ہے اور عقل اور فلسفہ کی غرور نفس پر۔ متدین دیندار مبتلائے حق ہوتا ہے اور فلسفی مبتلائے نفس........ یہاں دماغی الجھنیں ہیں اور وہاں رسائی قلب۔ عشق ومحبت سے بڑھنے اور دوڑنے کا جذبہ ابھرتا اور کوری عقل سے مصلحت اندیشیوں میں الجھ کر پیچھے ہٹنے اور رکنے کے دواعی پیدا ہوتے ہیں۔

پس کہاں عشق کی وارفتگی اور کہاں سوچ بچار کی گھمبیر؟ اور جب کہ دونوں کی بنیادیں الگ الگ ہیں اور دین وفلسفہ میں اساسی تباین موجود ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں دین میں سے فلسفہ کس طرح پیدا کرسکتا ہوں کہ نماز جیسی خالص دینی عبادت کے فلسفہ کا مجھ سے مطالبہ کیا جارہا ہے۔ نیز عقل وفلسفہ کا دائرۂ حسیات تک محدود ہے اس لیے عقل کی کارگزاری بھی صرف محسوسات کی ترکیب وتحلیل تک محدود رہے گی۔ پس وہ دین جو خدا کی اس فطرت سے نکل کر بندوں تک آیا ہے، جہاں حسیات کے پر نہیں جم سکتے تو یہ تو حسیات کا مزدور (فلسفہ) ان لطیف معنویات کا بار اپنے ضعیف کندھوں پر کیا اٹھا سکتا ہے؟ کہ ہم دین کی عبادتوں کو فلسفہ سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ بہر حال مشائی فلاسفہ کے اصولوں پر یہ عنوان ''فلسفۂ نماز'' کوئی بامعنی عنوان ہی نہیں رہتا کہ میں تقریر میں اس کا حق ادا کرسکوں۔ ہاں دوسرا طبقہ اشراقی فلاسفہ کا ہے جو محض عقلی ڈھکوسلوں پر نہیں چلتے بلکہ کسی حد تک روشن وجدان سے بھی کام لیتے ہیں۔ یعنی یہ طبقہ محض سوچ بچار کے بل بوتے پر نہیں بلکہ محنت وریاضت اور مجاہدات سے تزکیۂ نفس کرکے اپنے اندر کچھ جلا وصفا پیدا کرتا تھا اور نظر وفکر کے بجائے مراقبہ سے کام لیتا تھا تو ان پر کچھ اسرار منکشف ہوجاتے تھے، گویا وہ اس زمانے کے صوفیا تھے جنہیں فی الجملہ صوفیاءِ اسلام سے تشبیہ دی جاسکتی ہے اور ان کے فلسفہ کو زیادہ سے زیادہ مکاشفات کا مجموعہ کہہ سکتے ہیں لیکن کشف محض خود کوئی حجت شرعیہ نہیں کہ اس سے مہمات دین کے بارہ میں کوئی فیصلہ کیا جاسکے۔ اس کے رد وقبول کا معیار دین اور اس کے قواعد ہیں۔ اگر کشف ان کے موافق ہے تو قبول ہے، ورنہ قابل رد....... لیکن قابل قبول ہوجانے کے بعد حجت شرعی پھر بھی نہیں ہوسکتا، زیادہ سے زیادہ مؤیدات کے درجہ میں رکھا جاسکتا ہے۔

پس عقل محض تو بجائے خود ہے جو مشائیہ کا فلسفہ تھا۔ کشف محض بھی مدار دمعیار شریعت نہیں ہوسکتے چہ جائیکہ عقل محض نے جس کی تگ وتاز ان کائنات اور محسوسات سے آگے ہے ہی نہیں۔ اور جبکہ شرعی احکام کے اسرار کے

انکشاف سے فلاسفۂ اشراقیہ بھی عاجز رہے ہیں جن کو فی الجملہ دینی ریاضت سے قرب بھی ہے اور گویا دوسرے لفظوں میں فلسفہ محض شریعت کے آس پاس بھی پھٹک نہیں سکتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ نماز کے عنوان کے ساتھ یہ فلسفہ کا کلمہ کیوں بڑھایا گیا ہے اور کیوں مجھ جیسے طالب علم سے جو فلسفیت سے کوسوں دور ہے، نماز کا فلسفہ بیان کرنے کی خواہش کی گئی ہے.....؟۔

اس سے آپ کو یہ بھی اندازہ ہونا چاہیے کہ جب مشائی اور اشراقی فلاسفہ بھی جن کا فلاسفہ نظری ہے، نظریات شرعیہ کے ادراک سے عاجز ہیں تو وہ فلاسفہ جن کا فلسفہ محض عملی جزئیات کے استقراء وتتبع تک محدود ہے اور وہ نظریات وکلیات میں کوئی شعور اور سلیقہ ہی نہیں رکھتے یعنی فلاسفہ یورپ تو اپنے فلسفہ سے حقائق شرعیہ کو کیا پاسکتے ہیں۔ فلاسفۂ حال کا فلسفہ درحقیقت صنعت وحرفت اور سائنٹفک ایجادات تک محدود ہے۔ عناصر اربعہ اور جمادات ونباتات یا معدنیات میں عملی ترکیب وتحلیل اور اس سے نئی صورتیں اور معیشت کے نئے نئے سامان پیدا کرتے رہنا ان کے فلسفہ کی روح ہے۔ کلّیات یا الٰہیات میں قدیم فلاسفہ کے سامنے ان کی حیثیت طفل مکتب کی بھی نہیں۔ جیسا کہ ان کی تصانیف سے واضح ہے۔

پس جبکہ نظری فلاسفہ نے بھی اس میدان الٰہیات میں سپر ڈال دی تو یہ عملی مزدور جنہیں دستکار کہنا تو صحیح مگر فلسفی کہنا فلسفہ کی توہین کرنا ہے، اس میدان میں کیا چل سکیں گے کہ ہم ان کے فلسفہ کی رو سے حکمیات شریعت کو پرکھنے لگیں۔ غرض قدماء ہوں یا متاخرین، نظری فلاسفہ ہوں یا عملی، کسی صورت سے بھی ان کے اختراعی اصول اسرار شرعیہ کو سمجھنے کے لیے معیار نہیں بن سکتے۔ کہ میں فلسفہ کے عنوان سے نماز کی حقیقت کو سامنے لاسکوں یا فلسفۂ نماز کے عنوان کی تصویب کرسکوں۔

ہاں اگر عنوان رکھا جاتا حکمت صلوٰۃ، یا حقیقت صلوٰۃ یا اسرار صلوٰۃ تو یہ ایک شرعی رنگ کا عنوان ہوتا ہے، کیوں کہ حکمت یا حقیقت، یا سِر کا تعلق ان ظواہر یا حسیات سے نہیں بلکہ باطنیات اور مغیبات سے ہے اور اس حکمت کی تلاش اگر ہم کرسکتے ہیں تو نہ یہ چیز مشائیہ سے مل سکتی ہے نہ اشراقیہ سے اور نہ ہی فرنگیت سے۔ بلکہ حکمائے اسلام اور محققین دین کے یہاں ملے گی۔ جن کے قلوب بجائے اس خاکی اور مکدر عالم سے وابستہ ہونے کے غیب کے۔ لطیف عالم سے وابستہ ہیں اور ان کی روحوں کا براہ راست حق جل مجدہ کی صفات کمال سے کنکشن ہے وہ علم کے اس پاک وصاف سرچشمہ سے علمی موتی نکال کرلاتے ہیں جس میں نہ شک کی آمیزش ہے نہ تردد اور تذبذب کی بلکہ عین یقین کے پھیلے ہوئے زلال حیات سے ہے۔

بہر حال اشراقیت اور مشائیت یا فرنگیت اور بالفاظ دیگر فلسفیت یا عقلیت دین کے لیے کبھی معیار نہیں بن سکتی کہ اس پر پرکھ پرکھ کر ہم دین کو قبول کریں یا اسے دینی حظ حاصل کرنے کا راستہ بنائیں۔

حتیٰ کہ میں تو یہ دعویٰ کرچکا ہوں اور وہ اپنی جگہ ایک صحیح دعویٰ ہے، کہ یہ حکمیت یا کشف صحیح بھی دین کے رد

وقبول کا معیار نہیں بن سکتا۔ کیوں کہ دین کا مبنیٰ وحی ہے اور قطعیت میں وحی کا مقابلہ سچے سے سچا کشف بھی نہیں کرسکتا۔ چہ جائیکہ عقل جو رات دن دھوکے کھاتی رہتی ہے اور غلط فتوے دیتی رہتی ہے۔ اس لیے عقل تو عقل سچا کشف بھی حجت شرعیہ نہیں ہے کہ اس کو دین کے ردوقبول یا دینی امور کے حقیقی اسرار وغوامض کی کسوٹی بنایا جاسکے بلکہ خود کشف کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار قواعد شرعیہ ہیں۔ تاہم اگر کسی حد تک دین کے حقائق میں بصیرت اور دل میں طمانیت پیدا کرنی ہو تو اس کا سراغ مشائیت اور اشراقیت یا فرنگیت سے نہیں بلکہ صرف حکمتِ اسلام سے مل سکتا ہے اور بس......... جس کا نام فلسفہ نہیں بلکہ حکمت یا حقیقت ہے۔

اس لیے نماز کے بارہ میں کسی فلسفیت میں پڑے بغیر اپنی بساط کے موافق اس مضمون کا حق ادا کرنے کے لیے حکمت یونان کے بجائے صرف حکمت ایمان کے چند نقطے اور دقیقے پیش کروں گا۔ جن کو فلسفیانہ غوامض کے بجائے حکیمانہ رموز سے تعبیر کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس لیے اس مضمون کا عنوان ''فلسفۂ نماز'' کے بجائے اگر حکمت صلوٰۃ رکھا جاتا تو زیادہ قرین صواب ہوتا۔

نماز کی حقیقت اور آپ کے الفاظ میں اس کا فلسفہ واضح کرنے کے لیے پہلے ایک مقدمہ اور مختصر سی تمہید کی ضرورت ہے۔ جس سے اس کی حقیقت جلد تر آپ کے سامنے آسکے گی اور وہ یہ کہ پہلے ان افراد کی حقیقت پر غور کیجئے جن پر نماز کا فریضہ عائد کیا گیا ہے یعنی خود انسان کی حقیقت کو سامنے لائیے۔ کیوں کہ نماز کی حقیقت کا تعلق خود انسان کی حقیقت سے ہے کہ جیسی حقیقت خدا نے جس مخلوق کی بنائی ہے ویسی ہی عبادت اس پر عائد کی ہے۔ ناقص الحقیقت افراد پر ناقص طاعت، کہ جو ان کے حق میں کامل ہے اور کامل الحقیقت مخلوق پر کامل عبادت جو واقع میں کامل ہے۔

پس غور اس پر کرنا ہے کہ خود انسان اپنی خلقت اور حقیقت سے کامل ہے یا ناقص۔ اگر کامل ہے تو ضروری ہے کہ عبادت بھی اس کی کامل ہو۔

سو ہم نے جہاں تک انسانی حقیقت پر غور کیا اسے ''حقیقتِ جامعہ'' پایا۔ یعنی انسان تمام کائناتی حقیقتوں کا مجموعہ اور خلاصہ ہے اور عالم میں جس قدر بھی حقائق ہیں ان سب کے نمونے اس میں رکھ دیئے گئے ہیں۔ گویا ایک انسان خود تنہا ایک مستقل عالم اور پورا جہان ہے۔ اس لحاظ سے اگر پورے جہان کو عالم اکبر یا شخص اکبر کہیں گے تو اسے عالم اصغر یا شخص اصغر کہیں گے۔ کہ انسان خود ایک ایسا عالم ہے جو مجموعۂ عوالم ہے۔ چنانچہ غور کیجئے کہ عالم کائنات کی دو (۲) ہی قسمیں ہیں۔ عالم شاہد 1 اور عالم غیب 2 عالم شہادت یہ اجسام کا عالم ہے، جو آنکھوں سے مشاہدہ اور محسوس ہوتی ہے اور عالم غیب وہ عالم ہے جو جسمانیت سے پاک ہے۔ اور آنکھوں سے اوجھل صرف دل کی آنکھ سے نظر آتا ہے یعنی اس پر یقین رکھنا پڑتا ہے جیسے آسمان سے اوپر روحانیت کا عالم، ملائکہ علیہم السلام، ذات وصفات حق اور عالم اسرار غیب۔ نزول وحی، کلام الٰہی، رسالت ونبوت کا اعطاء علوم ومعارف، کمالات حق وغیرہ ہیں۔

ٹھیک اسی طرح سمجھو کہ انسان میں ایک عالم شہادت ہے جو محسوس ہے، وہ بدنی عالم اور جسمانی جہان ہے جس

میں گوشت پوست، ہڈی، چمڑہ، اعضاء بدن اوراجزاءِ زمین شامل ہیں۔ایک عالم غیب ہے جو آنکھوں سے محسوس نہیں جیسے روح انسانی کہ اس میں علوم کے سرچشمے ہیں،صفات کمال۔ جواس خمسہ اور مشاعر ادراک وغیرہ ہیں۔

پھر جیسے اس دنیا کے عالم شہادت میں دو(۲) حصے ہیں۔سفلیات 1 جیسے زمین اوران کے سبزہ زار دریا اور پہاڑ وغیرہ اور علویات 2 جیسے آسمان، چاند سورج وغیرہ۔ایسے ہی انسان میں بھی (۲) دو حصے ہیں۔ایک فوقانی حصہ ہے جس میں دماغ اور قلب ہے کہ یہی اس کے علویات ہیں اور دوسرا تحتانی حصہ ہے جس میں مختلف حسی اعمال وحرکات کی قوتیں پوشیدہ ہیں جیسے ہاتھ پاؤں پیٹ اور پیٹھ وغیرہ۔پھر جیسے زمین کے سفلیات میں حسی مادوں کی کار فرمائی ہے یعنی عناصر اربعہ آگ پانی، ہوا، مٹی کہ عالم جسمانی کی بنیاد ہی ان مادوں پر قائم ہے اور علویات میں معنوی مادوں کی کارگزاری ہے۔جیسے علوم ومعارف تدبیر وتصرف، رحمت وغضب وغیرہ ٹھیک اسی طرح انسان کے سفلیات یعنی بدن میں بھی ان ہی چاروں کے اثرات،حرارت، برودت، یبوست ورطوبت کارفرما ہیں کہ اس بدن کی بنیاد ہی ان عناصر اربعہ پر ہے اور اس کے علویات یعنی قلب ودماغ میں حواس خمسہ اور قوائے علوم وادراکات اور بدن کی تدبیر وتصرف کی قوتیں ودیعت شدہ ہیں۔وہاں قہر بھی ہے اور مہر بھی رحمت بھی ہے اور غضب بھی۔پھر سفلیات میں عناصر اربعہ کی کارفرمائی کا جو رنگ ڈھنگ ہے وہی بجنسہ انسانی سفلیات میں بھی ہے۔چنانچہ جیسے زمین ایک تودۂ خاک ہے ایسے انسان کا پورا بدن ایک مشت خاک ہے کہ یہ بنا ہوا مٹی سے ہے۔بدن پر سے میل کچیل جھڑتا ہے، وہ مٹی کے سوا اور کیا ہے۔پھر جیسے زمین ہموار نہیں بلکہ اس میں طول وعرض اور عمق سب ہی کچھ ہے کہیں اونچ ہے اور کہیں نیچ۔

ایسے ہی انسان کے بدن میں بھی اونچ نیچ، گہرائی اور اونچائی سب ہی کچھ موجود ہے، پھر جیسے زمین کے نیچے رطوبات اور پانی بھرا ہوا ہے کہ ذرا زمین کھودی تو تری نکلنی شروع ہو جاتی ہے ایسے ہی انسانی بدن کی زمین بھی ہے کہ اس کے نیچے بھی رطوبات ہیں۔ذرا بدن کاٹ دو تو خون بہنا شروع ہو جاتا ہے۔پھر جیسے زمین مختلف رنگوں کی ہے،سفید، سیاہ، سرخ، زرد، ایسے ہی بدن انسانی میں بھی مٹی کے مختلف الوان موجود ہیں۔سطح سفید ہے،مستور حصے جیسے زیر بغل، کنج ران سیاہ ہے، چہرہ پر سرخی رہتی ہے، ہڈیوں کے جوڑ پر کی کھال میں عموماً زردی نمایاں ہوتی ہے اور پوری نوع بشری پر نگاہ ڈال لو تو ہر رنگ کا انسان نظر پڑتا ہے۔مغربی انسان عموماً سفید مشرقی اور افریقی سیاہ، ہندوستانی گندم گوں، چینی زرد، عرب سرخی مائل ہوتے ہیں۔پس نوع انسانی میں بھی ہر رنگ کے افراد موجود ہیں اور ہر ہر فرد کے بدن پر بھی مختلف رنگوں کا تفاوت ظاہر ہے، پھر زمین کا کوئی حصہ صاف ستھرا ہے جو تفریح گاہ ہوتا ہے اور کوئی گندہ ہے جس پر کوڑیاں پڑتی ہیں۔ایسے ہی بدن انسانی کا کوئی حصہ تو ایسا لطیف اور صاف وستھرا ہے کہ اسے عزت سے چومتے ہیں جیسے چہرہ اور ہاتھ اور کوئی حصہ گندہ ہے جیسے زیر بغل اور اعضائے نجاستہ یا معدہ کہ کوڑیوں کی جگہ ہے۔غرض مٹی اور اس کی مخصوص صفات وکیفیات انسان میں سب موجود ہیں۔

آگ کو لو تو جیسے سارے عالم میں آگ اور برقی رو دوڑ رہی ہے، ایسے ہی انسانی بدن میں بھی ہر جگہ حرارت اور آگ پھیلی ہوئی ہے اور اس حرارت غریزی وطبعی پر ہی انسانی زندگی قائم ہے۔ پھر جیسے پتھروں اور مٹی یا لوہے کو رگڑنے سے آگ نمایاں ہونے لگتی ہے، ایسے ہی اگر انسانی بدن سے بدن یا ہاتھ سے ہاتھ رگڑنے لگے تو آگ نکلنے لگتی ہے اور بدن کا وہ حصہ خوب گرم ہو جاتا ہے اور جیسے آگ درحقیقت فیض ہے علویات کا، یعنی سورج کا، اگر سورج نہ ہو تو پتھر بھی ریت ہو کر بہہ جائیں چنانچہ جہاں سورج کی گرمی پوری نہیں پہنچتی یا دیر تک نہیں پہنچتی۔ وہاں کی چیزیں سیل جاتی ہیں اور نمناک ہو کر جھڑنے لگتی ہیں۔ ایسے ہی انسانی بدن میں بھی حرارت فیض ہے ''علویات'' کا یعنی قلب و دماغ کا، قلب ہی وہ حرارت غریزی تیاری کرتا ہے جو عروق میں بہ صورت بخار پھیلتی ہے اور روح ہوائی کے نام سے موسوم ہوتی ہے۔ اگر قلب یہ حرارت نہ بھیجے تو بدن جھڑنے لگے یا اگر قلب ہی نہ ہو تو ساری اقلیم بدن مردہ بن کر ختم ہو جائے۔

پانی کو لو تو جیسے اقلیم عالم کے گوشہ گوشہ میں پانی زمین میں سمایا ہوا ہے ایسے ہی بدن انسان میں بھی رطوبات اور پانی کی تری بصورت خون رچی ہوئی ہے جو بدن کاٹتے ہی نکلنا شروع ہو جاتا ہے پھر جیسے عالم میں چشمے جاری ہیں، کوئی بڑا دریا ہے کوئی چھوٹا۔ ایسے ہی انسان کے بدن میں رگیں اور عروق ہیں اور یہ بڑی چھوٹی نہریں بہہ رہی ہیں جن سے اقلیم بدن سیراب ہو رہی ہے۔ پھر جیسے زمین میں ماء جاری کے علاوہ ''ماء راکد'' یعنی ٹھہرا ہوا پانی بھی ہوتا ہے۔ جیسے تالاب یا دونگڑے جو بھرے پڑے رہتے ہیں۔ ایسے بدن انسانی میں بھی دونگڑے ہیں جیسے معدہ کہ اس میں پانی ٹھہرا رہتا ہے، پھر جیسا کہ زمین میں مختلف چشمے جاری ہیں کسی کا پانی شیریں ہے کسی کا شور اور نمکین ہے کسی کا تلخ اور کڑوا ہے اور کسی کا ترش ہے، ایسے ہی انسانی بدن میں بھی مختلف المذاق چشمے جاری ہیں۔ منہ سے آب شیریں کا چشمہ جاری ہے اگر وہ تلخ ہوتا تو منہ ہر وقت کڑوا رہتا اور زندگی تلخ ہو جاتی، آنکھوں سے شور چشمہ جاری ہے جس کا نمکین پانی ہوتا ہے۔ چنانچہ آنسو منہ میں چلا جاتا ہے تو نمک کا مزا آنے لگتا ہے۔ پتے سے کڑوا پانی چلتا ہے اگر وہ اپنے مستقر کو چھوڑ کر سارے بدن میں بہہ جائے تو سارا گوشت پوست بھی تلخ ہو جائے معدے سے ترش پانی چلتا ہے۔

چنانچہ ڈکار کے ذریعے اگر کبھی معدہ چھلک پڑتا ہے اور پانی منہ میں آجاتا ہے تو اس میں کافی ترشی اور کھٹئیڈ ہوتی ہے جس سے سارا منہ کھٹا ہو جاتا ہے غرض انسان میں ہر ذائقہ کا پانی اور اس کے چشمے موجود ہیں۔ پھر جیسے دنیا میں حرارت و برودت کے غلبہ یا مقامی خصوصیات سے کہیں کا دریا رواں اور کہیں کا جما ہوا، جیسے بحر منجمد شمالی اور بحر منجمد جنوبی۔

ایسے ہی انسانی بدن میں کچھ تو چشمے جاری ہیں جیسے تھوک، سنک آنسو وغیرہ اور کچھ منجمد ہیں جیسے بلغم کہ کبھی وہ سینہ پر جمتا ہے کبھی دماغ میں۔ پھر دنیا میں کہیں کے چشمے پینے کے قابل ہوتے ہیں اور کہیں گندہ پانی بہتا ہے، جن سے سب نفرت کرتے ہیں جیسے گندے نالے وغیرہ۔ ایسے ہی بدن انسانی میں ایک تو منہ سے چشمہ جاری ہے جو ہر وقت پیا جاتا ہے اور ایک پیشاب یا سنک ہے جو گندہ پانی کو یا گندی نالی سے بہتا ہے، وہ رک جائے تو اور زمین بھی

خراب ہو جائے۔ پھر دنیا میں کہیں سرد چشمے بہتے ہیں جیسے ٹھنڈے پہاڑوں پر اور کہیں گرم چشمے بھی بہتے ہیں، جہاں گندھک کا زور ہوتا ہے۔ ایسے ہی انسانی بدن میں ٹھنڈے پانی کے چشمے بھی جاری ہیں جیسے زبان سے اور گرم پانی کے چشمے بھی جاری ہیں جیسے آنسو یا پیشاب کہ وہ ٹھنڈا نہیں ہوتا۔

اور جیسا کہ زمین پر بعض جگہ ایسا مرج البحرین ہے کہ ایک ہی دریا میں ایک حصہ شیریں پانی ہے اور اسی سے ملا ہوا۔ دوسرا حصہ شور و تلخ ہے: ﴿هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ﴾. ① ایسے ہی بدن انسانی میں دماغ کو دیکھو کہ قوت ذائقہ جس سے شیریں چشمہ جاری ہے۔ اور قوت باصرہ جس سے نمکین چشمہ جاری ہے دونوں الگ الگ اور آپس میں بون بعید رکھتی ہیں۔ ایک کا دریا شیریں اور ایک کا نمکین لیکن اس کے باوجود پھر بھی دونوں دماغ کی حس مشترک میں جمع ہیں اور منبع ومخزن دونوں کا ایک ہی ہے۔ گویا چشمہ ایک ہی ہے مگر ایک حصہ تلخ ہے اور ایک شیریں۔ پھر جیسے عالم میں برسات ہوتی ہے کہ ہر ہر خطہ میں پانی ٹپکتا ہے، زمین ہی سے مانسون (مون سون) چڑھتا ہے۔ اور زمین ہی پر برس پڑتا ہے۔ ویسے ہی بدن انسانی میں بھی برسات ہوتی ہے کہ پسینہ ہر ہر جگہ ٹپکتا ہے بدن سے ابھرتا ہے اور بدن ہی پر برس پڑتا ہے، اور جیسے وہاں برسات کا موسم ہے کہ پانی اس میں خوب برستا ہے۔ دوسرے مواسم میں کبھی کبھی برس جاتا ہے۔ ایسے ہی بدن انسانی کی برسات کا موسم بھی وہی عالم اکبر کی برسات کا زمانہ ہے کہ خوب پسینہ بہتا ہے اور یوں ہر موسم میں تھوڑا بہت پسینہ آتا ہی رہتا ہے، غرض پانی کے جتنے ڈھنگ جتنے رنگ اور جتنی انواع شیریں، تلخ نمکین، پاک ناپاک، جاری، راکد، نازل مخلوط، غیر مخلوط، گرم وسرد زمین پر ہیں اتنی ہی انواع خود انسان میں بھی ہیں۔

ہوا کو لو تو جیسے اس بڑے عالم کے ہر ہر خلا میں ہوا بھری ہوئی ہے ایسے ہی انسان میں بھی جتنے خلا ہیں وہ بھی ہوا سے پر ہیں اور پھر جیسے زمین پر ہوائیں چلتی ہیں ایسے ہی انسان میں بھی چلتی ہیں۔

چنانچہ سانس کی آمد ورفت اس کی شاہد ہے، پھر جیسے کرۂ ارض پر نسیم اور صبا یا پروا اور پچھوا، ٹھنڈی اور گرم ہوائیں چلتی ہیں۔ ایسے ہی انسان میں سانس کے راستہ جو ہوا اندر جاتی ہے وہ نسیم ہے اور جو باہر آتی ہے وہ صبا ہے۔ جانے والی سرد ہے اور اندر سے آنے والی گرم ہے۔ پھر جیسے ہوائیں صاف بھی ہوتی ہیں اور متعفن بھی ایسے ہی انسان میں ڈکار آتی ہے تو ہوا خوشبودار اور خروج ریاح ہوتا ہے تو بدبودار۔ پھر جیسے زمین میں کبھی تو حبس اور گھونٹ ہو جاتا ہے جس سے جی گھبرانے لگتا ہے اور کبھی آندھیاں چلتی ہیں جس سے جہان الٹ پلٹ ہونے لگتا ہے ایسے ہی انسان میں کبھی حبس ہوتا ہے، ریاح بند ہو جاتی تو آدمی کا قلب پریشان ہونے لگتا ہے۔ اور کبھی سانس اکھڑ جاتا ہے یا دوڑنے کے سبب سانس چڑھ جاتا ہے تو سانس کی ہوا آندھی کی مثل اندر باہر سے بشدت تمام چلنے لگتی ہے، جس سے سارا آدمی ہی الٹ پلٹ ہونے لگتا ہے اور جیسے زمین کے خلاؤں میں سے اگر ہوا بالکل کھینچ لی جائے تو یہ سارا عالم ختم

---

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان: الآیۃ: ۵۳.

ہو جائے، ایسے ہی اگر انسان میں سے سانس سرے سے نکل جائے تو اقلیم تن بھی ختم ہو جائے۔

غرض ہوا کی بھی جس قدر انواع زمین میں وہ سب کی سب انہی نمونوں اور انہی کیفیات کے ساتھ انسانی عالم میں بھی ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ عناصر اربعہ کی جو کیفیت اس بڑے عالم میں ہے بجنسہٖ اس چھوٹے عالم میں بھی ہے اور جن جن اندازوں سے اس پورے جہان میں عناصر کی کارفرمائی ہے، اسی انداز سے تنہا انسان میں بھی ہے جس میں سرِ مو فرق نہیں پڑتا۔

انسانی بدن کے جمادات ...... پھر جیسا کہ ان عناصر اربعہ سے زمین پر موالید ثلاثہ پیدا ہوتے ہیں یعنی جمادات، نباتات، حیوانات، ٹھیک اسی طرح انسان میں بھی یہ تینوں موالید موجود ہیں، جمادات کو دیکھو تو مٹی پتھر اور ریت وغیرہ سب انسان میں ہیں۔ یہ ہڈیوں کا سلسلہ انسان میں پہاڑی سلسلہ ہے، گویا بدن کے پتھر ہیں، کوئی چھوٹا پہاڑ ہے کوئی بڑا اور پوری اقلیم تن میں یہ سلسلہ اسی طرح پھیلا ہوا ہے جس طرح پوری زمین پر کوہستانی سلسلہ چلا گیا ہے۔ پھر بعض اوقات تو انسان میں سے یہ متعارف پتھر اور ریت اپنی اصلی ہیئت کے ساتھ بھی نکلنے لگتے ہیں۔ جیسے گردہ میں سے پتھریاں آنے لگتی ہیں اور مثانہ میں سے ریگ آنے لگتا ہے۔ جنہیں دواؤں یہ اپریشن کے ذریعہ خارج کیا جاتا ہے، پھر جس طرح ان پہاڑوں پر مٹی جمی ہوئی ہے۔ ایسے ہی اقلیم بدن میں ہڈیوں پر گوشت چڑھا ہوا ہے۔ جو خاک کے ان تودوں کے ان پہاڑیوں پر چھایا ہوا ہے۔ پھر جیسے زمین اور پہاڑوں کے بعض حصے گرم ہوتے ہیں اور بعض سرد۔ ایسے ہی انسانی بدن کے بعض حصے بہت گرم ہوتے ہیں جیسے مستور حصے اور بعض حصے سرد ہوتے ہیں۔ جیسے سطح بدن کے تمام نمایاں حصے۔

پھر جیسے زمینی پہاڑ کے بعض حصے واجب الاحترام ہیں جیسے مقامات مقدسہ کہ ان کی زیارت کی جاتی ہے اور محبت و آداب سے انہیں چوما جاتا ہے اور بعضوں سے کراہت کی جاتی ہے۔ ایسے ہی انسانی اقلیم میں بھی ایسے ہی دو (۲) حصے ہیں۔ بعض قابل زیارت ہیں جیسے چہرہ مہرہ کہ اس کی زیارت کے لیے سفر کیے جاتے ہیں اور ادب سے پیشانی چومی جاتی ہے، دست بوسی کی جاتی ہے اور بعض حصے قابل کرامت ہوتے ہیں جن کو دیکھنا بھی شرعاً دعقلاً ننگ و عار سمجھا جاتا ہے۔ پھر جیسے زمین کے بہت سے حصے مستور ہیں کہ جن کو دیکھنے کی کوشش کرنا عبث سمجھا جاتا ہے۔ ایسے ہی بدن انسانی میں بھی بہت سے اعضاء ہیں جنہیں دیکھا جاسکتا ہے جیسے پیٹ اور پیٹھ وغیرہ مگر اس کی کوشش کرنا حماقت سمجھا جاتا ہے۔

انسانی بدن کے نباتات ...... پھر جیسے پہاڑیوں اور عام خطہ ہائے زمین میں اگانے کی خاصیت ہے اور اس پر بھی طرح طرح کے نباتات اگتے رہتے ہیں، ایسے ہی اس اقلیم تن کے ہر ہر خطہ میں نباتات کا سلسلہ بھی قائم ہے جیسے بدن پر اون اور اگے ہوئے بال ہیں۔ اور جیسے زمین کے خطوں میں کہیں گھنا جنگل ہے کہیں چھیدا۔ ایسے ہی بدن پر کہیں گھنے بال ہیں جیسے سر اور منہ پر اور کہیں چھیدے بال ہیں جیسے عام بشرۂ بدن پر ہیں۔ اور جیسے زمین میں

بعض ایسے ہیں جو برابر نشو ونما پاتے رہتے ہیں اور بعض وہ ہیں کہ یکساں حالت پر قائم رہتے ہیں، نہ بڑھتے ہیں نہ گھٹتے ہیں۔ جیسے پہاڑی خودرو سبزہ اور درخت۔ ایسے ہی بدن انسانی میں سر ڈاڑھی اور مونچھ وغیرہ کے بال وہ ہیں جو بڑھتے رہتے ہیں لیکن بقیہ جلد بدن کا رواں وہ ہے جو ہمیشہ یکساں حالت پر رہتا ہے۔ نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے۔ پھر جیسے زمین میں بعض مقامات مثل جھاڑ جھنکاڑ کے ہوتے ہیں جنہیں صاف کئے بغیر زمین پُر رونق نہیں آتی اور وہ پاک نہیں ہوتی اور بعض حصے ایسے ہیں جنہیں قائم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ زمین کا حسن ہوتے ہیں۔ ایسے ہی بدن میں بھی بعض رواں ایسا ہے جس کا صاف کرنا ہی زمین تن کی مصلحت ہے جیسے موئے بغل اور موئے زہار کہ یہ بودار جھاڑیاں ہیں۔ اور بعض کا رکھا جانا ہی حسن بدن ہے جیسے موئے سر اور موئے رخ۔ اور جیسے دنیا کے پالے ہوئے باغوں میں جب تک کہ مالی کاٹ تراش نہ کرتا رہے ان کا حسن وکمال باقی نہیں رہ سکتا بلکہ وہ اور زمین ہی کو بدنما کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی باغ بدن میں ایسے نباتات ہیں جن کی اصلاح اور کتر بیونت ہی سے بشرہ قائم ہوتا ہے جیسے موئے ریش اور موئے شوارب (مونچھ) ان کی کاٹ تراش اور اصلاح ہی سے چہرہ کا حسن قائم ہوتا ہے۔

انسانی بدن کے حیوانات ...... پھر جیسے جنگلوں اور پہاڑوں میں مختلف قسم کے حیوانات ہوتے ہیں جو اپنے اپنے نشیمن میں رہتے ہیں اور چرتے پھرتے ہیں۔ زمین کی رطوبات ان کی غذا ہوتی ہے ایسے ہی انسانی جہان کی اس نباتات میں بھی طرح طرح کے جانور پیدا ہوتے ہیں جیسے سر میں جوئیں، پیٹ میں کینچوے، معدہ میں ریسمانی کیڑے وغیرہ جو بدن ہی کے خون کو چوستے ہیں اور پلتے ہیں۔

اور جس طرح زمین کے قعر اور جگر میں حشرات الارض رہتے ہیں جن کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں۔ ایسے ہی انسانی بدن کے اندر لاکھوں حوینات ہیں۔ جو خوردبین سے نظر آتے ہیں جن کی ہیئتیں مختلف اور شکلیں رنگ برنگ ہیں جنہیں جراثیم کہا جاتا ہے۔ چنانچہ جدید تحقیقات کی رو سے خون کی ہر ہر بوند میں کروڑہا جراثیم تیر رہے ہیں جو خوردبین سے تیرتے نظر آتے ہیں۔

پھر جیسے دنیا کا ہر ہر خطہ اور ہر ہر اقلیم ایک نئی شان رکھتی ہے اور وہاں کے جانور مختلف ہوتے ہیں ایسے ہی جدید تحقیقات کی رو سے ہر ہر حصہ بدن کے جراثیم کی شکلیں بھی جداگانہ ہیں اور خاصیتیں بھی الگ الگ ہیں ان سے امراض بھی نئی نئی قسم کی پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹری اصول پر خون نکال کر ٹیسٹ کیا جاتا ہے تو ہر حصۂ بدن کے خون میں سے نئی نئی شکل وشمائل کے جراثیم نظر آتے ہیں۔

بہر حال جیسے زمین کے اوپر رنگ برنگ حیوانات ہیں اور اندر مختلف الہیئۃ حشرات الارض۔ ایسے ہی انسان میں ظاہر بدن پر بھی حوینات پیدا ہوتے ہیں، اور قعر بدن میں بھی موجود ہیں اور جیسے زمین کی مخلوقات یہیں پیدا ہوتی ہیں اور مر کر یہیں دفن ہو جاتی ہیں۔ ایسے ہی یہ جراثیم بھی بدن ہی میں پیدا ہوتے ہیں، اسی میں پلتے ہیں اور مر کر اسی زمین بدن میں دفن ہو جاتے ہیں۔

انسانی بدن میں زلزلے اور طوفان وغیرہ...... عوارض واحوال کو لو تو زمین میں کبھی کبھی زلزلے آتے ہیں جس سے ساری زمین خود بخود حرکت میں آجاتی ہے۔ایسے ہی بدن میں جھرجھریاں آجاتی ہیں جن سے پورا بدن اچانک اور ایک دم متحرک ہو جاتا ہے۔وہاں زلزلے کا سبب زمین کے اندر کی حرکات کا بھڑکنے کے لیے زور کرنا یا کسی اندرونی کوہ آتش فشاں کا پھٹنا کہا جاتا ہے، یہاں بھی اندرونی گرمی یا بھڑکاہٹ سے دل پریشان ہو جاتا ہے یا کسی غیر متوقع حادثہ سے دل ایک دم گھبرا اٹھتا ہے۔اور اس گھبراہٹ ہی سے ایک دم پورے بدن میں جھرجھری آجاتی ہے۔

پھر جب زمین پر کبھی طوفان سے غیر معتدل طور پر پانی زیادہ بہنے لگتا ہے، غیر معتدل طور پر کبھی خشکی اور قحط سالی نمایاں ہو جاتی ہے کہ ہر طرف خاک اڑنے لگتی ہے غیر معتدل طور پر کبھی آگ برستی ہے کہ ذرہ ذرہ گرما جاتا ہے اور غیر معتدل طور پر کبھی آندھیاں اٹھتی ہیں جن سے گرد وغبار اڑ کر دنیا کی فضا کو مکدر کر دیتا ہے اور سارا عالم اس سے بھرپور نظر آنے لگتا ہے۔ایسے ہی اقلیم بدن میں بھی کبھی غیر معتدل طور پر پانی کا طوفان آتا ہے تو امراض مائیہ مثل زکام ونزلہ وغیرہ رونما ہوتے ہیں کہ ناک آنکھ ہر طرف سے پانی بہتا ہوا نظر آتا ہے۔کبھی غیر معتدل طور پر یبوست کا غلبہ ہوتا ہے تو خارش شروع ہو جاتی ہے اور سارے بدن پر سے مٹی اور بھوسی جھڑنے لگتی ہے۔

کبھی غیر معتدل طور پر حرارت کا غلبہ ہوتا ہے تو امراض حارہ مثل بخار وسرسام وغیرہ ہوتے ہیں کہ بدن کی رگ رگ گرما جاتی ہے اور تپش دکھائی دیتی ہے، کبھی غیر معتدل طور پر ہوائی مادہ بڑھتا ہے تو اورام بدن کو گھیر لیتے ہیں اور ساری اقلیم بدن پھولی ہوئی نظر آتی ہے۔

غرض عناصر کے غیر معتدل غلبہ سے جو غیر معتدل آثار اقلیم عالم میں آتے ہیں وہی اقلیم بدن میں بھی رونما ہوتے ہیں۔پھر جیسے عالم پر کبھی کبھی ایسا دور بھی گذرتا ہے کہ اس میں عقل وحکمت کی کمی اور شہوات وغفلات کی زیادتی ہو جاتی ہے۔جس سے خود انسان انسانوں کے حق میں وبال بن جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے کی کوشش کرتے ہیں۔جنگ وجدل اور ایذاء رسانیوں کی گرم بازاری ہو جاتی ہے۔ایسے ہی اقلیم بدن میں بھی بعض دفعہ ایسے بحرانی امراض پیدا ہوتے ہیں کہ آدمی اپنے ہی بدن کو نوچنے اور اپنے ہی اعضاء کو کاٹنے لگتا ہے۔کپڑے پھاڑ ڈالتا ہے اور اسے اچھے برے کی کچھ خبر نہیں رہتی اور جیسے ان حالات اور عام اوقات میں زمین پر بادشاہت کام کرتی ہے، عام رعایا کی طاقت سے نظم ملک باہر ہوتا ہے نیز بادشاہ کے لیے وزراء اور جنود وعساکر ہوتے ہیں جو نظام ملک قائم رکھنے میں اس کے مددگار ہوتے ہیں ایسے ہی اقلیم بدن کا بادشاہ قلب ہے جس کے حکم پر یہ ساری کائنات چلتی ہے۔دماغ اور اس کے حواس وزیر ومشیر ہیں۔معدہ خزانچی ہے جس سے مادی رزق ساری اقلیم میں تقسیم ہوتا ہے اور ہاتھ پیر جنود وعساکر ہیں جن کی مدد سے ملک بدن کا نظم درست کیا جاتا ہے اور عام غیر معتدل حالات میں عملی تدبیر کی جاتی ہے۔غرض انسانی بدن میں مادی عوارض بھی بعینہٖ ویسے ہی ہیں جیسے کہ مادہ کی اس بڑی کائنات کے ہیں۔

علویات وفلکیات...... اب ارضیات کے بعد فلکیات یا سفلیات کے بعد علویات کو لو، انسان میں علویات کی

بھی وہی تفصیل ہے جواس کے باہر کے آسمان پر ہے۔آسمان پر چانداور سورج ہیں کہ جن سے عالم میں روشنی ہوتی ہے۔ یہاں اقلیم کے بدن آسمان یعنی سر میں (۲) دوآنکھیں ہیں جو مثل چانداور سورج کے روشن ہیں کہ ان ہی سے جہان میں چاندنا (روشنی) ہے اور اچھی بری چیزیں دکھائی دیتی ہیں ۔وہاں ستارے ہیں جن سے لوگوں کو رستہ ملتا ہے اور راستوں کی راہنمائی ہوتی ہے ۔ یہاں دماغ میں غور وفکر کی ہیئات ہیں جن سے انسان کو عمل کی راہیں ملتی ہیں، گویا ہزار نظریات آسمان دماغ کے ستارے ہیں جو ہدایت کی راہ استوار کرتے ہیں۔اور جیسے ستارے دنیا میں مادی تاثیرات پیدا کرتے ہیں ۔جڑی بوٹیوں اور مزاجوں میں مختلف گرم وسرد اثر ڈالتے ہیں ایسے ہی آسمان دماغ کے یہ فکری ستارے بدن پر اچھے برے اثر ڈالتے ہیں۔

فکر غم ہے تو بدن گھلنے لگتا ہے۔فکر مسرت ہے تو بدن تر وتازہ ہو جاتا ہے اور عملی قوت بڑھ جاتی ہے حتی کہ مزاج تک بدل جاتے ہیں ۔ پھر جس طرح آسمانوں کے اوپر عالم غیب میں جنت ہے جس میں سوائے مسرت واطمینان کے کسی غم کا نشان نہیں اور غیب ہی میں جہنم بھی ہے کہ وہاں سوائے غم وتردد کے کسی خوشی کا نشان نہیں اسی طرح انسان کے باطن میں آثار مصائب وغم اور تشویشات مثل جہنم کے ہیں ۔کہ انسانی نفس ہر وقت کوفت اور کلفت کا شکار رہتا ہے اور آثار فرح وسرور اور بشاشت وطمانیت مثل جنت کے ہیں کہ ان میں منہمک ہو کر انسانی نفس مگن اور دنیا ومافیہا سے بے فکر ہو جاتا ہے،غرض جیسے جنت مجموعۂ لذات ہے ایسے ہی انسان کا باطن بھی مجموعۂ لذات ہے اور جیسے جہنم مجموعۂ آفات ہے، ایسے ہی باطن انسان بھی مجموعۂ آفات ہے۔

پھر جیسے آسمانوں میں سب سے برتر اور فوق تر عرش ہے جس پر خالق کی تجلیات کا بلا واسطہ دور دورہ ہے۔اسی طرح یہاں تمام فوقانی اشیاء اور علویات سے بالاتر آدمی کا لطیفۂ قلب ہے جو تجلی گاہ ربانی ہے یعنی فلکیات بدن کا عرش۔

اور جیسے آسمان میں فرشتے مخفی خدمات انجام دیتے ہیں کہ ان میں عصیان کا نشان نہیں اور وہی مدبرات امور ہیں ایسے ہی انسانی آسمان یعنی دماغ میں حواس خمسہ ہیں جو اقلیم بدن کی مخفی خدمات ملائکہ کی طرح انجام دیتے ہیں اور مدبرات بدن ہیں اور قلبی احکام کے سامنے ان میں عصیان کا نشان نہیں۔ بلکہ قلب کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ مثلاً قلب نے دیکھنے کا اشارہ کیا تو اسے آنکھ کو حکم دینے کی ضرورت نہیں بلکہ آنکھ قلب کا ایما پاتے ہی مصروف دیدار ہو جاتی ہے ۔ذرا بھی عصیان نہیں کرتی کان قلبی اشارہ سے مصروف شنید ہو جاتے ہیں ۔نام کو عصیان نہیں کرتے اسی طرح تمام حواس خمسہ کو سمجھ لیا جائے اور پھر جیسے آسمان کے نیچے اس غیبی عالم میں شیاطین بھی ہیں جو حکم الٰہی کے سامنے کبھی نہیں جھکتے بلکہ خود گمراہ ہو کر پوری کائنات کو بھی گمراہ کر دینا چاہتے ہیں اور معاصی کو طرح طرح کی مزین صورتوں میں پیش کر کے عالم کے سامنے قابل قبول بناتے رہتے ہیں۔

ایسے ہی اقلیم بدن میں آسمان دماغ کے نیچے انسان کا نفس ظلمانی مثل شیطان کے ہے اور ہوا وہوس وساوس اس کے آلات کار ہیں کہ نہ وہ اپنی جبلت سے قلب کی صلاح مانتا ہے نہ اس کے اشاروں پر چلتا ہے۔ بلکہ ہمیشہ

فانی لذات میں منہمک ہوکر ساری اقلیم بدن کو تباہی میں ڈالتا رہتا ہے۔معاصی اور اسراف عمل کی صورتیں خوب لذیذ بنا کر آدمی کے سامنے کرتا رہتا ہے اور آدمی عاجل لذات اور فانی صورتوں کی رنگینیوں پر فریفتہ ہوکر ان میں منہمک ہو جاتا ہے۔تھوڑی دیر کی عارضی لذت ضرور مل جاتی ہے مگر انجام کی ندامت و پشیمانی اور بعد کا بھگتان مفت میں سر پڑ جاتا ہے جس کا پھر کوئی تدارک نہیں ہوتا۔بس انسانی کائنات میں جیسے جنت ونار تھی ویسے ہی ملائکہ وشیاطین کے نمونے بھی نکلے۔غرض فرش خاک سے لے کر عرش پاک تک مخلوقات کے جتنے رنگ ڈھنگ،ان کے احوال وعوارض کے جتنے اتار چڑھاؤ اور جس قدر بھی احوال و کیفیات ہیں خواہ وہ عنصریات کے ہوں یا مجرورات کے،حیوانوں کے ہوں یا نباتات و جمادات کے،سفلیات کے ہوں یا علویات،ارضیات کے ہوں یا فلکیات، حسیات کے ہوں یا حقائق کے،سب ہی کے نمونے انسان میں موجود ہیں۔اور یہ انسان مخلوقات کے تمام نمونوں کا جامع ہوکر گویا مجموعۂ مخلوقات یا خلاصۂ کائنات ہے۔

انسان میں کمالات خالق کے نمونے......لیکن اگر اور عمیق نگاہ ڈالو اور فکر کو گہرائی کی طرف لے جاؤ تو اس مشت خاک میں ایک مخلوقات ہی کے نمونے نہیں بلکہ خالق جل وعلا کے کمالات کے بھی سارے ہی نمونے ودیعت کیے گئے ہیں اور جس طرح وہ مجموعۂ انواع واحوال مخلوقات ہے۔اسی طرح از سر تا پا مظہر تجلیات الٰہی بھی نظر آتا ہے۔گویا اگر انسان کا عالم شہادت یعنی بدن حسیات کے تمام نمونوں کا مرکز ہے تو اس کا عالم غیب اور غیب الغیب یعنی لطیفۂ روح معنویات اور روحانیات اور الٰہیات کا مرکز ہے۔اور جو رنگ اللہ کی تدبیر وتصرف،علم وخبر ،حکمت وصنعت،ایجاد وابداع اور پھر قدوسیت وتنزہ کا ہے وہی انسانی روح کا بھی ہے،چنانچہ اگر ساری کائنات کے لیے وہ ذات بابرکات مدبر اور حکیم ہے جو اپنی حکمت وقدرت سے عالم کو سنبھالے ہوئے ہے کہ اگر ذرا رخ ہٹائے تو سارا عالم درہم برہم ہو جائے۔

ایسے ہی روح انسانی اس بدن سے اپنا رخ پھیر لے تو یہ ساری بدنی اقلیم بے جان ہوکر گل سڑ جائے اور جیسے ان تمام مختلف رنگ جہانوں کے لیے وہی ایک مدبر ہے جس کے ساتھ کوئی دوسرا سہیم وشریک نہیں۔ایسے ہی بدنی عالم کے لیے صرف ایک ہی روح مدبر بدن ہے جس کے ساتھ کوئی دوسری روح سہیم وشریک نہیں۔

اور جس طرح وہ واحد قہار یقینی اور حتمی ہونے کے باوجود نگاہوں سے اوجھل اور بصری ادراک کے احاطہ سے بالاتر ہے۔ایسے ہی روح انسانی بھی باوجود متیقن ہونے کے خود یقین کنندوں کی نگاہوں سے اوجھل اور احاطۂ بصر سے باہر ہے اور جیسے وہ خالق یکتا عالم کو نئی نئی صورتیں دیتا رہتا ہے مگر خود صورت سے پاک ہے ایسے ہی روح انسانی بدن کو طرح طرح کی حرکاتی ہیئتیں دیتی رہتی ہیں،مگر خود ہر قسم کی ہیئت وصورت سے پاک ہے۔پھر جیسے خالق اکبر نے باوجودیکہ عالم کو بوقلمون رنگینیاں اور رنگ برنگ کے جلوے دے رکھے ہیں مگر خود ہر رنگ سے پاک ہے۔ ایسے ہی روح انسانی بدن کو تو طرح طرح کی رنگینیاں اور تازگیاں دکھلاتی رہتی ہے مگر آج تک اس کا رنگ کسی نے

نہ پایا کہ اس کی لطافتوں میں رنگ و بو کا نشان ہی نہیں۔

پھر جیسے خالق اکبر باوجودیکہ عالم کے ذرہ ذرہ میں جلوہ فرما ہے اور ہر چیز میں اس کا جلوہ سمایا ہوا ہے مگر کوئی اشارہ کر کے نہیں بتلا سکتا کہ وہ ادھر ہے یا ادھر؟ ایسے ہی روح بھی بدن کی رگ رگ میں سمائی ہوئی ہے۔ لیکن اگر بدن کی گہرائیوں میں گھس کر بھی کوئی یہ چاہے کہ اشارہ کر کے بتلا دے کہ روح وہ بیٹھی ہے یا فلاں کونے میں ہے تو نہیں بتلا سکتا اور اس اقرار کے سوا چارہ نہ دیکھے گا کہ وہ ہر کونہ میں اور بدن کے ہر ہر رگ و ریشہ میں ہے۔ تو پھر جیسے وہ ذات بابرکات باوجودیکہ ہر مخلوق سے تعلق رکھتی ہے لیکن پھر بھی اس کے تعلقات کی نوعیتیں الگ الگ ہیں۔ جو تعلق اسے عرش سے ہے وہ فرش سے نہیں، جو بیت اللہ سے ہے وہ عام مساجد سے نہیں۔ جو معابد سے ہے وہ عام مواطن سے نہیں۔ اسی لئے قوی التعلق مقامات میں عظمت وقوت کے جو آثار ہیں وہ ضعیف التعلق مقامات کو حاصل نہیں۔ چنانچہ اگر وہ نقطۂ تعلق جسے ہم بیت اللہ کہتے ہیں دنیا میں باقی نہ رہے تو عالم ہی باقی نہ رہے گا۔ ایسے ہی روح کا تعلق گو ساری ہی اقلیم بدن سے ہے مگر جو اس جہان کے عرش یعنی قلب سے ہے وہ دماغ میں نہیں اور جو دماغ سے ہے وہ دوسرے اعضائے رئیسہ سے نہیں اور جو اعضائے رئیسہ سے ہے وہ اعضائے مرؤسہ سے نہیں۔ اس لیے روح کے جو آثار حسیات قلب میں ہیں وہ دماغ میں نہیں اور جو دماغ میں ہیں وہ دوسرے اعضاء میں نہیں، یہی وجہ ہے کہ اگر قلب تک ذرا بھی کوئی برا اثر پہنچ جائے تو زندگی کی کوئی صورت ہی نہیں رہتی۔ سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ دماغ میں اگر چوٹ پڑ جائے تو حیات باقی نہیں رہ سکتی۔ بخلاف دوسرے اعضاء کے جیسے ہاتھ پیر کہ اگر کاٹ بھی دیئے جائیں تب بھی زندگی ختم ہو جانا ضروری نہیں اور سب سے نازل درجہ کا عضو ایڑی کہ اگر اسے کاٹ بھی دیں تو قطع حیات تو بجائے خود ہے، تکلیف کی کوئی شدت نہیں ہوتی اور اس سے بھی گرے ہوئے اجزاء بال یا ناخن ہیں کہ اگر وہ کاٹ دیئے جائیں تو سرے سے کوئی اذیت وکلفت ہی آدمی کو نہیں پہنچتی۔

پس روح کے تعلق کی قدر ہی اعضاء بدن میں آثار حیات ہیں اور بقدر آثار ہی اعضاء کو راحت وکلفت ہوتی ہے۔ پس جو نوعیت تعلق مع اللہ کے درجات ومراتب کی اجزائے عالم کے ساتھ ہے۔ وہی نوعیت روح کے تعلق کی اعضائے بدن کے ساتھ بھی ہے۔ پھر جس طرح عالم میں کتنا ہی شر ہو اور گندگی اچھلے لیکن اس ذات اقدس کی پاکیوں تک برائی کی رسائی نہیں "وَالشَّرُّ لَيْسَ اِلَيْكَ" ایسے ہی نفسانی غلاظتیں کتنی ہی اچھلیں مگر روح کی پاکی تک کسی کدورت وغلاظت کا اثر نہیں پہنچتا، وہ اسی طرح لطیف غیر مرئی اور حاکم ومتصرف رہتی ہے۔

پھر جیسے حق تعالیٰ کی صفت ہدایت وارشاد ہے جس کی یہ صورت ہوتی ہے کہ وہ اپنی کائنات کو مضرات مادی وروحانی سے بچانے کے لیے اپنے ملائکہ مقربین کو مامور فرماتا ہے وہ قاصد بن کر بنی آدم کے منتخب اور جوہر افراد حضرات انبیاء علیہم السلام کے پاس علم الٰہی لے کر اترتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام اپنے بنی نوع انسان کی خیر خواہی اور ہمدردی کرتے ہوئے انہیں راہ ہدایت دکھاتے ہیں جس سے سعید انسان سعادت کو پہنچ جاتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح روح کی صفت بھی

ارشاد وہدایت ہےاس نے بھی اس کائنات بدن کی اصلاح کے لیے اپنے کچھ قاصد مقرر کیئے ہوئے ہیں جواس کے علمی خزانے ہیں اور وہ مشاعر ادراک اور حواس خمسہ میں یعنی دیکھنے سننے،سونگھنے،چکھنے اور چھونے کی قوتیں۔

وہ ملائکہ کی طرح دماغ کے عالم غیب میں مخفی اور مستور رہتی ہیں۔یہ قوتیں اپنے اپنے متعلقہ اعضائے ظاہری پر اترتی ہیں اور انہیں اپنا جلوہ گاہ بناتی ہیں گویا روح یہ طاقتیں حساس اعضاء پر جو تمام اعضائے بدن میں منتخب اور برتر ہیں القاء کرتی ہے۔مثلاً حاسہ بصر آنکھ پر،حاسۂ سمع کان پر،حاسۂ شم ناک پر،حاسۂ نطق زبان پر اور حاسۂ لمس ومس عام اعضاء پر،مگر بتفاوت اور پھر حاسۂ فہم،قلب پر،یہ اعضاء ان مختلف طاقتوں کے ذریعے پوری کائنات بدن کی حفاظت کرتے ہیں اور جلب منفعت ودفع مضرت کی مہمات انجام دیتے ہیں۔اگر کائنات بدن ان کے علم پر صحیح صحیح چلتی ہے تو محفوظ رہتی ہے ورنہ ہلاکتوں کے گڑھوں میں جا گرتی ہے۔پس قوائے احساس دماغ کے غیب میں جواس کائنات بدن کا فوق اور سما ہے بمنزلہ ملائکہ کے ہیں۔اور ان قوتوں کے مظاہر یعنی وہ اعضاء جن کے ذریعے یہ قوتیں نمایاں ہوتی ہیں بمنزلہ انبیاء کے ہیں۔پس جیسے ذات بابرکات کے کچھ پیغامبر ظاہر ہیں ایسے ہی روح کے بھی کچھ قاصد باطنی اور کچھ ظاہری نکلے۔اور گویا رسالت ونبوت کا سلسلہ کائنات بدن میں بھی جاری ہوا۔اور جیسے انبیاء کرام علیہم السلام جنس بنی آدمؑ میں سے ہوتے ہیں ایسے ہی یہ اعضائے حواس بھی جنس بدن میں سے ہیں۔

پھر جیسے کہ حق تعالیٰ کی گوناگوں صفات وکمالات میں سے کسی نہ کسی خاص صفت کے غلبہ کے ساتھ ہر ہر نبی پر تجلی ہوتی ہے گویا ہر پیغمبر اللہ تعالیٰ کی کسی نہ کسی مخصوص صفت کا مظہر اتم ہے۔ایسے ہی روح بھی اپنی کسی نہ کسی صفت سے ان ظاہری کارکنوں پر متجلی ہے اور ہر ہر عضو،آنکھ،ناک،کان اس کی ایک ایک قوت احساس وادراک کا مظہر اتم ہے۔مگر جیسے حق تعالیٰ کی سب سے زیادہ جامع تجلی جس میں اور کمالات بھی مندرج ہیں،حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے،کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں اگلوں اور پچھلوں کے تمام علوم جمع کر دیئے گئے ہیں اور اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین قرار پائے۔

ایسے ہی روح کی سب سے زیادہ جامع تجلی قلب پر ہے جس سے قلب مجمع العلوم بنا ہوا ہے۔چنانچہ حواس خمسہ میں جو بھی ادراک وشعور کا فیض ہے وہ قلب ہی کا ہے۔اگر قلب توجہ نہ کرے تو آنکھ،کان کھلے رہنے کے باوجود نہ کسی چیز کو دیکھ سکتے ہیں نہ سن سکتے ہیں۔گویا قلب میں وہ تمام احساسات جمع رہتے ہیں جو ان حواس کے ذریعے نمایاں ہوتے ہیں،خود قلب کے اپنے مفہومات اور علوم مخصوصہ الگ ہیں جو آنکھ،ناک،کان کو میسر نہیں۔

چنانچہ علوم معقولہ اور وجدانیہ وہ قلبی علوم ہیں جو آنکھ،ناک،کان کے حصہ میں نہیں آئے۔صرف قلب کے ساتھ مخصوص ہیں۔پس جو علوم ان آنکھ،ناک،کان کے ہیں وہ درحقیقت قلب ہی کے علوم ہیں اور جو مخصوص قلب کے ہیں وہ تو قلب کے ہیں ہی،اس لیے قلب خاتم الادراکات قرار پایا۔اور اس کی فضیلت تمام اعضائے ادراک پر نمایاں ہوئی۔جبکہ باہم بھی ان اعضائے حواس میں تفاوت مراتب واضح ہے۔گویا جیسے رسولوں میں باہم فرق

مراتب تھا اور آخری رسول سب سے افضل تھے کہ خاتم الکمالات تھے۔ایسے ہی ان بدنی رسولوں میں بھی باہمی فرق مراتب نمایاں ہوا۔اور ان میں ایک رسول (قلب) خاتم الادراکات اور خاتم الکمالات نکلا جس سے تفاضل رسالت اور ختم رسالت کا سلسلہ بھی اس کائنات میں جاری نظر آیا۔پھر جیسا کہ حضرت خاتم الانبیاء بوجہ جامع کمالات علم ہونے کے سارے انبیاء پر حاکم اور ان کے ادیان کے لیے ناسخ ہیں۔ایسے ہی قلب بھی ان تمام اعضائے رئیسہ و مرؤسہ پر حاکم اور ان کے ذخیروں نافذ اور متصرف ہے، آنکھ دیکھتی ہے اور اپنے مبصر کو قلب کی طرف روانہ کرتی ہے۔یہ فیصلہ قلب ہی کرتا ہے کہ آنکھ کے دیکھے ہوئے سے کام لینے کا یہ وقت ہے یا نہیں؟

کان سنتا ہے اور مسموعات قلب کے پاس ارسال کر دیتا ہے، آگے قلب ہی اس میں غور کرتا ہے کہ آیا یہ اس وقت کارآمد ہیں یا نہیں؟ اور انہیں باقی رکھا جائے یا نہ رکھا جائے؟ بہر حال اعضائے حواس تو قلب کے علوم پر نقد وتبصرہ نہیں کر سکتے مگر قلب ان پر تنقید رکھتا ہے کہ خاتم الادراکات ہے پس نسخ شرائع وعلوم بھی اس کائنات بدن میں مثل کائنات آفاق کے جاری نظر آیا۔پھر جس طرح یہ مسلمہ عقیدہ ہے کہ اور انبیاء کرام علیہم السلام کی نبوت ومعرفت حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ومعرفت سے مستفاد اور وابستہ ہے ایسے ہی یہاں بھی ہے کہ ان اعضاء کو اس کا علم قلب کی قوتِ علم سے مستفاد اور وابستہ ہے۔اور قلب بالذات مدرک ہے۔چنانچہ جب آنکھ، کان بند ہو جاتے ہیں تو تنہا قلب سوچتا اور تدبر کرتا ہے تو ساری کائنات کے نقشے عالم خیال میں خود ہی دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔کسی طرح ان اعضائے حواس کا دست نگر نہیں ہوتا لیکن اگر قلب بند ہو جائے یا کسی انقباض کے سبب توجہ چھوڑ کر ربودگی کے عالم میں چلا جائے تو یہ سارے اعضاء بے کار محض رہ جاتے ہیں۔نہ دیکھ سکتے ہیں نہ سن سکتے ہیں جس سے صاف واضح ہے کہ ان اعضاء کا علم تو قلب کا فیض ہے مگر قلب کا علم ان اعضاء کا فیض نہیں، قلب علم میں ان کا محتاج نہیں، مگر یہ سب اپنے ادراک میں قلب کے محتاج ہیں۔پھر جیسا کہ مختلف انبیاء کے مختلف علوم حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو جاتے ہیں اور وہیں سے شروع ہوتے ہیں یعنی اللہ کے کمالات کے لیے نقطۂ فیض ذات محمدی ہے کہ خدا کے کمالات اولاً آپ کی ذات بابرکات پر اترتے ہیں اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے علم وحکمت سب کو حسب الاستعداد بتفاوت درجات تقسیم ہوا ہے۔

اسی طرح روح کے بھی تمام علوم وکمالات کا نقطۂ فیض قلب ہے کہ روح کے کمالات کا فیضان سب سے اوّل قلب پر ہوتا ہے حتیٰ کہ حیات وزندگی بھی اوّل اسی پر اترتی ہے، اور پھر اس کے واسطے سے تمام اعضاء کو یہ وجودی کمالات حسب حیثیت تقسیم ہوتے ہیں پس یہ تمام اعضاء قلب سے کسب فیض کرتے ہیں۔اور قلب براہ راست روح سے کسب فیض کرتا ہے، اس لیے تعین اول کی نظیر بھی کائنات بدن میں نکلی، پھر جس طرح انبیاء علیہم السلام اپنی تعلیمات سے مخلوق کو راہ ہدایت دکھلا کر نفع ونقصان سمجھا دیتے ہیں کوئی جبر واکراہ نہیں کرتے بلکہ عمل کی استعداد پیدا کر کے عمل کرنا لوگوں کے ارادہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ایسے ہی یہ بدنی رسل (اعضائے حواس اور قلب) بھی اشیاء

کے حسن قبح کو دکھلا کر نفس میں برائی سے بچنے اور بھلائی کو سمیٹنے کی استعداد پیدا کر دیتے ہیں، نفس پر جبر نہیں کرتے۔ بلکہ نفس کے ارادے پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ اس پر عمل کرے۔ سعید نفوس ضمیر کی آواز پر لبیک کہہ کر فلاح دارین حاصل کر لیتے ہیں اور شقی نفوس اس سے بے پرواہ ہو کر اپنے کو ابدی ہلاکت میں مبتلا کر لیتے ہیں تو گویا ''لا اکراہ فی الدین'' کا نقشہ بھی ہمارے اندر نکلا۔ پھر جس طرح انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے مطابق نفس انسانی روحانی غذائیں جب باطن میں پہنچاتا ہے تو حق تعالیٰ ان نفوس کے لیے ان غذاؤں کے نیک و بد ثمرات آخرت میں سامنے کر دیں گے اسی طرح بدنی کائنات میں بھی جب نفس اپنے ارادے سے بدن کی زندگی قائم رکھنے کے لیے مادی غذائیں معدہ میں پہنچاتا ہے تو روح اپنی تربیت سے اس کے ثمرات بدن پر نمایاں کر دیتی ہے، اچھی غذاؤں کے اچھے ثمرات، صحت وقوت اور نشاط کی صورت میں ردی غذاؤں کے ردی ثمرات مرض وضعف اور حزن وملال کی صورت میں یعنی ذرہ ذرہ خیر وشر سامنے آجاتا ہے۔ گویا سزا و جزا اور معاد کے نمونے بھی انسان میں موجود ہیں۔ غرض مبداء ہو یا معاد۔ نبوات ہوں یا احکام آخرت ہوں یا سزا و جزا۔ حق تعالیٰ کے کمالات وصفات ہوں یا افعال۔ ان سب کے تمام ہی نمونے انسان کے عالم غیب یعنی روح میں موجود ہیں اور یہ واضح ہو گیا کہ.... انسان ایک ایسی حقیقت جامع ہے کہ اکوان واعیان کی ساری ہی حقیقتیں اور صورتیں اس میں جمع، الٰہیات اور مخلوقات کے سارے ہی نمونے اس میں موجود ہیں اور ہر ہر انسان گویا مستقل جہان ہے۔ جس میں ظلماتی اور نورانی، شیطانی اور رحمانی، مادی اور روحانی سارے ہی انموذج قائم ہیں۔

آسمانہاست در ولایت جان ۔۔۔ کار فرمائے آسمان جہان
دورہ روح پست وبالاہست ۔۔۔ کوہ ہائے بلند وصحراہست

غرض..... میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں۔

تمہید سے مقصود کا استنباط...... اب غور کرو کہ جب انسان ایک طرف تو مخلوقاتی نمونوں کا جامع ہے اور ایک طرف ربانی نمونوں کا مظہر ہے۔ کل مخلوقات کی بھی ساری شانیں اس میں علی وجہ الاتم جمع ہیں اور الٰہیات کی بھی تمام شئون اس میں موجود ہیں تو ان دونوں نمونوں کی جامعیت کے لحاظ سے دو ہی فریضے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ ایک مخلوقاتی کام اور ایک الٰہیاتی کام۔ یعنی ایک وہ کام جس کو الٰہیات چاہتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ مخلوق کا بحیثیت مخلوق الٰہی ہونے کے اس کے سوا کیا کام ہو سکتا ہے کہ اپنے خالق کے سامنے جھکے، گڑگڑائے اور گریہ وزاری کرے۔ اسی کو اصطلاح مذہب میں عبادت کہتے ہیں، کیوں کہ عبادت کے معنی ہی انتہائے تذلل اور اظہار عجز ونیاز واعلان احتیاج کے ہیں اور نمونۂ الٰہیات ہونے کی حیثیت سے اس کا کام وہ ہوگا جسے شان الٰہیت چاہتی ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ کا کام اپنی مخلوق پر توجہ کرنا، رحم کھانا، اس کی تربیت کرنا اور اس کے نفسانی نقائص دور کر کے اسے پاک بنانا ہے۔ اس لے جہاں تک بھی ہو مخلوق اس کی اطاعت کرے جس کی وجہ یہ ہے کہ خالق منبع کمالات ہے اور کمالات کا نتیجہ عجز

نہیں بلکہ غنا ہے۔ مالک کمالات میں تاثر نہیں ہوسکتا بلکہ اس کا حق تاثیر ہے۔ اس لیے خالق کا کام کسی کی توجہ حاصل کرنا نہیں بلکہ خود توجہ فرمانا ہے۔ کسی سے کمال لینا نہیں بلکہ مانگنے والے کو خود کمالات کا حصہ دینا ہے۔

پس انسان بھی جب کہ نمونہ ہائے الٰہیہ کا جامع ہے تو اس حیثیت سے اس کا کام بھی یہی ہوگا کہ وہ عالم پر توجہ مبذول کرے، اس پر اپنا نظام قائم کرے اس کے ذرے ذرے کو اپنے کنٹرول میں رکھ کر ہر ہر چیز کو اس کے محل پر رکھے اور اسی کے مناسب حال اس کی تربیت کرے، اسی کو اصطلاح مذہب میں **خلافت** کہتے ہیں۔ بس خلاصہ یہ نکلا کہ بحیثیت مخلوقیت کے نمونوں کے انسان کا فریضہ عبادت نکلتا ہے اور بحیثیت الٰہیت کے نمونوں کے اس کا فریضہ خلافت ہوتا ہے۔ ہاں پھر جبکہ انسان محض ایک مخلوق ہی نہیں بلکہ مخلوقیت کے تمام نمونوں کا جامع تھا گویا اس کی مخلوقیت حد کمال کو پہنچی ہوئی تھی تو اس کی عبادت بھی اتنی مکمل ہونی چاہیے کہ اس میں ساری ہی مخلوق کی عبادتیں مجتمع ہوں اور ایسے ہی جبکہ وہ الٰہیات کا کوئی معمولی یا ناتمام سا نمونہ نہ تھا بلکہ ربانی کمالات کے تمام ہی نمونوں کا جامع تھا، جیسا کہ خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ سے ظاہر ہے اور اس لیے یہ مسجود ملائکہ بھی بنا تو اس کی نیابت وخلافت بھی اتنی ہی مکمل ہونی چاہیے کہ اس میں خلافت کا ہر پہلو بلکہ ہر ہر نوع جمع ہو۔ خواہ وہ خلافت روحانی ہو یا خلافت مادی۔ اور خواہ وہ خلافت ظاہری ہو یا خلافت باطنی۔

پھر خواہ وہ خلافت انفرادی ہو یا خلافت اجتماعی۔ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر آپ غور کریں گے تو تعجب سے دیکھیں گے کہ ایسا جامع کام جس سے عبادت وخلافت کے دونوں فریضے بیکدم انجام پاسکتے ہوں اور پوری جامعیت کے ساتھ ادا ہوسکتے ہوں وہ صرف نماز ہے کہ نہ اس سے زیادہ کوئی دوسری عبادت ہے اور نہ اس سے زیادہ جامع اسلوب پر کوئی عمل نیابت وخلافت الٰہی کا حق ادا کرنے والا ہے۔

عبادت صرف نماز ہی ہے...... نماز میں عبادت کا پہلو نمایاں طریق پر سامنے لانے کے لیے پہلے نفس عبادت کی حقیقت کو سمجھئے تاکہ نماز کی تعبدی حیثیت بھی کھل جائے اور بحیثیت عبادت اس کی جامعیت بھی نمایاں ہو جائے۔ شرعاً عبادت کے معنی غایت تذلل۔ یعنی ایسی انتہائی ذلت اختیار کرنے کے ہیں جس کے آگے کا کوئی درجہ ہی باقی نہ رہے کیوں کہ یہ عبادت اس ذات بابرکات کے سامنے پیش کی جاتی ہے جو عزت کے ایسے انتہائی مقام پر ہے کہ اس کے آگے عزت کا کوئی درجہ نہیں۔

پس عزیز مطلق کے سامنے محض ذلیل بن جانا کافی نہیں۔ بلکہ ذلیل مطلق بننے کی ضرورت ہے پس اسی ذلت مطلقہ کا نام عبادت ہے۔ پس عبادت کی حقیقت انتہاء درجہ کی نیازمندی کے ہوئے، اب اگر آپ عبادت کی اس حقیقت کو سامنے رکھ کر اسلام کی عبادت پر ایک نظر ڈالیں گے تو معلوم ہوگا کہ اسلام میں نماز کے سوا کوئی عمل عبادت ہے ہی نہیں۔ اگر ہے تو صرف نماز ہی ہے جسے حقیقی طور پر عبادت کہہ سکتے ہیں کیوں کہ عبادت اسلامی جن پر اسلام کی بنیاد رکھی گئی ہے چار ہی ہیں، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج۔ ان میں سے اگر آپ زکوٰۃ کو دیکھیں تو وہ کسی طرح

بھی اپنی حقیقت کے لحاظ سے عبادت نہیں ہوسکتی۔ کیوں کہ زکوٰۃ کے معنی خدا کے لیے مال خرچ کرنے کے ہیں۔ جس کا حاصل مال سے مستغنی ہونے کا اعلان ہے اور ظاہر ہے کہ مستغنی ہونا کوئی ذلت کی بات نہیں کہ غنا تو خدا کی صفت ہے یا پھر اس میں عطا اور داد و دہش پائی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ داد و دہش اور جود و کرم بھی کوئی ذلت کی چیز نہیں کہ اسے عبادت کہیں بلکہ حق تعالیٰ کی ایک پاک صفت ہے اور خدا کی صفات سے متصف ہونا ظاہر ہے کہ کمالاتِ خداوندی سے تشبیہ پیدا کرنا ہے کہ جیسے خدا ان تمام وسائل مال وغیرہا سے غنی ہے اور جیسے وہ معطی ہے اپنے پروردوں کے لیے، ایسے ہی ہم بھی غنی اور معطی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اسے ذلت یا عبادت کون کہہ سکتا ہے؟ یہ تو اعلیٰ عزت کا مقام ہے، چہ جائیکہ انتہائی ذلت کا ہو، جسے عبادت کا نام دیا جائے۔ اس لیے زکوٰۃ کو اس کی حقیقت کے لحاظ سے عبادت نہیں کہیں گے۔ ہاں زکوٰۃ کا عبادت ہونا محض امتثالِ امر اور حکم ماننے کی وجہ سے ہے کہ اللہ کے فرمودہ کی اطاعت کرتے ہوئے آدمی نے اپنا مال خرچ کردیا، پس امتثالِ امر کے معنی نے اسے عبادت بنا دیا ہے۔ ورنہ اپنی ذات کے لحاظ سے اس میں عبادت ہونے کی کوئی بھی شان نہیں پائی جاتی۔

اسی طرح روزے کو لے لو تو اس کی ذات میں بھی عبادت ہونے کے کوئی معنی نہیں پائے جاتے، کیوں کہ روزہ کے معنی کھانے پینے اور جماع کرنے سے رک جانے اور نفس کو ان تینوں خواہشات اور حوائجِ بشریہ سے پاک، منزہ اور مقدس بنالینے کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز بھی کسی طرح ذلت کی نہیں ہوسکتی، کیوں کہ یہ احتیاج نہیں، بلکہ استغناء ہے اور غناء خدا کی صفت ہے کہ وہ کھانے پینے اور تمام حوائج سے مبرا اور منزہ ہے۔ پس اس تنزہ اور تقدس پر آجانا کمالاتِ الٰہیہ کے ساتھ مناسبت اور مشابہت پیدا کرنا ہے نہ کہ مخلوقیت کے اوصاف میں پھنسنا پھر اسے عبادت کون کہہ دے گا؟ کہ اس پاکی اور تنزہ میں ذلت کا کوئی شائبہ بھی نہیں ہے۔ ہاں پھر بھی روزہ اگر عبادت ہے تو محض اس لیے کہ اس میں حکمِ الٰہی کی اطاعت اور امرِ ربانی کی بجا آوری پائی جاتی ہے۔ اور یہ ترکِ حوائج محض اس کے فرمان کی تعمیل کے لیے پایا جاتا ہے کہ اس کے حکم کی بجا آوری میں یہ ترک اختیار کیا گیا ہے جس سے روزہ دار کی نیازمندی واشگاف ہوتی ہے۔ اس لیے روزہ بھی بذاتہٖ کوئی عبادت نہ نکلا صرف اضافی طور پر اس پر عبادت کا اطلاق آگیا کہ اس میں یہ نسبتی اور اضافی ذلت پائی جاتی ہے جس کو حکم کی بجا آوری کہا گیا ہے اور جس سے وہ عبادت بن گیا ہے۔

اسی طرح حج کا فریضہ بھی اپنی ذات سے تعبد کی کوئی شان نہیں رکھتا کیوں کہ حج بھی چند تروک کا مجموعہ ہے، ترکِ وطن، ترکِ زینت، ترکِ لذائذ، ترکِ راحت وغیرہا حتیٰ کہ آخر میں بصورتِ قربانی ترکِ زندگی بھی گویا کیا جاتا ہے ظاہر ہے کہ ان تمام تروک کا حاصل بھی وہی بے نیازی اور ان حوائج لباس، وطن، راحت لذت وغیرہ سے استغناء ہے اور اس کے بعد محبتِ حق کا مظاہرہ ہے اور سب جانتے ہیں کہ استغناء و محبت نہ ذلت ہے نہ نیازمندی بلکہ عین عز و کرم ہے کیوں کہ یہ دونوں چیزیں محبت و غنا شانِ حق ہیں نہ کہ شانِ عبد۔ اس لیے افعالِ حج سے بھی انسان کی احتیاج ظاہر نہیں ہوتی کہ اسے عبادت کہا جائے۔ وہ بھی عبادت ہوگا، تو اسی اطاعتِ حکم اور امتثالِ امر کی

وجہ سے غرض ان تمام اساسی عبادتوں میں سے کوئی ایک عبادت بھی اپنی ذات سے عبادت نہیں۔ سوائے اس کے کہ ان میں اضافی اور نسبتی معنی کے لحاظ سے عبادت کا نام آ گیا ہے جس سے انہیں عبادت کہہ دیا گیا ہے۔ ہاں وہ فعل جس سے سرتاپا نیازمندی، عبودیت کیشی، بے بسی و بے چارگی اور انتہائی ذلت وخواری کے سوا کوئی اور چیز ہی ظاہر نہ ہو وہ صرف نماز ہے۔

نماز میں عبات کے پہلو...... کیوں کہ نماز کے اندر (۲) دو ہی بنیادی چیزیں ہیں۔ ایک اذکار جو زبان سے متعلق ہیں اور ایک ہیأت جو اعضائے بدن اور جوارح سے متعلق ہیں۔ اذکار میں ثناء (سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ) سے لے کر فاتحہ وسورۃ تک۔ پھر تسبیحات سے لے کر التحیات وتشہد تک اپنی عبدیت، غلامی اور فدویت۔ یا اللہ کی عظمت و برتری اور لامحدود بزرگی کے سواء اور کسی چیز کا بیان ہی نہیں ہوتا اور ہیأت کے لحاظ سے دیکھو تو نیازمندانہ سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا۔ پھر رکوع میں جھکنا اور آخر کار اپنی سب سے زیادہ باعزت چیز ناک اور پیشانی کو اپنے معبود کے سامنے خاک پر ٹیک دینا اور اس کی عزت مطلقہ کے سامنے اپنی ذلت مطلقہ کا عملاً وہیئۃً اعتراف کرنا بندگی اور غلامی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

چنانچہ جب کسی کی انتہائی ذلت اور رسوائی ہو جاتی ہے تو کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص کی ناک کٹ گئی۔ یا فلاں کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ لگ گیا۔

پس جبکہ انسان اپنے ان شریف اور باعزت اعضاء کو حسی طور پر ذلت کے ساتھ خاک میں رگڑنے لگتا ہے اور معنوی طور پر قلب وزبان سے اپنے ذلیل ہونے کا اعتراف کرتا ہے تو اس سے زیادہ اپنے کو ذلیل بنانے کی اس کے پاس اور کیا صورت ہو سکتی ہے اور جب اسی حقیقت کا نام عبادت ہے اور یہ صرف نماز میں پائی جاتی ہے تو حقیقی طور پر اگر عبادت کہلائے جانے کی مستحق ہے تو وہ صرف نماز ہی.... ہو سکتی ہے کہ اس میں کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جسے عزت نفس یا اپنی تنزیہ وتقدیس کہا جا سکے، یا کسی درجہ میں بھی اسے خدائی کمالات کے ساتھ تشبہ اور تخلق بتلایا جا سکے کہ خدا کی شان کسی کے آگے جھکنا وغیرہ نہیں ہے کہ یہ سب چیزیں احتیاج سے پیدا ہوتی ہیں اور وہاں غنائے مطلق کے سوا کسی ادنیٰ احتیاج کا نشان نہیں؛۔

غرض نماز ہی ایک چیز نکلتی ہے کہ اس میں ذاتی طور پر تشبہ بالخالق کا پتہ نہیں ہے۔ بلکہ صرف تذلل للخالق اور صرف اعلان عبدیت وفدویت ہے اس لیے صحیح معنی میں عبادت کا لقب دیئے جانے کی مستحق بھی صرف یہ نماز ہی ہو سکتی ہے۔ ہاں پھر جب کہ نماز کا امر خدا کی طرف سے ہے تو امتثال امر کی نسبت بھی نماز میں آئی جس نے حج وزکوۃ اور صیام کو بھی عبادت بنا دیا تھا اس لیے نماز جہاں حقیقی عبادت تھی وہاں اضافی عبادت بھی ثابت ہوئی۔ پس حقیقت وصورت اور اضافت ونسبت ہر ایک کے لحاظ سے اگر عبادت کہلائی جا سکتی ہے تو وہ صرف نماز ہے۔

نماز ساری کائنات پر لازم کی گئی ہے...... یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی ساری مخلوق کو صرف نماز ہی

کا پابند بنایا ہے کہ عبادت ہی وہ تھی ارشادِ ربانی ہے: کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ . ① ترجمہ ’’ہر ایک نے اپنی نماز اور تسبیح کو جان لیا۔

بعینہٖ اسی طرح کہ جس طرح ہر ایک چیز نے خلقی اور پیدائشی طور پر اپنے کھانے پینے کے ڈھنگ اور اپنی طبعی خصوصیات کے رنگ کو پہچان لیا ہے کہ کوئی ذی حس بھی طبعیات میں کسی تعلیم کا محتاج نہیں ہوتا‘‘۔

غرض یہاں یہ نہیں فرمایا کُلٌّ قَدْ عَلِمَ حَجَّهٗ وَزَكٰوتَهٗ بلکہ صلوٰۃ فرمایا ہے یعنی ہر ایک نے اپنے حج وصیام وزکوٰۃ کو نہیں بلکہ نماز کو جان لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کلیہ کے عموم میں جمادات، نباتات، حیوانات، عنصریات اور مجردات سب آجاتے ہیں۔ چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ نے اپنی بعض مصنفات میں تصریح کی ہے کہ ہر ایک چیز کی نماز کی ہیئت اس کی خلقت کے مناسب حال رکھی گئی ہے تاکہ اس کی نماز اس کی خلقی وضع قطع سے طبعاً ادا ہوتی رہے۔ مثلاً درختوں میں چلنا پھرنا جھکنا نہیں ہے۔ اس لیے درختوں کی نماز صرف قیام ہے یعنی ان کی صورت نوعیہ ایسی بنائی گئی ہے کہ وہ گویا اپنی ساق پر کھڑے ہوئے قیام کے ساتھ نماز ادا کر رہے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انسان کی نماز تشریعی ہے کہ اس میں فہم وخطاب کا مادہ ہے اور درختوں کی نماز تکوینی ہے یعنی بجائے خطاب کرنے کے انہیں بنایا اس طرز پر گیا ہے کہ وہ گویا ہمہ وقت قیام کی حالت میں حکم الٰہی کے سامنے سرو قد کھڑے ہوئے اپنی نیاز مندی کا ثبوت دے رہے ہیں۔

پھر چوپایوں کی نماز صرف رکوع ہے یعنی ان کی خلقی ہیئت ایسی بنائی گئی ہے کہ وہ ہر وقت گویا اللہ کے سامنے رکوع میں جھکے ہوئے ہیں جس سے انحراف نہیں کر سکتے۔

پھر حشرات الارض یعنی رینگنے والے اور پیٹ کے بل سٹک کر چلنے والے کیڑے مکوڑوں کی نماز بصورت سجدہ ہے جیسے سانپ بچھو، چھپکلی اور کیڑے مکوڑوں کی خلقی ہیئت ہی سجدہ نما بنائی ہے کہ وہ اوندھے اور سرنگوں رہتے ہیں ، گویا یہ جانور ہر وقت اللہ کے سامنے سربسجود اور سرنگوں ہیں اور خلقی سجدوں سے اس کی یاد اور امتثال حکم میں مصروف ہیں جس سے کسی حال انحراف نہیں کر سکتے۔

پھر جبال اور پہاڑوں کی نماز بحالت تشہد وقعود ہے۔ گویا یہ ہر وقت زمین پر دو زانو جمے ہوئے ہیں اور ہمہ وقت التحیات میں ہیں، ان کی خلقت اور صورت نوعیہ ہی یہی ہے کہ وہ رکوع وسجود اور قیام نہ کریں۔ بلکہ قعود کے ساتھ عبادت میں مصروف رہیں اور جس ہیئت پر انہیں لگا دیا گیا ہے، لگے رہیں۔

پھر اڑنے والے پرندوں کی نماز انتقالات ہیں کہ نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے منتقل ہوتے رہتے ہیں جیسے انسان قیام سے قعود اور قعود سے قیام کی طرف منتقل ہوتا ہے اور اس کے یہ انتقالات بھی عبادت ہی گنے جاتے ہیں۔ پس یہ پرندے بھی جب اوپر سے نیچے کی طرف اڑتے ہوئے آتے ہیں یا اگر زمین پر ٹھہرتے ہیں تو گویا

① پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۴۱.

رکوع میں ہیں۔اور نیچے سے اوپر اڑتے ہیں تو گویا رکوع سے قومہ وقیام کی طرف جاتے ہیں اور پر پھیلا کر زمین پر اوندھے پڑ جاتے ہیں تو گویا سجود میں ہیں۔پس ان کی نماز انتقالات محض ہیں۔یہ مستقلاً رکوع میں نہ سجود وقعود میں بلکہ اڑتے ہوئے عروج ونزول کرتے رہتے ہیں۔اس لیے ایک ہیئت سے دوسری ہیئت کی طرف منتقل ہونا ہی ان کی خلقی پیدائشی نماز ہے۔پھر سیاروں اور آسمانوں۔کو دیکھو تو ان کی نماز دوران اور گردش ہے کہ ایک نقطہ سے گھوم کر پھر اسی نقطہ پر لوٹ آتے ہیں اور پھر وہی سابقہ حرکت شروع کر دیتے ہیں۔پھر زمین کی نماز سکون ہے جسے انسان کی نظر دیکھتی ہے اور یہ بالکل مبتدیوں کی سی نماز ہے۔کیوں کہ نماز کی تمام حرکات کا مبداء سکون ہی ہے پہلے آدمی ساکن ہوتا ہے،پھر حرکت کرتا ہے پس زمین بھی گویا ساکت وصامت ہو کر اپنے مرکز پر جمی ہوئی ہے اور یہ جمود وسکون اس کی تکوینی نماز ہے کہ یہ انتہائی تذلل اور خشوع ہے جو پوری نماز میں مطلوب ہے۔ارشاد ربانی ہے: وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ① ''نماز بھاری ہے مگر سکون قلب رکھنے والوں پر''۔اور یہی وہ خشوع و سکون ذلت دوسری جگہ قرآن نے زمین کی طرف منسوب فرمایا ہے۔ارشاد حق ہے: هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا. الملک ۱۵ ''وہی ذات ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو ذلیل بنایا ہے''۔

ان دونوں آیتوں کو ملانے سے واضح ہے کہ زمین کی نیاز مندی اور نماز یہی جمود اور سکون ذلت ہے۔پھر جنت ونار کی نماز۔سوال ہے کہ (اے اللہ! ہمیں ہمارے سکان سے پر کر دے) چنانچہ حدیث میں ہے کہ جنت ودوزخ دونوں نے اللہ سے یہی سوال کیا ہوا ہے کہ قیامت کے دن ہمیں پر کر دیا جائے اور دونوں کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ قیامت کے دن تمہیں پر کر دیا جائے گا۔نار کو کفار سے اور اس کی باقیماندہ جگہ پتھروں اور پہاڑوں سے اور پھر بھی خلا رہ جائے گا اور وہ ﴿هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ﴾ ہی کہی چلی جائے گی۔تو حق تعالیٰ اپنے قدم اور ایڑی سے پر کر دیں گے جس سے وہ قط قط (بس بس) چلانے لگے گی،ادھر جنت جبکہ دنیا کے تمام اطاعت شعار ایمانداروں سے پر نہ ہوگی تو اس کے لیے ایک نئی مخلوق پیدا کر کے اسے بھر دیا جائے گا۔

غرض ان دونوں عالموں کی نماز سوال اور دعا ہے۔پھر ملائکہ کی نماز اصطفاف ہے یعنی صف بندی کہ وہ قطار در قطار جمع ہو کر یاد الٰہی میں مصروف رہتے ہیں۔ہاں اس اصطفاف کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جتنی ہیئتیں ان جمادات ونباتات وحیوانات کی نمازوں میں رکھی گئی ہیں اتنی سب ملائکہ علیہم السلام کی مختلف الالوان نمازوں کو دی گئی ہیں۔ لاکھوں کی جماعت اپنے بدخلقت؟ سے قیام ہی میں ہے اور بس یہی ان کی نماز ہے۔ان گنت افراد رکوع ہی میں ہیں اور یہی ان کی صلوٰۃ ہے۔بے شمار فرشتے سجود میں ہیں اور انہیں صرف سجدہ ہی کی نماز دی گئی ہے۔بے تعداد قعود میں ہیں اور اسی کو ان کی نماز مانا گیا ہے، کتنے ہی عروج ونزول اور آسمان وزمین کے درمیان شب وروز اترنے چڑھنے میں مصروف ہیں اور یہی ان کی نماز ہے لاتعداد جو سکون وخشوع کے ساتھ ساکن ہیں اور صرف یہی ہیئت

① پارہ: ا سورۃ: البقرۃ، الآیۃ: ۴۵.

ان کی نماز ہے۔غرض اس صف بندی میں عبادت کی شاخیں مختلف ہیں جو ملائکہ کو دی گئی ہیں۔پھر یہی سب ہیئتیں جو،ان جمادات ونباتات وحیوانات اور ملائکہ میں منقسم ہیں،بنی آدم اور دنیا کی مختلف اقوام میں تقسیم کی گئی ہیں۔کسی قوم کی نماز میں محض قیام ہے۔

کسی قوم کی نماز نیم قیام کے ساتھ گھٹنوں کے بل ڈنڈوت کرنا ہے۔کسی قوم کی نماز محض رکوع ہے،کسی قوم کی نماز میں محض اوندھا لیٹ جانا گویا سجدہ ہی کرنا ہے،کسی قوم کی نماز میں دوزانوں ہو جانا یعنی قعود ہے،پھر جب کہ نماز کی ہر ایک ہیئت کے مناسب ہی اس میں ذکر اور تسبیح رکھا گیا ہے تو ان موالید ثلاثہ اور ملائکہ اور اقوام عالم کی نمازوں کی ان ہیئتوں اور شانوں کے مناسب حال ہی ان میں سے ہر مخلوق کو نماز کی تسبیح اور ذکر بھی اس کی خلقت واستعداد کے مناسب جدا جدا عطا کیا گیا ہے۔ہر ایک کی اصطلاح الگ اور لغت علیحدہ ہے کہ ایک کی زبان دوسرا نہیں سمجھتا۔بالکل اسی طرح کہ جس طرح سے ایک وطن کا انسان دوسرے وطن کے آدمیوں کی زبان نہیں سمجھ سکتا جب تک اسے سیکھ نہ لے۔

پس اگر ایک شخص اپنی وطنی زبان میں اللہ کو یاد کر کے اس کی پاکی بیان کرنے لگے تو دوسرے ملک والے یقیناً اس کی یہ بولیاں نہیں سمجھ سکیں گے۔اس لیے قرآن حکیم نے فرمایا ہے وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ① (دنیا کی کوئی چیز نہیں جو خدا کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی نہ بیان کرتی ہو مگر تم اسکی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو)۔

اس آیت میں تعمیم کے ساتھ ذرہ ذرہ کو تسبیح خواں بتلایا گیا ہے جس میں کسی نوع کی تخصیص نہیں ہے۔چنانچہ احادیث میں اس کی بہت سی تفصیلات ارشاد فرمائی گئی ہیں۔

مثلاً حدیث میں ہے کہ پانی جب تک جاری رہتا ہے تسبیح کرتا رہتا ہے درخت جب تک سرسبز رہتا ہے تسبیح کرتا رہتا ہے،کپڑا جب تک صاف ستھرا رہتا ہے تسبیح کرتا رہتا ہے۔کھانا جب تک تازہ رہتا ہے تسبیح کرتا رہتا ہے۔کنکر پتھر سب یادالٰہی میں تسبیح کرتے رہتے ہیں۔چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹھی میں چند کنکریاں اٹھائیں تو وہ زور سے تسبیح کرنے لگیں۔یعنی ان کی تسبیح سنائی دینے لگی،پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق اکبرؓ کے ہاتھ میں دے دیں تو بدستور تسبیح مسموع ہوتی رہی۔اسی طرح فاروق اعظمؓ کے ہاتھ میں بھی،پھر اسی طرح حضرت عثمان غنیؓ کے ہاتھ میں بھی۔

غرض نماز میں بھی ایک ہیئت ہے اور ایک حقیقت۔اس کی ہیئت یہ افعال وارکان ہیں اور اس کی حقیقت ذکر اللہ۔یہی دونوں چیزیں قرآن نے ہر مکون اور پیدا شدہ چیز کی طرف منسوب کی ہیں كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ صلوٰۃ اور تسبیح یعنی ہیئت ووضع صلوٰۃ اور اس کی روح یعنی تسبیح اور ذکر الٰہی اور نماز کی ہیئت وحقیقت کو ہر ایک مخلوق پر لازم کر دیا ہے۔جب کہ ہر ایک مخلوق بحیثیت مخلوق ہونے کے نمازی بنادی گئی ہے تو کیسے ممکن تھا کہ

① پارہ:۱۵،سورۃ:الاسراء،الآیۃ:۴۴.

انسان پر نماز نہ عائد کی جاتی نہیں بلکہ انسان جب کہ جامع نمونہ ہائے مخلوق تھا یعنی مخلوقیت میں حد کمال کو پہنچا ہوا تھا تو ضروری تھا کہ اس کی نماز ساری مخلوقات کی نمازوں کی بھی جامع ہو اور اس میں نماز کے سب نمونے موجود ہوں جو غیر انسان میں منتشر تھے۔

نوعِ بشر کی نماز...... چنانچہ نوع بشر میں مذاہب نے وہ ساری ہی ہیئتیں مختلف اقوام کو تقسیم کیں۔ جو ان مخلوقات میں منقسم تھیں، کسی قوم کو قیام کی نماز کسی کو تعود کی کسی کو رکوع کی اور کسی کو سجود کی۔ پھر ایسے ہی اقوام کی ان مختلف نمازوں میں اذکار بھی مختلف رکھے گئے جو ہر ایک قوم کی فطرت کے مناسب حال تھے۔ کسی پر تعوذ کے اذکار کہ وہ ہر مضر چیز سے پناہ مانگتی رہیں اور صرف دفع مضرت کا پہلو سامنے رکھیں۔ کسی پر سوال و دعا کا غلبہ کہ وہ ہر نافع چیز کو سامنے رکھ کر خدا سے منافع جلب کرتی رہیں۔ کسی پر اپنی ذاتی اغراض چھوڑ کر محض خدا کی پاکی بیان کرنے کا غلبہ کہ وہ ثناء وصفت کے بھجن گاتی رہیں۔ کسی پر تضرع کا انتہائی غلبہ کہ نیاز اور زاری کرتی رہیں اور اسی میں مخمور رہیں۔ غرض ہر قوم کو اس کی ذہنیت کے مناسب ہی اذکار تلقین کیے گئے اور ان کے مناسب شان ہیئات اور اوضاع صلوٰۃ دی گئیں۔

مگر بہر حال نوع بشر میں یہ سب امور جمع کر دیئے گئے۔ تنہا ایک قوم کوئی ایسی عارف اور شئون الٰہیہ کو پہچاننے والی نہ تھی کہ سارے اذکار و اوضاع اور ساری ہیئات ایک ہی نماز میں جمع کر کے اس کے سامنے پیش کی جائیں۔

اسلامی نماز میں ساری کائنات کی نمازیں جمع ہیں...... لیکن حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے جونہی اپنا معجزہ قرآن لاکر پیش کیا جو تمام کتب سماویہ کے علوم کا جامع تھا اور اس سے بنی نوع بشر کی ذہنیت اس درجہ منور ہوئی کہ ساری اقوام کی ذہنیتیں یکدم اس کے سامنے سرنگوں تھیں اور اس معرفت کاملہ سے اس کی ذہنیت مکمل ہوئی۔ جس سے وہ تمام شئون ربانی ان پر کھل گئیں جو مختلف اقوام پر مختلف قرون و دہور میں کھلی تھیں، تو فطرت الٰہی نے وہ تمام اوضاع واطوار جو اقوام عالم کی مختلف نمازوں میں منقسم کی تھیں۔ مسلم قوم کی نماز میں ساری لاکر جمع کر دیں۔ گویا یہ قوم جیسے معارف اقوام کی جامع ہوئی اور جیسے کہ معارف الٰہی کی جامع ہوئی، گویا ایسے ہی تمام عبادات اقوام کی بھی جامع ہوئی اور اس کی صلوٰۃ گویا مجموعہ صلوٰۃ اقوام ہوگئی۔

نماز جامع ہیئات ہے...... چنانچہ اس کی جامع نماز کی ہیئات میں قیام تو درختوں کا سا ہے، رکوع چوپایوں کا سا، صف بندی فرشتوں کی سی اور گردش و دوران آسمانوں اور سیاروں کا سا ہے کہ ایک رکعت سے چل کر پھر ویسی ہی دوسری رکعت کی طرف لوٹ آتا ہے، وہی افعال پھر کرتا ہے، جو پہلی رکعت میں کئے تھے اور یہی فرائض صلوٰۃ میں سے ہے کیوں کہ ایک رکعت نماز نہیں کم سے کم نماز ایک شفعہ ہے اور جبکہ نماز ہی کی ساری ہیئتیں جمادات، حیوانات، نباتات میں منتشر تھیں۔ تو یوں کہا جاتا ہے کہ مسلم کی نماز میں موالید ثلاثہ کی نمازیں جمع تھیں۔ پھر یہی ہیئتیں جبکہ ملائکہ کی نماز میں بھی ہیں۔ تو یوں کہنا چاہیے کہ ملائکہ کی تمام نمازیں بھی اسلامی نماز میں جمع ہیں اور یہی ہیئتیں جبکہ اقوام عالم میں منقسم تھیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ اسلامی نماز میں دنیا کی ساری قوموں کی نمازیں بھی جمع ہیں۔

نماز جامع اذکار بھی ہے...... ادھر اذکار کو دیکھو تو ملائکہ کے طبقات ہوں یا انسانوں کے پرند ہوں یا چرند ہوں کسی پر تسلیم وتقدس کا غلبہ ہے کسی پر تحمید وتمجید کا، کسی پر تعوذ کا غلبہ ہے اور کسی پر سوال کا غلبہ ہے اور کسی پر دعا کا، کسی پر کتاب کا غلبہ ہے اور کسی پر اسمائے الٰہی کی یاد کا، کسی پر درود شریف کا غلبہ ہے اور کسی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر پاک کا۔ غرض مختلف استعدادیں ہیں اور مختلف اذکار۔ مسلم کی استعداد اپنے پیغمبر کی جامع فطرت کے طفیل میں۔ چونکہ جامع مقامات تھی اس لیے اسلامی نماز میں ذکر الٰہی کی ہر ہر نوع جمع کر دی گئی ہے، اس میں تسبیح بھی ہے کہ اس کی ابتداء تسبیح سے ہے اور تحمید بھی ہے کہ الحمد اس کے لیے لازم ہے اس میں تعوذ بھی ہے کہ اعوذ باللہ سے قرأت شروع ہوتی ہے اور تسمل بھی ہے کہ اس کے بعد بسم اللہ پڑھی جاتی ہے۔ اس میں تکبیر بھی ہے کہ وہ شعار صلوٰۃ ہے اور اس میں سوال بھی ہے کہ سورۂ مسئلہ (فاتحہ) اس نماز کا جزو اعظم ہے اور دعا بھی ہے کہ اس کا اختتام بھی دعاؤں پر ہے اس میں تلاوت کتاب اللہ بھی ہے کہ وہ فریضۂ صلوٰۃ ہے اور اسماء حسنٰی کی یاد بھی ہے کہ رکوع وسجود وغیرہ میں تسبیح الٰہی مختلف اسماء عظمت سے کی گئی ہے اس میں درود شریف بھی ہے کہ تشہد اس سے بھر پور ہے اور ذکر پاک نبوی بھی ہے کہ التحیات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سب سے زیادہ بلند پایہ سیرت یعنی معراج کا ذکر ہے جو انتہائی قرب اور اللہ سے اعلٰی تقرب کے وقت ہوا تھا۔

نماز جامع صلوٰۃ اعضاء ہے...... پھر اعضاء واجزائے بدن کو لو تو ان سب پر بھی نماز حاوی ہے، زبان اس میں ذاکر ہوتی ہے قلب اس میں خاشع ہوتا ہے، دماغ اس میں متفکر ہوتا ہے ہاتھ پیر اس میں متحرک ہوتے ہیں چہرہ اس میں نگونسار ہوتا ہے انگلیاں غیر منتشر ہوتی ہیں۔ غرض ہر عضو اپنے مناسب حال اس عبادت میں حصہ لیتا ہے اس لیے نماز تمام ان افعال کی بھی جامع ثابت ہوتی ہے جو اعضائے بدن سے متعلق اور ان کے مناسب ہیں۔

نماز جامع اوقات بھی ہے۔!...... پھر ساتھ ہی نماز اوقات عبادت کی بھی جامع ہے یعنی جو وقت بھی فطری طور پر روح کے طبعی میلان کا ہے یا نفس کے طبعی انحراف کا ہے ان سب اوقات کو نماز نے اپنے اندر مشغول کر لیا ہے۔ صبح کا سہانا وقت روح کے نشاط کا تھا تو نماز فجر نے اسے لے لیا، ظہر کا وقت کسل کا تھا تو ظہر کی نماز نے اس میں چستی پیدا کر دی۔ عصر کا وقت تفریح کا تھا تو عصر نے اس غفلت کو توڑ دیا۔ مغرب کا وقت انقلاب آفات کا تھا تو مغرب کی نماز نے مقلب اللیل کی طرف جھکا دیا۔ عشاء کا وقت خاتمہ کا تھا تو نماز عشاء نے خاتمہ بالخیر کر دیا۔

پھر نفلی نمازوں نے دوسرے اوقات کی خصوصیات کے ماتحت انہیں عبادت میں مشغول کر دیا۔ گویا اگر ایک انسان تمام اذکار، عبادات کے بجائے صرف ان مقررہ واجب ونفل اوقات نماز کا اہتمام کرے تو وہ کبھی غافل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ میں تو ترقی کر کے یہاں تک کہوں گا کہ یہ اوقات زندگی ہی میں نماز موت کے اوقات کو بھی گھیرے ہوئے ہے یعنی قبر میں اگر کوئی عبادت جاری رہتی ہے یا جس کی ادائگی کا دھیان بندھ جاتا ہے تو وہ صرف نماز ہے۔ حدیث میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے اَلْاَنْبِیَآءُ اَحْیَآءٌ فِیْ قُبُوْرِهِمْ یُصَلُّوْنَ اسی طرح حدیث میں

ارشاد ہے کہ مومن کو قبر میں عین سوال و جواب کے وقت غروب آفتاب کا قرب دکھلایا جاتا ہے تو وہ گھبرا کر ملائکہ (نکیرین) سے کہتا ہے دَعُوْنِیْ اُصَلِّیْ پس قبر میں عامہ مؤمنین کو دھیان آتا ہے تو نہ حج کا، نہ روزہ کا، نہ زکوٰۃ کا، بلکہ صرف نماز کا، اور فعل کے درجہ میں اگر کوئی اطاعت قبر میں ادا ہوتی ہے تو وہ نماز ہے پس نماز کا احاطہ زندگی کے اوقات پر نہیں بلکہ بعد الموت کی زندگی پر بھی حاوی ہے۔

غرض ہیئتیں بھی نماز میں وہ سب موجود ہیں جو تکریم و تعظیم اور نیاز مندی کے اظہار کے لیے عقلاً ممکن ہیں اور اذکار بھی وہ سب ہیں جو اللہ کی شان اقدس اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اطہر کے لیے ممکن سے ممکن ہو سکتے ہیں، اوقات بھی وہ سب ہیں جو عبادت کے لیے موزوں ہو سکتے تھے۔ اس لیے اسلامی نماز جامع اذکار ثابت ہوتی ہے جس سے کمال جامعیت خوب نمایاں ہو جاتا ہے۔ پھر بایں معنی بھی اس کی جامعیت واضح ہے کہ یہ تمام افعال واذکار کا جو سارے عالم سے لا کر اس میں جمع کیے گئے ہیں وہ نماز میں پہنچ کر فی نفسہٖ بھی اتنے کامل بن گئے ہیں اور اس کی حالت کی نسبت زیادہ مکمل طریق پر بیان کیے گئے ہیں جس قدر وہ نماز سے باہر یا قدیم نمازوں میں مامور ہو کر تھے، جن کا ہر گوشہ مکمل اور پر ہیئت اور جس سے نماز بذاتہٖ نہایت مہذب بن گئی ہے۔

ہیئتِ نماز کی خوبصورتی ...... چنانچہ اس کے قیام کی خوبی اور خوبصورتی دوسری اقوام کے قیام سے بدرجہا زائد و مکمل ہے۔ جس میں چہرہ کا رخ جاءِ مستقیم پر، آنکھوں کی نگاہ سجدہ گاہ پر، ہاتھوں کی بندش ناف پر جو ادب کی انتہا ہے پیروں کی سیدھ اور فاصلہ مناسب، انگلیوں کی توجہ کعبہ کی طرف، بدن کا سڈول رکھا جانا، جس میں پیچ و تاب نہ ہو، غرض قیام کی ہر ادا موزوں اور قاعدہ میں جس سے نیاز مندی انتہائی نمایاں اور خوبصورتی کافی عیاں، رکوع میں مسطح، نہ اس میں کوب نکلا ہوا، نہ گڑھا پڑا ہوا۔ سر کمر کی برابر، نہ ابھرا ہوا نہ نیچے لٹکا ہوا۔

گویا پورا انسان ایک قوس بن جاتا ہے جس سے نیاز مندی بھی واضح ہوتی ہے اور چستی اور چابک دستی بھی مترشح ہوتی ہے جیسا کہ چاکران خدمت گزار پوری تواضع کے ساتھ چاق و چوبند ہو کر اپنے آقا کے سامنے حاضر ہو جاتے ہیں۔ سجود میں ناک اور پیشانی زمین پر۔ ہاتھ منہ سے الگ ہوتا ہے کہ منہ ہاتھوں پر نہ ٹکے اور خشوع میں فرق نہ آئے۔ بدن کشادہ نہ کہ سکڑا ہوا۔ تاکہ کسل مندوں اور سست آدمیوں کی وضع نہ بننے پائے۔ ہاتھوں کی انگلیاں غیر منتشر کہ بے فکری نہ ٹپکے کہنیاں رانوں پر ٹکی ہوئی نہیں کہ کم ہمتی نمایاں ہو، قعود میں چوکڑی کی نشست نہ ہو کہ تکبر واضح ہو۔ نہ ہاتھ کی ٹیک ساتھ ہو کہ آرام طلبی نمایاں ہو۔

نہ سرین زمین پر ٹکے ہوئے ہوں کہ جانوروں کی ہیئت پیدا ہو، نہ پیروں کے پنجوں پر نشست ہو کہ جلد بازی کھٹکے۔ بلکہ دوزانوں ہو جو ادب و تعظیم کی انتہائی نشست ہے۔ پھر اس نشست میں بھی دونوں پیروں کی انگلیاں قبلہ رُخ ہوں تاکہ ہاتھ ادب سے زانوں پر ہو اور انگلیاں جڑی ہوئی ہوں تاکہ تہذیب کا دائرہ قائم رہے۔ شہادت کی انگلی اٹھی ہوئی ہو تاکہ توحید کا شعار بلند رہے۔ پھر نماز سے خروج اور واپسی بھی اللہ کے نام سے ہو یعنی جیسا کہ

اس کی ابتداء اللہ کے نام سے ہوئی تھی یعنی اللہ اکبر سے۔ پس تکبیر سے شروع اور تسلیم پر ختم۔ تَحْرِيْمُهَا التَّكْبِيْرُ وَتَحْلِيْلُهَا التَّسْلِيْمُ۔ تا کہ ابتداء وانتہا میں فطرت و کبریاءِ حق کا آوازہ بلند ہو۔

نماز کے اجزاء میں ترتیبِ عقلی ...... پھر ترتیب افعال کیسی پاکیزہ کہ عقلاً بھی اس کے سوا دوسری نہیں ہوسکتی۔ اول قیام جو رکوع کی تمہید ہے پھر رکوع جو سجدہ کی تمہید ہے۔ پھر سجدہ جو اصل مقصود ہوتا ہے۔ گویا ہر اگلا رکن پچھلے سے نیاز مندی میں ابلغ اور بلیغ تر۔ پھر قیام فی نفسہٖ عبادت نہ تھا کہ اس میں انتہاء تذلل نہ تھا تو اس میں فاتحہ اور ثناء رکھ دی۔ تا کہ اس میں ذکر ہی سے نیاز مندی اور سوال کی الحاح وزاری پیدا ہو جائے۔ رکوع و سجود عبادت تھے تو انہیں تسبیح الٰہی سے بھرپور کیا گیا، تا کہ بندے اپنے کو ملوث اور خدا کو تلوث سے پاک جانیں۔

غرض جو تقسیم ابھی ہم نے نماز میں کی کہ ادعا عبادتیں فی نفسہٖ عبادتیں نہیں۔ اور نماز بذاتہٖ عبادت ہے۔ وہ دونوں نمونے بھی عین نمازیں جمع کر دیئے گئے کہ اس کے بعض اجزاء بذاتہٖ اطاعت نہیں جیسے قیام وقعود اور بعض بذاتہٖ عبادت ہیں جیسے رکوع وسجود وغیرہ۔ اس لیے قیام میں تعبدی ذکر غالب رکھا گیا ہے اور رکوع اور سجود فی نفسہٖ عبادت تھے تو ذکر قلیل کافی سمجھا گیا، شاید یہی وجہ ہے کہ قیام تعظیمی کو جائز رکھا گیا کہ یہ فی نفسہٖ عبادت نہیں اور رکوع وسجود تعظیمی کو بھی جائز نہیں رکھا گیا کہ وہ فی نفسہٖ عبادت ہیں اور چونکہ ان ارکان میں نیاز مندی تدریجاً بڑھتی گئی ہے اس لیے قرب بھی بتدریج بڑھتا گیا ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: اِذَا قَامَ الْعَبْدُ فِيْ صَلَاتِهٖ ذَرَّ الْبِرُّ عَلٰى رَأْسِهٖ حَتّٰى يَرْكَعَ فَإِذَا رَكَعَ عَلَتْهُ رَحْمَةُ اللّٰهِ حَتّٰى يَسْجُدَ وَالسَّاجِدُ يَسْجُدُ عَلٰى قَدَمَيِ اللّٰهِ فَلْيَسْأَلْ وَلْيَرْغَبْ۔ [1]

غرض جس ہیئت کو دیکھو خود بذاتہٖ اپنی وضع اور ساخت کے لحاظ سے اتنی مکمل اس قدر مہذب اور ایسی شائستہ کہ جانور تو بجائے خود رہے، ملائکہ تو الگ رہے خود اشرف المخلوقات انسان کی پچھلی اقوام کی نمازوں کے منقسم اجزاء میں اس تہذیب وشائستگی اور خوبصورتی کا پتہ نہیں ملتا۔ اس لیے اسلامی نماز بایں معنی بھی جامع ہے کہ اس نے کوئی نیاز مندانہ ہیئت نہیں چھوڑی جو نماز نے نہ لے لی ہو۔ اور بایں معنی بھی جامع ہے کہ اس کی ہر ہیئت خود اپنے طبعی پہلوؤں کے لحاظ سے بھی اس قدر جامع ہے، اور مکمل ہے کہ کوئی گوشہ غیر فطری نہیں ہے۔ پس اسلامی نماز اس طرح اعلیٰ جامعیت کے ساتھ ہر قسم کی نیاز مندیوں کا مجموعہ نکلتی ہے۔

نماز جامع عبادت بھی ہے ...... پھر یہی نہیں کہ وہ اقوام عالم کے اذکار وطاعت کا ایک جامع مرقع ہے بلکہ اگر غور کرو تو خود اسلام کی بھی جس قدر عبادات اور طاعات ہیں ان سب کو بھی اس نماز میں لا کر جمع کر دیا گیا ہے۔ روزہ کو دیکھو تو نماز میں موجود۔ کیوں کہ روزہ کی حقیقت نیت صادق کے ساتھ کھانے پینے اور عورتوں سے منتفع ہونے سے بچنا ہے۔ غور کرو تو یہ ساری چیزیں نماز میں لازم ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک چیز مفسد صلوٰۃ ہے

---

[1] کنز العمال ج:۷ص: ۲۸۹، ۵۲۶ .(ص عن عمار مرسلاً)

بلکہ نماز کا روزہ رمضان کے روزہ سے بھی زیادہ مکمل ہے کیوں کہ روزہ میں تو یہ تین چیزیں ہی ممنوع ہیں لیکن نماز میں ان تین کے علاوہ سلام وکلام، عورتوں کو چھونا، ہنسنا بولنا، چلنا پھرنا اور عام نقل وحرکت سب ہی ممنوع ہے۔ یعنی نماز میں ان سب چیزوں کا بھی روزہ ہوتا ہے، اس لیے نماز میں روزہ اپنی انتہائی مکمل شکل کے ساتھ موجود ہے۔

اعتکاف کو لو تو وہ بھی نماز میں مکمل شکل کے ساتھ موجود ہے کیوں کہ اعتکاف صوم میں ضروریات بشریہ کو پوری کر لینے، سو جانے، لیٹ رہنے، کھانے پینے کی تو اجازت ہے لیکن نماز میں یہ سب، امور ممنوع اور مفسد صلوٰۃ ہیں ۔حتی کہ بحالت نماز بیرون مسجد تو بجائے خود ہے، خود مسجد میں بھی ٹہلنے اور نقل وحرکت کی بھی اجازت نہیں ۔اس سے واضح ہے کہ نماز کا اعتکاف روزہ کے اعتکاف سے بھی زیادہ مکمل ہے اور نماز اعتکاف کو بھی جامع اور حاوی نکلی۔

پھر حج کو لو تو وہ بھی نماز میں موجود ہے، کیوں کہ حج کی حقیقت تعظیم بیت اللہ اور تعظیم حرم محترم ہے۔ سو نماز میں تعظیم بیت اللہ کا یہ مقام ہے کہ استقبال قبلہ شرط صحت صلوٰۃ ہے کہ اس کے بغیر نماز ہو ہی نہیں سکتی۔ اور ظاہر ہے کہ استقبال قبلہ بھی قبلہ کی اعلیٰ تعظیم ہے۔ چنانچہ یہ ہیئت تعظیم ایسے اوقات میں ممنوع کی گئی ہے جو گندے اور خسیس افعال کے اوقات ہیں جیسے کہ استنجاء کرتے وقت استقبال قبلہ ممنوع قرار دے دیا کہ تعظیمی ہیئت افعال تعظیمی کے وقت سزاوار ہے نہ کہ افعال خسیسہ کے وقت، پھر جس طرح طواف میں بیت اللہ کے سامنے رفع یدین کر کے گردش طواف شروع کرتے ہیں۔ اسی طرح نماز میں سمت بیت اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر نماز کا دوران شروع کرتے ہوئے تعظیماً رفع یدین کرتے ہیں ۔حتی کہ بنص حدیث طواف کو حکم میں نماز کے فرمایا گیا۔ الا یہ کہ اس میں سلام وکلام جائز ہے نماز میں نہیں اور پھر جس طرح طواف طرح طرح کے اذکار وادعیہ سے معمور ہے ایسے ہی نماز بھی ہر طرح کے اذکار وادعیہ سے بھر پور ہے۔

پھر جس طرح حج میں حرم محترم کی حدود میں رہ کر تا بحد عرفات یاد حق میں مصروف رہتے ہیں اسی طرح مسجد کے حرم محترم میں ذکر الٰہی اور نوافل میں مصروف رہتے ہیں۔ اور جس طرح وہاں حرم محترم میں شیطان کے آثار کو سنگریزوں سے سنگسار کیا جاتا ہے اسی طرح نماز میں اولاً ہی اعوذ پڑھ کر اس کے فتنوں سے پناہ مانگی جاتی ہے، اسی طرح نماز میں سلام وداع کر کے دربار الٰہی سے رخصت ہوا جاتا ہے۔ غرض حج کی پوری حقیقت اپنے ہی اجزاء کے ساتھ نماز میں بجنسہٖ یا بمثلہٖ موجود ہے اس لیے نماز حج کی عبادت پر بھی مشتمل نکلی۔

اسی طرح زکوٰۃ بھی نماز میں اپنی پوری حقیقت اور پوری صورت کے ساتھ قائم ہے کیوں کہ زکوٰۃ کی حقیقت تزکیۂ نفس ہے یعنی محبت دنیا سے قلب کو پاک کرنا جس کا معظم حصہ مال ہے تاکہ محبت حق کے لیے جگہ خالی ہو۔ پس مال نکال کر قلب کو حظوظ دنیا سے پاک کر لیا جاتا ہے۔ نماز کا ماحصل ہی حب ماسوی اللہ سے آزاد ہو جانا ہے، وہاں ابتداء ہی سے رفع یدین کر کے گویا بندہ ساری دنیا کی نسبت کانوں پر ہاتھ دھرتا ہے کہ میں سب سے بیزار ہوں اور صرف اللہ کی طرف آتا ہوں اور ظاہر ہے کہ یہی تزکیۂ نفس کی روح ہے کہ نفس ماسوا اللہ سے بیزار ہو کر صرف اللہ جل

ذکرہ کا ہوکر رہے، اس لیے نماز، حقیقت زکوٰۃ پر حاوی نکلی۔ حقیقت زکوٰۃ کی تو نماز میں واضح ہوگئی۔ لیکن غور کرو تو زکوٰۃ کی صورت بھی نماز کے ساتھ وابستہ ہے کیوں کہ زکوٰۃ کی صورت اللہ کے راستہ میں مال خرچ کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ نماز کے لیے فی سبیل اللہ مصارف بھی لازم ہیں۔ مثلاً نماز کے لیے وضو شرط ہے اور وضوء کے لیے پانی جمع کرنا بغیر تھوڑے بہت خرچ کے ممکن نہیں اور خصوصاً جن ممالک میں پانی کی قلت ہے جیسے حجاز وہاں پانی کے لیے بہت کثیر رقم خرچ کرنی پڑتی ہے۔ ایسے ہی نماز کے لیے جگہ لازمی ہے اور زمین کا ٹکڑا بغیر مصارف کے ممکن الوصول نہیں، پھر اس پر مسجد کی تعمیر مصارف چاہتی ہے۔ پھر مسجد کی ضروریات راتبہ یعنی مقررہ حوائج تیل، بتی، فرش، لوٹے، پانی۔ اگر ان مصارف کا اوسط لگایا جائے تو اس کی کچھ نہ کچھ مقدار ہر نمازی پر بقدر حصہ لازم نکلتی ہے بلکہ بعض اوقات زکوٰۃ کے مصارف سے بھی ان کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ پس زکوٰۃ کی حسّی صورت یعنی انفاق فی سبیل اللہ بھی موجود ہے۔ اس لیے زکوٰۃ بھی حساً ومعناً اور صورتاً وحقیقتاً نماز کے اندر موجود نکلی۔ اسی طرح جہاد بھی نماز میں جیسا کہ آئندہ اس کی تفاصیل آنے والی ہیں اسی طرح اس میں ہجرت بھی ہے کیوں کہ ہجرت کی حقیقت موطن طبیعت سے نکل کر موطن فطرت پر آنا ہے، یعنی معاصی کو ترک کر کے طاعات کی طرف اقدام کرنا ہے اور اسکی صورت مکان غفلت سے منتقل ہو کر مکان طاعت کی طرف چلا جانا ہے۔ غور کرو کہ نماز کی صورت میں ہجرت کی صورت بھی موجود ہے۔ آدمی گھر بار چھوڑ کر بیوت الٰہی میں جا پہنچتا ہے اور حقیقت ہجرت بھی قائم ہے کہ معاصی سے تا ادائے صلوٰۃ تو بچا ؤ رہتا ہی ہے پھر خود نماز کی خاصیت بھی معاصی سے بچانا ہے۔ اس لیے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے **عَلَيْكُمْ بِالصَّلٰوةِ فَإِنَّهَا أَفْضَلُ الْجِهَادِ وَالْهِجْرَةِ** (نماز کو مضبوط پکڑ لو کہ وہ افضل ترین جہاد اور عمدہ ترین ہجرت ہے۔)

غرض جس طرح سے کہ مسلم انسان جامع ادیان اور جامع حقائق عالم تھا تو اس کے لیے نماز بھی ایسی ہی جامع ہونی چاہیے تھی کہ جس میں تمام ہی انواع عبادات جمع ہوں اور ہر ایک کی نماز کی ہر ممکن سے ممکن صورت اور محتمل سے محتمل حقیقت موجود ہو۔ اگر نباتات اور درختوں کی نماز قیام تھا اور نباتات کے نمونے خود انسان میں موجود تھے تو ان کی نمازوں کا قیام بھی اس کی نماز میں آنا چاہیے تھا، اگر حیوانات کی نمازوں میں رکوع وسجود تھا۔ اور انسان میں خود حیوانات کے ہی سارے نمونے موجود تھے تو اس کی نماز میں رکوع وسجود بھی آنا لازم تھا اور اگر پہاڑوں کی نماز میں قعود، ملائکہ کی نمازوں میں صف بندی، زمین کی نماز میں سکون، سیارات اور اسماء کی نماز میں دوران اور جنت ونار کی نماز میں سوال ودعاء ہے اور ان تمام چیزوں کے نمونے انسان میں موجود ہیں تو ان کی نمازوں کی یہ ساری ہی حقیقتیں اور نمونے اس کی نماز میں بھی موجود ہیں حتیٰ کہ اگر شیاطین کا کام اضلال وگمراہی پھیلانا اور وسوسہ اندازی تھا اور گویا تکوینی طور پر ان کی اطاعت تھی کہ وہ سرکشی کرنے ہی میں پابند تخلیق الٰہی ہیں اور اس سے سرمو تجاوز نہ کریں تو انسان اس سے بھی خالی نہیں، کیوں کہ انسان میں یہ شیطان نفس امارہ کی صورت میں موجود ہے جو اسے ہر وقت بغاوت وطغیانی پر آمادہ کرتا رہتا ہے۔ اس کی نماز میں یہ شیطانی کارگزاری بھی موجود ہے یعنی عین

صلوٰۃ میں نفسانی تخیلات، وساوس اور طرح طرح کے ہواجس بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں جو اس کے خشوع وخضوع میں خلل ڈالتے۔ گویا نفس تخیل آفرینی اور نماز میں خلل اندازی کرنے کی تکوینی طاعت اور تکوینی نماز میں مصروف ہے۔ ظاہر ہے کہ عامۃ الناس کی نماز وساوس وخطرات سے پر رہتی ہے اور جو بات کہیں بھی یاد نہ آئے وہ لازمی طور پر نماز میں ضرور یاد آجاتی ہے۔ حتی کہ بعض بزرگوں کا مقولہ سننے میں آیا ہے کہ اگر کسی کی کوئی چیز گم ہو جائے اور یاد نہ آتی ہو تو نماز شروع کردے وہ خواہ مخواہ بھی یاد آجائے گی۔

بہرحال جیسا مسلم انسان تکوین وتشریع کے لحاظ سے جامع تھا ویسے ہی نماز بھی اسے جامع دی گئی۔ اور اس لیے دی گئی کہ ساری کائنات کے ذرہ ذرہ پر اسے فائق بنانا تھا تا کہ خلافت کا شرف سنبھالنے کے قابل ہو اور یہ فوقیت بغیر عبدیت کاملہ کے ناممکن تھی اور عبدیت کاملہ اس کے بغیر ناممکن تھی کہ عبادت کی تمام انواع اس کی نماز میں موجود نہ ہوں۔

نماز اور عالم انفس ...... پھر یہی نہیں کہ نماز صرف انسان سے باہر باہر کی اشیاء کی نمازی ہیئتوں کی جامع ہے بلکہ خود انسانی نفس کے تمام پہلوؤں کی عبادات کو بھی جامع ہے کہ اس کے جوارح قیام وقومہ اور رکوع وسجود میں مصروف رہتے ہیں۔ اس کی زبان ذکر اللہ کی عبادتوں میں سرگرم ہوتی ہے اس کی انگلی توحید کے اشاروں پر عبادت میں لگی ہوتی ہے۔ اس کے حواس خمسہ تصور کی عبادت میں مشغول ہوتے ہیں اور اس کا قلب اخلاق کی عبادت میں لگ جاتا ہے۔ اس کی روح معرفت کی عبادت میں لگتی ہے۔ اس کا سر مشاہدہ کی عبادت میں سرگرم ہوتا ہے۔ غرض نفس کا ہر ہر مقام اپنے مناسب حال عبادت کرتا ہے اور یہ ساری عبادتیں اسلامی نماز کے اجزاء ہیں۔ اس لیے نماز جیسے آفاقی نمازوں کے نمونوں پر مشتمل تھی۔ ایسے ہی انفسی نمازوں کے بھی سارے ہی نمونوں پر مشتمل نکلتی ہے کہ نماز صرف بدن اور قالب ہی کو شائستہ بناتی ہے بلکہ قلب اور اخلاق قلب کو بھی مہذب اور مزکی کرتی ہے جس کے یہ سب ثمرات ہیں۔ کیوں کہ اگر اخلاق پاک نہ ہوں تو کوئی باطنی اور ظاہری حرکت شائستہ اور مہذب نہیں ہوسکتی۔

نماز اور تہذیب اخلاق ...... پس اصلاح نفس کے لیے نماز ایک فائق ترین مجاہدہ بھی ہے جس سے اخلاق نفس درست ہو جاتے ہیں اور بدخلقی کافور ہو جاتی ہے جس کا راز یہ ہے کہ نفس کی بدخلقی کی بنیاد انانیت اور کبر نفس پر ہے جس سے غدر نفس پیدا ہوتا ہے اور کتنی ہی بدخلقیوں اور بداعمالیوں کی اساس قائم ہوتی بالخصوص ذات البین کے فساد کی بنیاد ہی اس خلق پر ہے کیوں کہ کبر یا تعظیم نفس سے اول تو تفاخر کی عادت پڑتی ہے اور جب آدمی اپنے کو سب سے بڑا اور سب سے فائق سمجھتا ہے تو بجز اس کے پینگیں بڑھاتا اور ڈینگیں بگھارتا رہے اور کسی کام کا نہیں رہتا۔ اس فخر وریا کا قدرتی اثر تحقیر غیر اور دوسروں کی تنقیص ہے جس سے ان اغیار کا برانگیختہ ہونا، جھنجھلانا اور ان کے دلوں میں غبار کا بھر جانا ایک قدرتی امر ہے اس کا اثر نفرت اور منافرت باہمی ہے اور منافرت کا طبعی اثر نزاع باہمی اور جدال وقتال ہے۔ یہ جدال ونزاع اول زبان سے ہوتا ہے تو بدگوئی اور سب وشتم کا دروازہ کھلتا ہے جس سے زبان قابو میں نہیں رہتی۔ ایک دوسرے کے حق میں غائبانہ بدگوییوں کا سلسلہ قائم ہوتا ہے جس سے ایک

دوسرے کی غیبت، چغلی اور دوسرے مختلف معاصی کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ قولی سلسلہ میں ان معاصی سے بڑھ کر کوئی بھی معصیت اخلاق کو گندہ کرنے والی اور انسانی آبرو کو گرانے والی نہیں۔ پھر نزاع آگے بڑھتا ہے تو ہاتھا پائی کی نوبت آتی ہے اور زدوکوب شروع ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ظاہری اعضاء کا یہ انتہائی فساد ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے بنی آدم کو کسی وقت بھی امن نہیں مل سکتا۔ اس سے آگے بڑھا تو جارحہ واسلحہ اور آلات حرب وضرب کی نوبت آتی ہے جس سے قتل وغارت نمایاں ہو کر خونریزی سرزد ہوتی ہے جو ذات البین کے لیے انتہائی مفسدہ اور دنیا کے امن کے لیے انتہائی خطرہ ہے۔

غرض اس سلسلہ میں کبرنفس کا آخری نتیجہ خونریزی نکلتا ہے جو فساد ذات البین کی آخری سے آخری حد ہے۔ اور پھر یہی خلق اگر کسی قوم میں اجتماعی طور پر سرایت کر جائے یعنی قوم کی قوم متکبر اور دوسری اقوام کی تحقیر کنندہ ہو جائے، تو پھر یہ جدال وقتال بھی ہوگا جس سے پورا ملک یا پوری دنیا ہی جہنم زار بن جائے گی۔

پھر اگر اس متکبر کے سامنے کوئی اور مغرور جو اس کے اثرات میں دب نہ سکے بلکہ خود اس کی بھی وہی حیثیت مستقل ہو تو اس سے متکبر میں حسد کی بنیاد پڑتی ہے اور اس صورت میں جبکہ یہ متکبر غیر کو نہیں جلا سکتا تو خود بیٹھ کر آتش حسد میں جلتا ہے اور گھٹتا ہے کہ کسی طرح اپنے محسود کو نیچا دکھائے۔ لوگوں کو اس کے خلاف اکساتا اور بھڑکا کر چاہتا ہے کہ اس کے بارہ میں سب کو مبتلا کر دے تاکہ اس کے غیظ کو کسی طرح شفا حاصل ہو سکے۔

پس حسد سے بدخواہی خلق ابھرتی ہے اور اس سلسلہ میں حاسد میں طرح طرح کی چالاکیاں، عیاریاں اور مکاریاں کرتے رہنے سے مکر وفریب کی عادت پیدا ہوتی ہے۔ غیظ میں بے صبری اور ازخود رفتگی نمایاں ہوتی ہے اور وہ سب کچھ ظاہر ہوتا ہے جو شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کے مقابلہ میں حسد سے کیا۔

غرض کبرنفس سے بدگوئی، مفاخرت، ریاکاری، بدخلقی، سب وشتم، غیبت، چغلی، ہذیان اللسانی، حسد کاری، مکاری، فریب بازی، ایذادہی، آبروریزی اور انجام کار خونریزی غرض جب حسد، بغض، مکاری، جعلسازی، بے صبری اور ازخود رفتگی کے اخلاق واعمال ظہور پذیر ہوں، تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ انسانی اخلاق ہیں یا ان اخلاق سے دنیا میں امن چین کا منہ دیکھ سکتی ہے؟ بلکہ یہ وہ شیطانی خلق ہے جس کے ماتحت اس نے ازل میں ’’انا خیر منہ‘‘ کہا تھا اور اسی انانیت کی بنا پر مردود ابدی ٹھہرا۔

پس انسان کو بھی بارگاہ حق سے کلیۃً مردود ٹھہرانے میں یہی انانیت مؤثر ہوتی ہے اور اس لیے ہوتی ہے، کہ اس سے یہ مختلف الانواع معاصی پیدا ہوتے ہیں جس سے دنیا کے بدامنی کا گہوارہ بن جانے سے لوگوں کی عافیت تنگ ہو جاتی ہے اور ادھر انسانی قلوب سیاہ اور ظلماتی بن جاتے ہیں۔

پھر اسی تحقیر غیر کا دوسرا اثر یہ ہے کہ آدمی اپنے کو بڑا اور دوسرے کو اپنے سے کم رتبہ سمجھ کر اس پر اپنا ہر قسم کا حق سمجھنے لگتا ہے اور ان حقارت زدہ انسانوں کا کوئی بھی حق اپنے اوپر نہیں جانتا اس کا اثر یہ ہے کہ دوسروں کے حق کو

پامال کرنا۔ ان پر ہر طرح کا ظلم وستم روا رکھنا۔ اور لونڈی غلاموں سے بدتر حالت میں انہیں دیکھتے رہنا اور ان کی املاک کو اپنی ملک تصور کر کے ان میں ہر قسم کا تصرف کرنا۔ مال چھین لینا۔ عورتوں پر ہاتھ ڈالنا، بچوں کی خدمات کے لیے قبضہ لینا وغیرہ وغیرہ۔

اس صورت میں جاہ کے ساتھ ساتھ باہ کے جذبات بھی بھڑکتے ہیں جن کی اساس حرص ہے اور حریصانہ خصلتوں کے آثار اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ ہر ایک چیز پر آدمی کی نگاہ ہو اور جس طریق پر بھی ممکن ہو اس سے چھین لینے کے دواعی دل میں ابھرے ہوئے ہوں۔ اس سے غصب، نہب، ڈکیتی، سرقہ، رشوت، شہوت، پھر بخل طمع، جمع اموال وغیرہ کے جذبات دل میں راسخ ہوتے ہیں۔ یہ خلق بلاشبہ انسانی نفس کا ذاتی ہے جس میں حضرت آدم علیہ السلام بھی نسیاناً مبتلا ہوئے۔ لیکن کرامت انسان کے بہرحال خلاف ہے جس کا اعلان وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ میں کیا گیا ہے بلکہ ایک فتنہ افزاء خلق ہے جس سے عالم میں فساد پھیلتا ہے۔

غرض کبر نفس کا آخری اثر ایک طرف تو انجام کار خونریزی اور دوسری طرف آخر کار فساد ہے اور یہی وہ دو (۲) اصولی مفاسد ہیں جن سے فرشتوں نے نوعِ بشر کو خلافت دیئے جانے سے خوف کھایا تھا اور بکمالِ ادب بارگاہ حق میں عرض کیا تھا کہ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ①

جس سے واضح ہے کہ فساد فی الارض (بدامنی) اور سفک دماء (خونریزی) تمام مفاسد کی جڑ ہے۔ خونریزی، جاہ پسندی یعنی کبر نفس سے سرزد ہوتی ہے یہ ایک انتہا درجہ کا فحش ہے جو باہ کو بھڑکاتا ہے اور ایک انتہاء درجہ کا منکر ہے جو جاہ کو ہیجان میں لاتا ہے۔

اور انہی دو بنیادوں سے جاہ وباہ کے ہمہ قسم معاصی پھیلتے ہیں جن کی جڑ بنیاد کبر نفس اور انانیت نکلتی ہے، یہ سلسلہ سمجھ لینے کے بعد اب نماز کو دیکھئے تو اس کا ہر ہر رکن اور ہر ہر فعل اس کبر نفس کے لیے تبر اور تیشہ ہے۔ کیوں کہ اس کی ہر ہر ادا سے آدمی نہ صرف ذلت نفس کا اظہار ہی کرتا ہے بلکہ دل سے باور کرنے کی عادت ڈالتا ہے کہ حق کے سامنے میری کوئی ادنیٰ عزت اور کوئی معمولی سی بھی حرمت نہیں اور ہو بھی نہیں سکتی۔ ترفع وکبر تو بجائے خود رہے میں تو انتہائی پستی اور آخری ذلت کے لیے ہوں کہ ناک اور پیشانی تک بھی خاک پر رگڑ رہا ہوں۔

پس جب کہ نماز کبر نفس کو اس طرح مٹا دیتی ہے جیسے آفتاب شبنم کو اور نور ظلمت کو تو ظاہر ہے کہ کبر کے یہ آثار خبیثہ یعنی جاہی اور باہی معاصی بھی کیسے ظہور پذیر ہو سکتے ہیں جو دنیا میں فساد اور خونریزی کے کفیل اور فحش ومنکر کے ضمانتدار تھے، اسی لیے قرآن نے نماز کی خاصیت فحش ومنکر ہی کا ختم ہو جانا بتلایا ہے ارشاد حق ہے: اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ② اس سے واضح ہے کہ اگر دنیا نمازی بن جائے تو فحش، ومنکر، جاہ وباہ کی بدمستیاں قولی اور فعلی معاصی قلبی اور اخلاقی کھوٹ کو دنیا میں پناہ نہیں مل سکتی اور بدامنی وبے چینی عالم میں محض بے کس ہو کر ہی رہ سکتی ہے۔

① پارہ: ۱، سورۃ: البقرۃ، الآیۃ: ۳۰۔ ② پارہ: ۲۱، سورۃ: العنکبوت، الآیۃ: ۴۵.

قرن اول میں نماز کی اہمیت...... حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے دور کو خیر القرون، ان کی زندگیوں کو خیر الحیات اور ان کی ذوات کو خیر اھل الارض اسی لیے کہا گیا ہے کہ اس میں ان دونوں انواع کے معاصی کا پتہ نہ تھا، جاہ اور باہ دونوں خیر سے مغلوب اور دین کے ماتحت تھیں۔ اس لیے جو امن اس دور میں تھا وہ عالم کو پھر نصیب نہیں ہوا۔ اس کا راز یہی ہے کہ ان کی عام ترقی نماز کے ذریعہ تھی اور زندگی کا مقصد اعلیٰ اور اصلی نماز ہی تھا، نماز ہی معیار عبادت تھی اور نماز ہی معیار خلافت۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جانشینی کے لیے جس میں عبادت و خلافت کے دونوں منصب شامل ہیں، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا انتخاب یہ کہہ کر فرمایا کہ وہ خیر الامت بعد الانبیاء ہیں تو انہیں اپنے سامنے امام صلوٰۃ ہی بنایا تھا جو بالآخر ان کے خلیفہ ہونے کی دلیل ثابت ہوئی۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر بیعت ہی یہ کہہ کر کی کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ہمارا امام صلوٰۃ بنا کر ہمارا دین ان کے سپرد کر دیا اور اس پر ہم راضی ہو گئے تو ہمیں پھر دنیا انہیں سونپ دینے میں کون مانع ہو سکتا ہے۔ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے تمام دین کی بقاء نماز کی بقاء میں اور تمام دین کی اضاعت نماز کی اضاعت میں سمجھی اور خلافتی حکم کے ساتھ اس کا اعلان فرمایا إِنَّ اَهَـمَّ اُمُـوْرِكُمْ عِنْدِي الصَّلٰوةُ فَمَنْ ضَيَّعَهَا فَهُوَ لِـمَا سِوَاهَا اَضْيَعُ. ① نیز تمام صحابہؓ کی دینی ترقی اسی نماز کے مجاہدہ سے ہوئی ہے۔ چنانچہ اوائل عہد اسلام میں تمام راتوں کے بڑے حصہ میں صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قیام فرماتے یہاں تک پیروں پر ورم آجاتا۔ اور پیر پھٹ کر خون بہہ نکلتا۔ جس کا قرآن نے یوں اعتراف کیا ہے: إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَـمُ اَنَّكَ تَـقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ②

بہر حال صحابہ رضی اللہ عنہم کی دینی وانتظامی ترقی کی ضمانت دار نماز ہی نکلتی ہے اور نماز ہی ان جاہی و باہی مفاسد اور انواع معاصی کے لیے ضرب کاری ثابت ہوتی ہے: اس لیے نتیجۃً کہا جا سکتا ہے کہ جو قوم نماز گذار نہیں وہ کتنی ہی ترقی کر جائے یا تو وہ خالص دنیا کی ترقی ہوگی جس میں سرے ہی سے اخلاقیت نہ ہوگی اور اگر روحانیت یا مذہبیت لیے ہوئے ہوگی تو فحش و منکر سے پاک نہ ہوگی جس کا انجام پھر وہی جاہ و باہ، فساد و خونریزی اور فحش و منکر ہوگا۔

نماز سے تہذیب نفس کی کیفیت...... رہا یہ سوال کہ یہ کبر نفس آخر نماز پڑھنے سے زائل کس طرح ہو جاتا ہے؟ سو جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کا راز یہ ہے کہ کبر نفس جبھی تک باقی رہ سکتا ہے جب اپنے سوا کسی دوسرے کی عظمت دل میں نہ ہو۔ اگر کسی کی عظمت قلب میں آجائے تو اس قلب میں کبر و غرور پاس بھی نہیں پھٹک سکتا۔

چنانچہ بڑے سے بڑا نواب بادشاہ کے آگے جھک جاتا ہے وہاں اپنے نفس کی بڑائی باقی نہیں رہتی۔ کیوں کہ مسلمہ بڑا سامنے ہے۔ ایک بڑے سے بڑا افاضل و عالم اپنے استاد کے آگے جھک جاتا ہے کہ اپنے سے بڑا سامنے

---

① مؤطا مالک، باب وقوت الصلاة ج: ۱ ص: ۷. السنن الكبرىٰ للبيهقي، باب كراهية تاخير العصر ج: ۱ ص: ۴۴۵. ② پارہ: ۲۹ سورة: المزمل، الآية: ۲۰.

ہے۔ یہاں اس کے دل میں اب اپنے علم وفضل کا خطرہ بھی نہیں گذر سکتا۔ایک چپراسی تھانہ دار کے سامنے تھانیدار انسپکٹر پولیس کے سامنے، کلکٹر کمشنر کے سامنے اور کمشنر گورنر کے سامنے، وائسرائے کنگ کے سامنے جھک جاتا ہے کہ اب وہ سامنے ہے جس کی عظمت سے دل لبریز ہے۔غور کیجئے کہ جب انسان، انسان کے آگے دوسرے کی عظمت سے جھک کر اپنے کبروخودی کو پامال کر دیتا ہے۔حالانکہ یہ عظیم انسان اسی صغیر انسان جیسا ہے، نہ اس کی ذات میں کوئی مادرنہ خوبی ہے نہ اس کی ذات میں، تو پھر اگر وہ ذات پیش نظر ہو جائے جو خوبیوں کی مالک، کمالات کا سرچشمہ، بھلائیوں کا مخزن، اور تمام ہی اخلاق حسنہ اور صفات مستحسنہ کا منبع ہے۔ بلکہ جہاں بھی خوبی کا کوئی کرشمہ ہے وہ اسی کا ہے جسے بھی کوئی خوبی ملی ہے اسی کی دہلیز کا فیض اور اسی کے یہاں کی دریوزہ گری کا اثر ہے تو سوچئے کہ اس کے سامنے کبر نفس کا کوئی نشان باقی رہ سکے گا؟ یہ نہیں کہ کبر مغلوب ہی ہو جائے گا بلکہ جڑ سے نکل جائے گا اور بے نفسی اور بے لوثی سامنے آکھڑی ہوگی۔

اب آپ غور کرلیں کہ نماز میں جس چیز کو سامنے رکھا جاتا ہے وہ بجز عظمت حق کے اور کیا چیز ہے؟ نماز کے ہر ہر کلمہ سے اسی کی عظمت، اسی کا علو مراتب، اسی کی ثناوصفت، اسی کی تقدیس وتمجید، اسی کی شان کبریائی ورفعت اور اسی کی ہمہ قسم بزرگیوں کا اظہار، ہر ہر ادا سے اعلان اور قلب کی گہرائیوں سے اقرار واعتراف کیا جاتا ہے۔پس جس قلب کے رگ وریشہ میں حق کی یہ عظمت راسخ ہوگی اس قلب میں اس نفس ناپاک جاہل ازلی اور بے کمال حقیقی کی وقعت کیا باقی رہ سکتی ہے، کہ کبروغرور پاس بھی پھٹک سکے اور جب نفس نہ رہا تو وہ تمام فتنے بھی ختم ہو جاتے ہیں جو اس کبر سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کی تفصیل ابھی عرض کی گئی ہے۔اس کو محققین کی اصطلاح میں تخلیہ کہتے ہیں یعنی نفس کا رذائل سے پاک ہو جانا۔

اور ظاہر ہے کہ جب نفس خالی ہو کر اور اس کے پیرایہ میں طالب حق ہو کر حق تعالیٰ کے سامنے ہے تو ظاہر ہے کہ اب جو کچھ اثرات بھی نفس میں راسخ ہونگے وہ حق ہی کے ہو سکتے ہیں کیوں کہ نفس کے اثرات تو زائل ہو چکے اور نفس کے بعد درجہ حق ہی کا ہے۔جیسا کہ ایک بزرگ نے حق تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ اے اللہ! میں آپ تک کیسے پہنچوں؟ فرمایا گیا۔دَعْ نَفْسَکَ فَتَعَالَ (خواہشات نفس اور ہوائے نفس کو چھوڑ دو اور آجاؤ) گویا نفس گذاری اور وصول بحق میں صرف ایک ہی قدم کا درمیانی فاصلہ ہے کہ نفس کو چھوڑ دو اور واصل ہو جاؤ۔ ع:

تو خود حجاب خودی حافظ ازمیاں برخیز

اور جب کہ آثار نفس یہ رذائل تھے تو ظاہر ہے کہ آثار حق فضائل ہوں گے۔رذائل کا سرچشمہ کبروغرور نفس تھا تو فضائل کا سرچشمہ تواضع للحق ہوگی۔جو کبر کی ضد ہے اور جیسے آثار کبر وہ بداخلاقیاں تھیں جن کی تفصیل ابھی ذکر کی گئی تو تواضع کے آثار ان رذائل کی ضد ہوں گی یعنی اس تواضع سے جو نماز کے ذریعہ حاصل ہوگی، حرص نہیں بلکہ قناعت ہوگی، ہوسناکی نہیں جس سے فساد پھیلتا ہے۔بلکہ سیر چشمی نمایاں ہوگی جس سے صلاح تمام اور رفاہ عام پیدا ہوتا ہے

۔پھر تواضع کا اثر خونریزی نہیں بلکہ عصمت دم اور حفظ اموال ہے۔خود غرضی نہیں بلکہ خیر خواہی خلق اللہ ہے بدزبانی نہیں بلکہ حق گوئی ہے،نزاع وجدال نہیں بلکہ محبت باہمی ہے۔لوٹ کھسوٹ نہیں بلکہ ایثار ہے۔حق تلفی نہیں بلکہ ادائے حقوق ہے،فسادات نہیں بلکہ صلاح ذات البین ہے۔آبروریزی نہیں بلکہ تحفظ عرض وآبرو ہے مکروفریب نہیں ،بلکہ دانش وحق پسندی ہے۔بغض وعناد نہیں بلکہ محبت ومودت ہے۔حسد نہیں بلکہ بہی خواہی اور طلب ترقی غیر ہے۔

غرض وہ تمام مفاسد جو آثار نفس میں سے تھے،مٹ کر وہ تمام مصالح انسانی نفس میں داخل ہو جاتے ہیں جو آثار حق میں سے ہیں۔اور انسان مظہر کمالات الٰہی اور مرکز اخلاق ربانی بن جاتا ہے جس سے دنیا امن وچین کا سانس لینے لگتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نماز کے سلسلہ میں دو چیزیں سامنے ہوتیں ہیں،ایک نفس،ایک رب۔نماز جب نفس کی تحقیر وتذلیل کرتی رہتی ہے تو وہ مرجاتا ہے اور اس کے آثار بھی مٹ جاتے ہیں اور رب کی جب عظمت مطلقہ سامنے کردیتی ہے تو عنایات رب متوجہ ہوتی ہیں اور رب کریم اپنے فضائل سے نوازتا ہے تو آثار حق زندہ ہو جاتے ہیں۔

اس لیے یوں سمجھئے کہ نماز کا ایک جز وتحقیر نفس تو رذائل نفس کو مٹاتا ہے جسے تخلیہ کہتے ہیں اور ایک جز وتعظیم حق فضائل کو پیدا کرتا ہے۔جسے تجلیہ کہتے ہیں پس تخلیہ اور تجلیہ دونوں مقاموں کے لیے نماز ہی کفیل وضامن نکلی اور سب جانتے ہیں کہ فن تصوف کا موضوع تہذیب نفس ہے اور تہذیب نفس کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ نفس کے رذائل زائل ہوں اور فضائل حاصل ہو جائیں۔

اس لیے واضح ہو گیا کہ نماز تہذیب نفس اور اصلاح نفس کے لیے افضل ترین مجاہدہ اور اعلیٰ ترین ذریعہ ہے۔

جس سے ایک طرف معرفتِ نفس اور دوسری طرف معرفت رب حاصل ہو کر اخلاق ظلماتی مفلوج ہو جاتے ہیں اور اخلاقِ نورانی پیدا ہو جاتے ہیں.....(جس نے اپنے نفس کے عیوب ونقائص کو پہچان لیا اس نے اپنے رب اور اس کے کمالاتِ ومحامد کو پہچان لیا)

نماز اور نفس کے مقامات واحوال......نماز کے اس تزکیۂ نفس کے بعد قدرتی طور پر خود بخود نفسانی احوال ومقامات پاکیزہ اور ارفع واعلیٰ ہو جاتے ہیں جس کا ذریعہ نماز بنتی ہے۔لیکن بلا واسطہ بھی نماز میں یہ تمام روحانی اور اخلاقی مقامات موجود ہیں جو نمازی انسان میں راسخ ہو جاتے ہیں اور آدمی بلند پایہ ہو جاتا ہے۔

مثلاً شکر کو لو تو نماز کی روح ہی الحمد ہے،صبر کو لو تو نماز میں ہر ایک لذت سے آدمی صبر کر بیٹھتا ہے کہ نماز کا روزہ دن بھر کے روزہ سے زیادہ مکمل ہے۔اخلاص کو لو تو نماز کا موضوع ہی ''اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ''جس کی حقیقت ماسوا اللہ سے کٹ کر اللہ کی طرف دوڑنا ہے،تواضع کو لو تو جہاں ذلت نفس تک سامنے ہو وہاں تواضع تو پھر اوپر کی بات ہے۔رضا بالقضاء کو لو تو جہاں عبدیت محضہ اور خالص عبادت عمل میں آرہی ہو وہاں رضا وتوکل تو ادنیٰ درجہ ہے۔

سخاوت کو لو تو نفس اپنی ہر لذت نماز میں دے بیٹھتا ہے اور اس سے صبر کر لیتا ہے۔شجاعت کو لو تو اس میں

سخت ترین مقابلہ خود اپنے نفس اور ہوائے نفس سے ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ دوسرے سے لڑنا سہل ہے مگر اپنے سے لڑنا مشکل ہے۔صدق وعفاف کو لوتو ریا کاری، نفاق اور فریب وکذب سے تکبیر تحریمہ ہی کے وقت کانوں پر ہاتھ دھر لیے جاتے ہیں اور سچائی کے ساتھ اللہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر حاضری ہوتی ہے۔

شوق وذوق اور انس کو لو تو جہاں سر چشمۂ کمالات وعنایات سامنے ہوا اور اسی کی طرف عاشقانہ دوڑ ہو رہی ہو، تو وہاں لذت وشوق اور انس وذوق کی کیا کمی ہوسکتی ہے؟

غرض اوّل تو یہ تمام مقامات صالحہ انانیت کے ازالہ ہی سے نفس میں فی الجملہ پیدا ہو جاتے ہیں کہ نماز خلق تواضع کو مکمل کر دیتی ہے اور یہ تمام محاسن اخلاق تواضع ہی کے سر چشمہ سے نکلتے ہیں، لیکن نماز بالخاصہ بھی اپنے افعال سے ان مقامات کو انسان میں پیدا کرتی ہے۔حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں نماز نے جو خاص جوہر پیدا کیا تھا وہ یہی تھا کہ وہ وقار مجسم بننے کے ساتھ ہی تواضع مجسم اور بے تکلف اخلاق کے بھی مالک بن گئے تھے۔بڑے سے بڑے کروفر کا وجود انہیں تواضع وسادگی سے بیگانہ نہیں بناتا تھا اور وہ نفس انسانی کی اصلیت کو کسی وقت بھی فراموش نہیں کرتے تھے۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ایک دفعہ گھوڑے پر سوار تھے تو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے رکاب تھام کر ان کے پیروں پر ہاتھ رکھ دیا۔زید بن ثابت رضی اللہ عنہ گھبرا کر بولے کہ اے عم رسول اللہ! یہ کیا غضب کر رہے ہو؟ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم کو ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی حکم دیا ہے کہ اپنے علماء کی اسی طرح عظمت کرو۔اس کے بعد زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے گھوڑے سے اتر کر ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پیر پکڑ لیے تو ابن عباس رضی اللہ عنہ گھبرا گئے وہ کیوں کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور گھبرا کر بولے کہ اے حضرت! یہ کیا غضب کیا؟

فرمایا کہ ہم کو ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی حکم دیا ہے کہ اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی طرح تکریم کرو۔پس وقار کے ساتھ تواضع اور منصب ارشاد وتربیت کے ساتھ یہ ذاتی عبدیت اور اخلاق ستودہ اس نماز ہی نے ان حضرات کو سکھائے تھے۔

بہر حال واضح ہوا کہ نماز جیسے تمام کائنات کی عبادت کو جامع ہے اور جیسے تمام اجزائے انسانی کی عبادت کو جامع ہے۔ایسے ہی کائنات انسانی کے تمام اوصاف حمیدہ اور اخلاق ستودہ کی عبادت کو بھی جامع ہے جس سے انسانی نفس میں جامعیت بھی پیدا ہوتی ہے اور جمعیت بھی یعنی نفس انسانی خود اپنے اوپر حاوی ہو جاتا ہے اور اپنے غیر پر بھی۔اس کی عبادت بھی مکمل ہو جاتی ہے اور خود اس کی شان عبدیت بھی کامل بن جاتی ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ انسان پر اس وجہ سے کہ وہ تکوینی حقائق کا جامع ہے اور مخلوقاتی نمونوں کا مجموعہ تھا یعنی اس کی شان مخلوقیت مکمل تھی، نماز جیسی جامع عبادت اس پر عائد کی گئی جس میں عبادت کے سارے نمونے جمع ہیں، خواہ وہ نفسی ہوں یا آفاقی،

اس لیے ثابت ہو گیا کہ حقیقی طور پر اس کے مخلوقاتی فریضہ کی ادائیگی نماز کے بغیر ممکن نہیں۔

نماز اور اجتماعیات...... لیکن اب ادھر آؤ کہ جب اس میں خالق کے صفات وکمالات کے نمونے بھی سب کے سب رکھے گئے ہیں۔ گویا مادیت کی طرح اس کی استعداد روحانیت بھی مکمل ہے، جس میں خدائی کمالات کے جلوے سمائے ہوئے ہیں، تو ان ربانی نمونوں کی وجہ سے اس پر ویسا ہی فریضہ عائد ہوتا تھا جیسا کہ اس کے خالق کا عمل اپنی مخلوق کے ساتھ ہے اور وہ تربیت خلائق ہے، اگر انسان بنی نوع کی ہمدردی اسی نمونے پر کرنے لگے تو اسی کا نام خلافت ہے، اس لیے بالفاظ دیگر انسان پر عبادت کے ساتھ دوسرا فریضہ خلافت کا عائد ہوتا ہے، جبکہ وہ کمالات الٰہیہ کے نمونوں کا جامع بھی بنایا گیا ہے۔ غور کرو تو اس فریضہ کی ادائیگی بھی نماز ہی سکھلاتی ہے کیوں کہ نماز ہی کے ذریعہ خدا نے بھی اپنے خدائی کاموں کو چھیڑا ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ خالق کا کام اپنی مخلوق کی نگہداشت فرمانا اپنی تمام صفات کمال کے ساتھ ان کی تربیت فرمانا انہیں مادی اور روحانی رزق دے کر ہر ایک کے مناسب حال اس کی تکمیل فرمانا اور اپنے فطری اصول پر حق داروں کو حقوق پہنچانا اور شریروں اور ناحق کوشوں کو سزا دینا۔ اور مختصر یہ کہ تمام جہانوں پر قوت ومتانت کے ساتھ اپنے عدل کا نظام قائم رکھنا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس سب کا منشاء رحمت خداوندی اور فضل ربانی ہے کہ یہ سب کچھ خدا پر واجب اور لازم نہیں ہے۔ محض اپنے فضل وکرم سے اس نے مخلوق کے منافع کی خاطر یہ کام کیا جس کو رحمت کے سوا اور کسی لفظ سے تعبیر نہیں کر سکتے حتی کہ شریروں کی سزا ہی بھی گویا بظاہر غضب اور قہر نظر آتی ہے لیکن حقیقتاً اس غضب کا منشاء بھی......... رحمت ہی ہے کہ اس سے بھی مخلوق ہی کی بھلائی مقصود ہے۔ خود اپنی ذات کے نفع نقصان کا وہاں کوئی سوال نہیں کہ وہ ذات پاک ہر نفع وضرر سے بری وبالاتر ہے۔

بہر حال اس سے واضح ہے کہ جہانوں کی تربیت کا نظام صفت رحمت کے بازوؤں پر قائم ہے اور غلبۂ رحمت ہی ان نظاموں کو برقرار رکھے ہوئے ہے، ورنہ خالص غضب وقہر عالم کی بیخ وبنیاد ہی باقی نہیں چھوڑ سکتا۔ چہ جائیکہ اس کی ترقی ہوتی۔ اب سمجھو کہ اسی رحمت عامہ کو جس سے جہانوں کی تربیت متعلق تھی، خدا نے اپنی نماز فرمایا ہے اور گویا اس ربوبیت کو صلوٰۃ سے تعبیر فرماتے ہوئے خود اپنے ذمہ بھی نماز لازم فرمالی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

هُوَ الَّذِىْ يُصَلِّىْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ①

”وہ ذات وہ ہے جو تم پر صلوٰۃ (رحمت) بھیجتی ہے اور اس کے فرشتے بھی تا کہ تمہیں (ظلم وجہل کی) تاریکیوں سے (علم وعدل کی) روشنی میں لے آئے کیوں کہ وہ ایمان والوں پر بہت مہربان ہے“۔

یہ الگ بات ہے کہ یہاں صلوٰۃ کی حقیقت عجز ونیاز مندی نہیں کہ وہ ذات بابرکات ہر عجز ونیاز اور ہر ایک احتیاج سے بری وبالا ہے بلکہ وہی رحمت بھیجنے اور تربیت کرنے والے ہیں چنانچہ آگے وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا سے اسی کی طرف صاف اشارہ موجود ہے مگر بہر حال اس کو تعبیر صلوٰۃ ہی کے عنوان سے فرمایا ہے جس سے یہ واضح ہو گیا

① پارہ: ۲۲، سورۃ: الاحزاب، الآیۃ: ۴۳۔

کہ اگر بندے نماز ادا کرتے ہیں تو حق تعالیٰ بھی فعل صلوٰۃ کی ادائیگی فرماتے ہیں گو حقیقت صلوٰۃ دونوں جگہ جدا جدا ہے۔ بندوں میں صلوٰۃ کی حقیقت تذلّل و مسکنت ہے اور خالق میں اس کی حقیقت ترحم و شفقت یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ تمام صفات کمال میں ہر ایک صفت ایک ہی اسم سے بندہ پر بھی بولی گئی ہے اور اسی اسم سے خدا پر بھی مگر حقیقتیں اور کیفیتیں دونوں جگہ الگ الگ ہیں۔ مثلاً سمیع و بصیر و علیم و خبیر و رحیم و منعم وغیرہ بندوں کو بھی کہتے ہیں اور خدا کو بھی۔ ہاتھ پاؤں کوکھ پنڈلی چہرہ اور آنکھ وغیرہ بندہ کے لیے بھی ثابت ہے اور خدا کے لیے بھی۔ عوارض میں عروج و نزول، ہنسنا، بولنا، خوشی اور خفگی بندہ کے لیے بھی ہے اور خدا کے لیے بھی شریعت نے مانی ہے، مگر باوجود اس اسمی اشتراک کے حقیقتوں اور کیفیتوں میں اتنا ہی بعد بعید ہے، جتنا بندہ اور خدا میں ہے۔ چنانچہ یہ سب احوال و اوصاف بندوں میں انفعال ہیں اور خدا میں فعل۔ وہاں تأثرات ہیں اور یہاں تاثیرات۔ ٹھیک اسی طرح صلوٰۃ کا فعل شریعت نے بندہ کے لیے ثابت کیا ہے اور خدا کے لیے بھی، مگر بندہ میں بمعنی عبادت ہے اور خدا میں بمعنی عنایت و رحمت۔

لیکن بہرحال صلوٰۃ کا عنوان دونوں جگہ یکساں قائم ہے۔ جس سے صلوٰۃ کی یہ ہمہ گیری واضح ہونے کے علاوہ کہ وہ تمام مخلوق سے گذر کر عالم قدس کے بھی چپہ چپہ پر چھائی ہوئی ہے، یہ بھی واضح ہوگیا ہے کہ نماز میں عبدیت کے پہلو کے ساتھ ایک پہلو رحمت و شفقت اور بعنوان دیگر خلافت کا بھی نکلتا ہے جس کی صورت بندہ میں یہ ہے کہ اگر وہ منفرداً نماز پڑھے تو اس کی نماز کا جو رخ خدا کی طرف ہے وہ بلاشبہ عبودیت ہے اور جو رخ خود اپنے نفس کی طرف ہے وہ بلا ریب شفقت و رحمت ہے کہ خود اپنے کو پاک بنایا جا رہا ہے اپنے کو بلند مقامات پر پہنچایا جا رہا ہے۔ اور اپنے نفس کے لیے دارین کی صلاح و فلاح حاصل کی جا رہی ہے تاکہ نفس امارہ ان افعال صلوٰۃ سے تربیت پا کر اپنی حد کمال کو پہنچ جائے اسی کو ہم خلافت انفرادی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اور اگر نماز باجماعت ہے تو امام نماز جو تمام مقتدیوں کا ضامن ہے اور اس دربار الٰہی میں ان کا وکیل ہے۔ اس کی نماز کا وہ رخ جو خدا کی طرف ہے عبودیت کا ہے یعنی وہ اپنی نیازمندی اصالتاً اور اپنے مقتدیوں کی وکالتاً اللہ کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ لیکن اسی امام کی نماز کا وہ رخ جو بندوں کی طرف ہے وہ خلافت و نیابت کا حق ہے کہ اسے جو کچھ رحمتیں ادھر سے دستیاب ہو رہی ہیں وہ خدا سے لے کر پہلے۔ اپنے نفس کو اور پھر مقتدیوں کو پہنچا رہا ہے۔ تاکہ وہ خود بھی اور اس کے مقتدی بھی اس اجتماعی تربیت سے اپنی حد کمال کو پہنچ جائیں اور مقصد حیات بالآخر حاصل ہو جائے پس یہ صلوٰۃ جماعت اپنے بالائی رخ کے لحاظ سے اجتماعی عبادت ہوئی اور اپنے تحتانی رخ کے لحاظ سے اجتماعی شفقت ہوئی جو اپنے بنی نوع پر متوجہ ہوئی، جیسا کہ خود اللہ اپنے بندوں پر بلا واسطہ رحمت و شفقت فرماتا تھا۔

پس امام جماعت کی بحیثیت نائب حق یہ رحمت و شفقت ہی خلافت اجتماع کہلاتی ہے۔ اسی لیے خلافت الٰہی کا مکمل نمونہ خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی نماز کی بدولت عالم انفس میں نمایاں ہوا، جس کی حقیقت تربیت و ربوبیت عامہ و خاصہ نکلی جسے رحمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح اللہ کی شانِ رحمت وربوبیت جس کو قرآن نے صلوٰۃ الٰہی سے تعبیر کیا ہے عالم کے نظام کو چلا رہی ہے اور سارا جہان فطرت کے اصولوں کی پیروی کرتا ہوا ان کے اقتداء میں دوڑتا ہوا چلا جارہا ہے۔ تاکہ اس تکوینی تنظیم وتربیت کے ماتحت کائنات کا ہر ہر مقتدی ذرہ ذرہ اپنی حدِ کمال کو مقررہ وقت پر پہنچ جائے گویا حق تعالیٰ اس صلوٰۃ وتربیت میں اپنی ساری کائنات کے لیے امام الکل ہیں اور بذاتِ خود امام اور قبلہ توجہات ہیں۔ اور یہ سارا اسباب ومسببات کا جڑا ہوا سلسلہ صف بندی کئے ہوئے ان کا مقتدی ہے جو ان کے تکوینی اشاروں کی اقتداء کرتے ہوئے اپنی ترقی وتکمیل کی خاطر ان کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔

ٹھیک اسی طرح نماز باجماعت میں امام نماز نائبِ حق کی حیثیت سے اپنے سے پہلے پچھلی صفوں کے لیے امام الکل ہے، اور اس کے سارے مقتدی اس کے اشاروں پر راہِ خدا میں دوڑ رہے ہیں۔ تاکہ اپنا اپنا مقررہ روحانی حصہ پاکر اپنے نفس کو اس مقامِ معلوم پر پہنچا دیں جو ان کے لیے اس سعی پر مقرر کیا گیا ہے۔ پس یہ امام اس جہت میں اسی رحمت وربوبیتِ الٰہی کا مظہرِ اتم ہوتا ہے، جس سے نظامِ عالم کی تربیت کی جارہی ہے، اسی لیے نماز میں عبادت کے پہلو کے ساتھ خلافت کا پہلو بھی کھل جاتا ہے خواہ وہ خلافت انفراد ہو جیسے منفرد کی نماز یا خلافت اجتماع ہو جیسے جماعت کی نماز۔

نماز اور اجتماعی معاشرہ ...... نماز کی اس شیرازہ بندی اور پانچ وقت جماعتی مظاہرہ سے قدرتاً جو آثار نمازیوں پر پڑتے ہیں وہ معاشرتی زندگی میں ایک دوسرے سے میل ملاپ، ہمدردی اور باہمی تعاون وتناصر کے سوا کچھ اور نہیں ہوسکتے۔ یعنی لوگ قدرتی طور پر اجتماعی حیات کی طرف آنے لگتے ہیں کیوں کہ جب عبادت جیسی چیز میں جو اپنی ذات سے انفراد اور خلوت کو چاہتی ہے، اسلام نے یہ اجتماع اور جلوت پیدا کی ہے کہ جس سے نماز عبادت ہونے کے ساتھ ساتھ خلافت کا بھی حق ادا کرنے لگے تو معاشرہ ومدنیت جیسی چیز میں جو اپنی ذات سے جلوت واجتماع چاہتی ہے ایک نمازی انسان کیسے انفراد پسند بن سکتا ہے۔ اس لیے اسلامی نماز کا خاصۂ لازمی ہی یہ ہے کہ وہ مسجد کے فرش پر اجتماعیت کا سبق پڑھا کر خدا کی پوری زمین پر جوامت کے لیے مسجد عامہ بنادی گئی ہے، اجتماعیت عامہ کی طرف متوجہ کردیتی ہے اور نماز کی اس خلافتِ صغریٰ ہی سے خلافتِ کبریٰ کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ چنانچہ ایک پختہ نمازی جو نماز کی حقیقتوں کو دل میں حاضر کر کے نماز ادا کرتا ہو اور جو حاضری مساجد کے التزام کے ساتھ حضورِ مساجد کے اجتماعی تصور کو بیدار کر کے مسجد میں آتا ہو وہ یقیناً زندگی کے اس اجتماعی مرحلہ پر پہنچ کر رہے گا جو مسلمان کی زندگی میں اسلام کو پیشِ نظر ہے۔ اور وہ یہی ہے اس نے مسلمان کی زندگی کے ہر ہر شعبہ کو خواہ وہ تدبیر منزل سے تعلق رکھتا ہو یا سیاست ومدن سے، عبادات سے متعلق ہو یا عادات سے، اجتماعی بنانا چاہا ہے۔ مثلاً باہمی تعلقات اور آپس کے تعاون کو استوار کرنے کے لیے کہیں اسلام نے عیادتِ مریض رکھی تاکہ ایک کی دوسرے کے دل میں جگہ ہو اور قطع راہ ورسم کی صورت نہ ہونے پائے۔ کہیں جنازوں کی متابعت عامہ رکھی کہ میت کی خدمت بھی کسی ایک گھرانے یا قبیلے سے مخصوص نہ رہے بلکہ عامۂ مسلمین کا فریضہ ہوجائے۔

کہیں تعزیت میت عمومی رکھی تا کہ سب کے سب مرنے جینے میں ایک دوسرے کے شریک حال رہیں۔ کہیں زیارت اخوان اور دوستوں سے ملاقات رکھی تا کہ محبت باہمی کی تجدید ہوتی رہے۔ کہیں ایک دوسرے کو ہدیہ دینے کی رسم قائم کی تا کہ دلوں کی کدورتیں صاف ہوتی رہیں اور اجتماعی مقاصد میں فرق نہ پڑے۔ ادھر ہر یگانہ و بیگانہ کے لیے تحیہ وسلام رکھا تا کہ ایک دوسرے سے قریب رہیں۔ مصافحہ پر مغفرت کے وعدے دیئے تا کہ ایک دوسرے سے ہاتھوں کی طرح خود بھی ملے رہیں۔

صلۂ رحمی رکھی تا کہ قرابتیں مضبوط رہیں۔ عزیزوں اور دوستوں کو گھروں پر بے تکلف پہنچ کر کھانے پینے کی رسم قائم کی تا کہ باہمی بشاشت و بے تکلفی مستحکم ہو ساتھ مل کر بلکہ ایک برتن میں کھانے کا ڈھنگ ڈالا تا کہ ایک کو دوسرے سے کراہت اور آپس کی چھوت باقی نہ رہے۔

جماعت میں سے ایک کا وعدہ سب کا وعدہ اور ایک کا ذمہ سب کا ذمہ قرار دیا تا کہ باہمی بے اعتمادی کو راہ نہ ملے۔ قرابتوں اور اخوتوں کے حقوق قائم کئے تا کہ ایک دوسرے سے مربوط رہے۔ بناوٹی مراتب کی تفرقتیں مٹائیں تا کہ باہمی یگانگت قائم ہو کر ایک دوسرے کے کام میں بے تکلف حصہ لے سکے۔ سوء ظن، غیبت چغلی اور آپس کے مخفی حالات کی ٹوہ ممنوع قرار دی تا کہ کوئی ایک دوسرے سے غیر مطمئن نہ ہونے پائے۔ مہمان داری اور اس کے فضائل پر جھکایا تا کہ ملکوں اور وطنوں میں اجنبیت باقی نہ رہے۔ ابن السبیل اور مسافروں کی خدمت رکھی تا کہ کوئی بے وطن اپنے کو غریب اور بے وطن نہ سمجھے، سائلوں کو جھڑکنے سے روکا تا کہ امیر غریب میں منافرت کی تخم ریزی نہ ہونے پائے۔

حتیٰ کہ ہدایت جیسی چیز جو ہر انسان کا شخصی فریضہ ہے اور بلاشبہ ایک کا ہدایت پانا کسی حالت میں بھی دوسرے کے ہدایت پانے پر معلق نہیں۔ لیکن اس جیسے فرض عین کو اللہ سے مانگنے کا طریقہ بھی سکھلایا گیا تو وہ بھی اجتماعی اور جماعتی رنگ سے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعائے ہدایت کے الفاظ حسب ذیل تلقین فرمائے: اَللّٰهُمَّ اهْدِنَا فِيْ مَنْ هَدَيْتَ وَعَافِنَا فِيْمَنْ عَافَيْتَ وَتَوَلَّنَا فِيْمَنْ تَوَلَّيْتَ وَبَارِكْ لَنَا فِيْمَآ اَعْطَيْتَ وَقِنَا شَرَّ مَا قَضَيْتَ.[1]

حاصل ترجمہ یہ ہے کہ اے اللہ! میں ہدایت بھی تنہائی کی نہیں چاہتا کہ میں تنہا ہدایت چاہتا ہوں اور سب گمراہ ہوں بلکہ جماعتی چاہتا ہوں۔ میں عافیت بھی انفرادی نہیں مانگتا، میں برائیوں سے بچاؤ بھی اکیلا نہیں چاہتا''

غرض مثل مشہور ہے کہ تنہا رونا بھی برا اور ہنسنا بھی برا۔ اس لیے ہدایت پانا اور بالفاظ، دیگر اسلام میں آنا اور اسلامی اعمال کے راستہ پر پڑ جانا باوجودیکہ عینی اور شخصی فرض تھا جس میں قدرتاً انفرادیت تھی۔ لیکن اسے بھی انفراد کے ساتھ مانگنا پسند نہیں کیا گیا، بلکہ اجتماعی صیغوں کے ساتھ اس کا سوال کرنا سکھلایا گیا۔ تا کہ ایک انسان اپنی حقیقی خلوتوں کے اوقات میں بھی اجتماعیات کے تصور سے خالی نہ رہنے پائے اور اس کی ساری زندگی جماعتی زندگی کی

---

[1] صحيح ابن حبان، ذكر الزجر عما يريب المرء هذه الدنيا الفانية الزائلة ج: ۳ص: ۲۳۹ رقم: ۷۲۳.

صورت اختیار کر لے۔

اسلام کے اس اجتماعی پروگرام کو سامنے رکھ کر آپ غور کریں گے تو یہ پروگرام اپنی دینی حقیقت کے ساتھ صرف ایک نماز ہی کا پروگرام پائیں گے اسی میں یہ نظام عمل حقیقی للّٰہیت وایثار کے ساتھ کارفرما نظر آئے گا۔ کیوں کہ نماز ہی اپنے پانچ وقت کے اجتماعی مظاہرہ سے جو نماز جماعت کے ضمن میں اس کے سامنے ہوگا اور خود اسی سے سرزد ہوگا۔ اپنی طبیعت کو عام احوال زندگی میں اجتماعی رنگ پر ڈھلتا ہوا دیکھے گا۔ تو معاشرہ میں بھی ان ہی اجتماعی جذبات سے کام لے گا۔

غرض نماز سے پیدہ شدہ جذبات عام انسانی ہمدردی کو ایک ایسی حد پر قائم کر دیتے ہیں کہ خدمت خلق عبادت رب کے ہم پلہ نظر آنے لگتی ہے اور اس میں انفرادیت کے بجائے اجتماعی رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اس خدمت خلق اللہ ہی کی تنظیم کے لیے امامت کبریٰ اور خلافت رکھی گئی ہے تا کہ جماعتی شیرازہ بندی ہو کر خلق اللہ کی ہر ایک خدمت خواہ وہ مادی ہو یا روحانی۔ امام اور خلیفۂ حق کے ذریعہ منظم طریق پر وجود میں آتی رہے۔ ظاہر ہے کہ نماز کی یہ امامت صغریٰ جبکہ ہر طرح سے امامت کبریٰ کی کامل صلاحیت پیدا کر سکتی ہے اور جماعت صلوٰۃ ہی میں مشترک مفاد اور اجتماعی حیات کے جذبات بالخاصہ ظہور پذیر ہو سکتے ہیں اور اس کے لیے نمونہ ہے اللہ کی صلوٰۃ جس کی حقیقت تربیت عالم ہے۔

چنانچہ جس طرح وہ صلوٰۃ ربانی باجماعت تھی کہ سارا عالم تکوینی طور پر اس احکم الحاکمین کی امامت کے تحت اس کے منشاء کی اقتداء کرتا ہے اور اسی تنہا کو عملاً مرکز مانتا ہے۔ اسی طرح یہ انسانی نماز بھی باجماعت ہو کر دنیا میں جماعتی زندگی اور مرکزیت قائم کرتی ہے۔ تا کہ یہ انسان بحیثیت خلیفہ الٰہی اسے پیچھے لا کر اس پر اپنا کنٹرول قائم کر کے اس میں قانون الٰہی جاری کرے اور تشریعی طور پر بھی اسے مالک الملک کے سامنے اسی طرح جھکا دے ۔جس طرح کہ وہ تکوینی طور پر اس کے آگے جھکی ہوئی تھی اور جیسے وہاں تربیت الٰہی اس خدائی نماز یعنی رحمت وشفقت سے ہی ممکن تھی ایسے ہی یہاں بھی تربیت بنی آدم صرف نمازی انسانوں کی نماز ہی سے ہو سکتی ہے جو عبادت کے پہلو سے ادھر کی رحمت وشفقت جذب کرتے ہیں۔

غرض جو آثار خدا نے اپنی صلوٰۃ سے عالم پر ڈالے اگر ایک انسان خود بھی وہ آثار اس دنیا پر ڈالنا چاہتا ہے تو اس کا ذریعہ بھی صلوٰۃ ہی ہو سکتی ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جس طرح نماز برنگ عبادت انسان کے خلوت پسندانہ جذبات کی تربیت کرتی ہے۔ جس سے اس کی شان جمعیت نمایاں ہوتی ہے۔ ایسے ہی وہ برنگ رحمت وتربیت اس کی جلوت پسندی کے دواعی کو بھی ابھارتی ہے جس سے اجتماعیت کا نظام پیدا ہوتا ہے اور خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ جس طرح نماز کے وصف جامعیت نے اسے ایک مکمل ترین عبادت ظاہر کیا تھا اسی طرح اس کی شان اجتماعیت نے اسے مکمل ترین خلافت الٰہی بھی ثابت کیا ہے اور اس طرح نماز کی اس جامعیت اور اجتماعیت سے

جہاں عبادت کا حق ادا ہوتا ہے وہیں خلافت کا حق بھی ادا ہو جاتا ہے۔

بلکہ اگر نماز میں یہ شان اجتماعیت نہ ہوتی اور وہ عبادت رب میں لگا کر خدمت خلق سے بیگانہ بنا دیتی تو شاید وہ اسلامی رنگ کی عبادت ہی نہ کہلائی جا سکتی، کیوں کہ اس کا ثمرہ وہی رہبانیت اور گوشہ گیری نکلتا ہے جسے مٹانے اور اس کی جگہ عبادت وہدایت تک میں جلوتیں اور اجتماعیتیں پیدا کرنے کے لیے اسلام دنیا میں آیا تھا، اسی لیے اس نے عادت وعبادت کو اس طرح باہم ملا دیا کہ یہ دونوں متقابل چیزیں ایک دوسرے کے ساتھ گتھی ہوئیں اور ایک شے کے دو (۲) پہلو نظر آرہے ہیں ہر عادت سے عبادت اور ہر عبادت سے عادت کا رنگ جھلکتا ہے۔

تو نماز جیسی اکمل ترین عبادت ان اصول اجتماعیات سے کس طرح خالی رہ سکتی تھی کہ وہ محض انفرادی راہ پر انسان کو ڈال کر خاموش ہو جاتی، نہیں اس نے اپنے ہر ہر پہلو سے اجتماعیات انسانی کے وہ فطری اور محیر العقول اصول قائم کیے ہیں کہ ایک بڑی سے بڑی سلطنت کا نظام اجتماعی بھی صرف ان ہی اصولوں پر چلایا جا سکتا ہے جن کو اس عبادت (نماز) نے اپنی تنظیم کے سلسلہ میں پیش کیا ہے۔

نماز سے اصول اجتماعیات کا استخراج...... مثلاً سب سے پہلے نماز نے جو اسوہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ فرض نمازیں گھروں میں ادا نہ کی جائیں۔ بلکہ مساجد میں حاضر ہو کر، یعنی ادائیگی نماز کے لیے سب سے پہلی چیز گھر کی چہار دیواری سے باہر ہو جانا ہے۔

ترک خلوت...... گویا نماز نے سب سے پہلے خانگی خلوت توڑ کر ایک انسان کو میدان میں نکالا اور جلوتوں کے ہجوموں میں دیکھنا چاہا۔ جس کا راز ہے کہ گھر کی چہار دیواری میں محدود رہ کر انسان کی نگاہ اس کا تخیل، اس کی سعی اور اس کا علم سب محدود اور تنگ رہتے ہیں اس کی نگاہ گھر میں رہ کر خانگی ہی امور تک محدود رہ سکتی ہے۔ اسے عام شہر یا قوم سے کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے نماز نے گھروں سے مساجد کی طرف سفر کرایا تا کہ انسان کے باطن اور ظاہر میں وسعتیں نمایاں ہوں۔ اور کوئی ایک مسلم بھی تنگ دل، تنگ ظرف اور تنگ حوصلہ باقی نہ رہے کہ جس کے سامنے صرف اس کا نفس اور اس کا گھر ہو۔ بلکہ اس کے ظرف میں گھر سے باہر نکل کر مسلمانوں کے پورے جتھوں اور جھمگھٹوں کی گنجائش ہو اور اس کے دل میں صرف اپنا اور اپنے بچوں ہی کا خیال نہ ہو نیز فی نفسہٖ بھی اس کا تجربہ اور علم گھر کی چہار دیواری تک محدود نہ ہو بلکہ بیرونی مجامع میں پہنچ کر سب کو دیکھ کر اور سب کی سن کر اس کا علم خیال اور تجربہ وسیع تر ہو جائے جس سے اس میں عالی حوصلگی اور وسیع النظر فی کے نورانی آثار نمایاں ہوں اور جب کہ گھر سے محلّہ کی مسجد تک کا یہ مختصر سفر ان مبارک نتائج کا پیش خیمہ تھا۔ تو ظاہر ہے کہ ایسے سفر کی مزید وسعت ان نورانی آثار میں کس قدر مزید اضافہ کر سکتی تھی، سو اسلام کی حکیم شریعت اس سے کیسے اغماض کرتی؟ اس نے تدریجاً اس سفر میں مزید وسعتیں پیدا کیں۔ ہفتہ بھر تو ایک نمازی کو مسجد محلّہ ہی کی طرف سفر کرایا لیکن ہفتہ میں جمعہ کا ایک دن رکھ کر اس سفر کو اور وسعت دی کہ شہر بھر کے مسلمان گھروں سے نکل کر ایک ہی مسجد جامع کی طرف سفر کریں۔ اگر

چہ انہیں محلّہ بھی چھوڑنا پڑے اور مسجد جامع اور جمعہ کے فضائل بیان کر کے ایک طالب اجر نمازی کو مخمور و مسرور بنا دیا اور پھر اس سفر کو اور وسیع کیا تو سال بھر میں عیدین رکھ دیں کہ مسلمان نہ صرف گھروں سے اور نہ صرف محلوں سے بلکہ شہر سے بھی باہر نکل کر عید گاہ (مصلّٰی) میں جمع ہوں اور پھر آخر اس سفر کو اور وسعت دی تو شہر چھوڑ کر ایک اقلیم تک محدود نہ رکھا بلکہ حکم دیا کہ مسلمان عمر بھر میں ایک دفعہ مسجد حرام کی طرف سفر کریں، یعنی گھر بھی چھوڑیں، محلّہ بھی چھوڑ دیں، شہر بھی چھوڑ دیں، صوبہ بھی چھوڑیں، حتیٰ کہ اپنا ملک بھی چھوڑیں، اور دوسری اقلیم میں پہنچ کر مسجد حرام میں حاضری دیں اور پھر اس میں بھی وسعت دی تو مسجد حرام کے بعد حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسجد اقصیٰ بیت المقدس کو بھی شامل فرمادیا کہ: لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلٰثَةِ مَسَاجِدَ مَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَسْجِدِ الْاَقْصٰی وَمَسْجِدِیْ هٰذَا. ① ”سفر عبادت صرف تین مسجدوں کی طرف ہوسکتا ہے۔ مسجد حرام (بیت اللہ) مسجد اقصیٰ (بیت المقدس اور میری مسجد“ (بیت الرسول)

ظاہر ہے کہ جب محلّہ کی مسجد تک نکلنے میں گھریلو خلوت ٹوٹ کر آدمی کا دل و دماغ روشن اور وسعت پذیر ہوتا تھا تو مسجد جامع پھر مسجد عید، پھر مسجد حرام، پھر مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر مسجد اقصیٰ تک نکلنے میں گھریلو کیا شہری اور ملکی خلوت بھی ٹوٹ جائے گی اور کسی درجہ میں بھی آدمی میں تنگ دلی اور تنگ حوصلگی کا وجود باقی نہ رہے گا ۔ بلکہ اگر اس سفر کا شرعی حق ادا کیا جائے ۔ تو ایک عظیم الشان جلوت پیدا ہو کر کس درجہ آدمی کا دل و دماغ روشن ہو جائے گا؟ بہر حال نماز نے اس اسوہ سے اس اصول کی طرف رہنمائی کی کہ مسلمانوں کا گھر اور باہر سفر اور حضر وطن اور غیر وطن سب برابر ہیں ۔ اور جب تک وہ اپنی انفسی اور خانگی زندگی چھوڑ کر باہر نہیں نکلیں گے وہ کبھی اپنے دین، اپنی قوم، اور اپنے ملک کا حق ادا نہیں کر سکتے ، بس اجتماعیات کے لیے جب کہ سب سے پہلی چیز خلوت کا توڑ پھینکنا تھا، تو نماز نے پہلے اسے ہی توڑا۔ اور اجتماعیات کی اولین اساس قائم کر دی۔

قطع انفرادیت ...... پھر مسجد میں لا کر یہ نہیں کہا گیا کہ مسجد میں ہر ایک شخص اپنی اپنی نماز الگ الگ پڑھ کر چلا جائے کہ اس میں خلوت تو ٹوٹ جاتی مگر انفرادیت باقی رہ جاتی جو معنوی خلوت و تنگی ہے اور اجتماعی زندگی کے منافی ۔ اس لیے نماز نے دوسرا، اسوہ یہ پیش کیا کہ مساجد میں پہنچ کر نماز مل کر پڑھی جائے اور ایک جماعت بن کر فریضۂ نماز جماعتی ہیئت سے پیش کیا جائے ۔ چنانچہ نماز کے بارہ میں مختلف عنوانوں سے تنبیہیں اور تاکیدیں فرمائی گئی ہیں۔ قرآن پاک نے فرمایا: وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ. ② ”نمازیوں کے ساتھ مل کر نماز ادا کرو“۔

جس سے جماعت کا وجود اور اس کی تاکید مفہوم ہوتی ہے خواہ سنت موکدہ ہو کر ہو جیسا کہ ائمہ حنفیہ کا قول ہے یا واجب ہو کر جیسا کہ شوافع کا دعویٰ ہے یا فرض قطعی ہو کر جیسا کہ بعض دوسرے ائمہ کا مذہب ہے۔

① الصحيح للبخاری، كتاب الجمعة، باب مسجد بيت المقدس ج:٣ص:٣٨٨ رقم:١١٢٢.

② پارہ: ١، سورة البقرة، الآية:٤٣.

بہر حال جماعت کی تاکید اور شدت تاکید بطور قیدِ مشترک ہر مذہب کے مطابق قرآن شریف سے ثابت ہورہی ہے۔حتی کہ صلوٰۃ خوف میں بھی ترک جماعت کی اجازت نہیں دی گئی، بلکہ مستقلاً قرآنی حکم آیا کہ عین جہاد کے میدان میں بھی جماعت سے نماز پڑھو، گو اس میں جماعت کے دو حصے کر کے آسانی بھی پیدا فرمادی۔

پھر حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت کی ضرورت کے ساتھ اس کے سہل الوصول بنانے کی صورتیں ذکر فرمائیں۔اور اسباب ترغیب ذکر فرمائے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: اِنَّ صَلٰوۃَ الرَّجُلِ مَعَ الرَّجُلِ اَزْکٰی مِنْ صَلٰوۃٍ وَحْدَہٗ وَصَلٰوتُہٗ مَعَ الرَّجُلَیْنِ اَزْکٰی مِنْ صَلٰوتِہٖ مَعَ الرَّجُلِ وَمَتٰی کَثُرَ فَھُوَ اَحَبُّ اِلَی اللّٰہِ ①'' آدمی کی نماز دوسرے کی نماز سے مل کر یعنی (دو کی جماعت سے) اس کی تنہا نماز سے زیادہ پاکیزہ ہے اور دو آدمیوں کی جماعت کے ساتھ ایک کے اجتماع سے زیادہ پاکیزہ ہے اور پھر جس قدر بھی جماعت بڑھ جائے اتنی ہی اس نماز کی محبوبیت اللہ کے یہاں بڑھ جاتی ہے''۔

اسی سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ہر نماز میں احادیث سے وقت کا وہ حصہ اختیار کیا ہے جس میں اجتماع زیادہ ہوسکے۔فجر میں غلس کے بجائے اسفار کو ترجیح دی کہ چاندنہ ہونے پر آدمی زیادہ مجتمع ہوسکیں گے۔ظہر میں تعجیل کے بجائے ابراد کو اختیار کیا کہ جماعت طویل ہوسکتی ہے...... عصر میں ایک مثل کے بجائے دو مثل کو جس میں ہر پسماندہ شریک جماعت ہوسکتا ہے۔

ادھر عشاء میں اگر تاخیر کے بجائے قدرے تعجیل کی تو وہاں تکثیر جماعت کا مقصد پیش نظر ہے تاکہ لوگ سو نہ رہیں۔صرف مغرب رہ جاتی ہے سو اس میں گو عملاً تاخیر نہیں چاہی مگر وسعت وقت کے بارہ میں احادیث کی تفسیر وہ اختیار کی جس کی رو سے مغرب کا وقت غروب شفق تک تھا تو شفق سے مراد شفق ابیض لی نہ کہ شفق احمر کہ وقت ذرا آگے کو سرک کر وسیع ہوجائے اور لوگ زیادہ سے زیادہ جمع ہوسکیں کیوں کہ شفق ابیض شفق احمر کے بعد غروب ہوتی ہے اور وقت وسیع ہوجاتا ہے۔غرض حنفیہ کے یہاں ہر نماز میں تاخیر مستحب ہے بجز مغرب کے اور مقصد سب کا وہی جماعت کی زیادتی ہے کہ عبادت میں جتنا زیادہ سے زیادہ اجتماع ہوتا اتنا ہی اس کا اجر و ثواب بڑھ جاتا ہے۔

پھر نصوص شرعیہ میں مختلف عنوانوں سے جماعت کی ضرورت اس کی فضیلت اور اس کے ترک کی مذمت پر موثر پیرایوں میں روشنی ڈالی گئی ہے۔کہیں فرمایا گیا کہ جماعت سنن ہدیٰ میں سے ہے اگر تم جماعت چھوڑ کر گھروں میں بیٹھ رہو گے تو تم منافق ٹھہرو گے۔کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر گھروں میں عورتوں اور بچوں کا خیال نہ ہوتا تو میں عشاء کی جماعت قائم کر کے اپنے نوجوانوں کو حکم دیتا کہ ان گھروں اور گھر والوں کو آگ دے دیں جو جماعت میں حاضر نہیں ہوتے حتی کہ نابینا تک کو جماعت چھوڑنے اور گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

پھر کہیں فرمایا گیا کہ اگر کسی دیہات اور جنگل میں صرف تین ہی آدمی ہوں اور نمازیں جماعت سے نہ ہوں تو

① السنن للنسائی، کتاب الامامۃ، باب الجماعۃ اذا کانوا اثنین ج:۳ ص:۳۵۶.

ضرور ہے کہ ان پر شیطان غالب آ کر رہے گا۔ کہیں فرمایا کہ جماعت ہی کے سہارے آدمی کی یہ عبادت قائم رہ سکتی ہے کہ ریوڑ سے الگ نکلی ہوئی بھیڑ ہی کو بھیڑیا اچک کرلے جاتا ہے۔ پورے گلے یا گلہ میں منسلک شدہ بکری پر ہاتھ ڈالنے کی اسے جرأت نہیں ہوتی۔ بہر حال نماز میں امت کو تفرق کلمہ اور انتشار سے بچا کر وحدت کلمہ پیدا کرنے کی اشد تاکید کی گئی ہے۔ اس سے واضح طور پر نماز سے اجتماعیت عامہ کا اصول نکلا۔ اور نتیجہ خود بخود ذہن نشین ہو گیا کہ اس اصول کے تحت جب عبادت جیسی چیز میں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے خلوت کو چاہتی ہے۔ یہ جلوت پیدا کی گئی ہے تو اسی اصول کے تحت خود جلوت کے کاموں میں شریعت کو جلوت و اجتماعیت کا کیا کچھ اہتمام نہ ہوگا؟ چنانچہ اجتماعی معاشرت کی متعدد مثالیں میں پہلے عرض کر چکا ہوں جن کی طرف نماز با جماعت ادا کرنے سے طبعیت خود بخود چل پڑتی ہے اور اجتماعیت عامہ کا ظہور ہونے لگتا ہے۔ پس نماز با جماعت ہمیں دن میں پانچ مرتبہ عملی طور پر بتلاتی ہے کہ جس طرح خدا کے اس گھر (مسجد) میں تم مل کر اسے یاد کر رہے ہو۔ اسی طرح خدا کے بنائے ہوئے اس بڑے گھر (دنیا) میں بھی مل کر ہی اسے یاد رکھو یعنی جماعتی زندگی اختیار کرو، اور انفرادوحدت کو ترک کر دو کہ برکت وخیریت، قوت ونصرت، معاملات معاشرت، قومی کلمہ وحدت پھر قومی وبرتری فضیلت صرف جماعتی زندگی میں ہے۔

اگر قوم میں جماعت نہیں تو اس قوم میں کوئی فضیلت بھی نہیں۔ پس نماز با جماعت پوری معاشرتی زندگی کو بھی جماعتی کر لینے کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور اس کے ذریعہ مل کر کام کرنے کی خو پیدا ہوتی ہے، کیوں کہ مساجد میں پانچ وقت کی حاضری اور اجتماع سے دن رات میں پانچ مرتبہ ایک دوسرے کی آنکھ سامنے ہوگی تو سامنے پڑی آنکھ کا اثر لینا اور لحاظ و پاس کرنا ہے۔ جس کا اثر وہی تعاون باہمی اور تناصر ہے اور ظاہر ہے کہ تمدن کا دارومدار اسی تعاون وتناصر اور مل کر کام کرنے پر ہے کہ ایک دوسرے کے لیے باعث اذیت ہونے کے بجائے باعث راحت ومعاونت ہو۔ معاشرت کے تمام شعبوں، تجارت، زراعت، ملازمت، صنعت وحرفت میں ایک دوسرے کا دست وبازو بنے اور مددگار ہو۔ اور جب کہ نماز سے یہ تمدنی روح ریل میل اور تعاون وغیرہ کی خوبی بالخاصہ پیدا ہوتی ہے جس سے مدنیت کی اساس قائم ہوتی ہے تو نماز کے ذریعہ اصول اجتماعیت صاف طور پر پروان چڑھتا ہوا محسوس ہو جاتا ہے۔

نماز با جماعت میں معیار اجتماعیت...... اب نماز کے اس پہلو پر غور کرو کہ کسی مسجد میں نماز کے لیے مجتمع ہونے کے وقت ہر گز یہ شرط نہیں کہ وہ اسی مقام کا باشندہ ہو جہاں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کھڑی ہے۔ نہیں:۔ بلکہ باہر سے آنے والا ہر جگہ کا مسلمان اپنے پورے حق کے ساتھ شریک جماعت ہو سکتا ہے۔ اسی طرح یہ شرط بھی نہیں کہ وہ اسی قوم کا ایک فرد ہو جو مسجد کا متولی ہے بلکہ ہر قوم اور قوم کے ہر طبقہ کا آدمی جماعت میں شریک ہونے کا پورا پورا حق رکھتا ہے۔ یہ شرط نہیں کہ ایک مسجد کے شرکائے جماعت کسی ایک ہی نسل کے ہوں، بلکہ ہر نسل کا ایک انسان ایک دوسرے کے دوش بدوش شریک جماعت ہو سکتا ہے۔ اس سے گویا نماز روزانہ اس اصول کا اعلان کرتی ہے کہ

مسلمانوں میں اجتماعیت کا معیار نہ وطن ہے نہ قومیت، نہ نسل ہے نہ رنگ، نہ خون ہے نہ قرابت بلکہ صرف اسلامیت ہے۔ مسلمانوں کی قوم قوم ہی من حیث المذہب ہے، نہ کہ من حیث الوطن، من حیث النسل جس کی مصیبت التزءِ تفریقوں میں آج دنیا کے سارے مشرقی اور مغربی وطن پرست گرفتار ہیں اور سر پھٹول انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اگر مسلمانوں کی قوم کا معیار اجتماعیت وطن یا نسل ہوتا تو اسلام نہ حجاز سے باہر نکلتا اور نہ عربی النسل افراد سے تجاوز کرتا۔ اور پھر بھی اگر وہ مختلف وطنوں میں بکھرے ہوئے اور بود و باش اختیار کئے ہوئے ہوتے اور اسلام انہیں خون یا وطن کے رشتہ سے جوڑنے کی کوشش کرتا تو اس صورت میں اسلام کوئی دین یا مذہب نہ ہوتا بلکہ وہ ایک قومی تحریک ہوتا جس کا مقصد نسل یا وطن کے لحاظ سے اپنی قوم کی شیرازہ بندی یا فوقیت یا برتری ہوتی، نہ کہ للّٰہیت اور دیانت عامہ۔ پس نماز نے ہمیں اجتماعیت کے ساتھ معیار اجتماعیت بھی بتلایا کہ وہ وطن اور نسل نہیں بلکہ صرف دین ہے اور یہ کہ اسلام کوئی رسمی تحریک نہیں بلکہ خدائی مذہب ہے، جو ہر وطن اور ہر نسل پر خود چھایا ہوا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مسلم اجتماعیت جبکہ مذہب اور دین کے معیار سے تھی، تو اس کی اجتماعیت میں اگر ٹکڑے ٹکڑے بھی ہوئے تو وہ بھی مذہب ہی کے معیار سے ہوئے۔ کیوں کہ قدرتی طور پر جو جماعت مذہب کے نام پر بنتی ہے وہ مذہب ہی کے نام پر بگڑتی ہے اور جو مذہب کے اعتبار سے مجتمع ہوتی ہے۔ وہ اسی کے نام پر منتشر بھی ہوتی ہے۔

پس مسلمانوں میں اگر بے نظیر وحدت اور اجتماعیت اسلام اور دین کے لحاظ سے تھی تو اس میں فرقے بھی مذہبی ہی پیدا ہوئے، یعنی مذہبی عقائد والا بگڑے جن سے قوم میں اختلاف رونما ہوا اور وہ بلحاظ عقائد گروہ در گروہ ہوگئی کہ اس میں جیسی وحدت تھی ویسی ہی فرقت بھی ہوئی۔

چنانچہ حدیث میں اگر ۷۳ فرقوں کی خبر دی گئی ہے تو وہ اختلاف عقائد ہی کی رو سے دی گئی ہے۔ جو بلاشبہ مذہبی عقائد ہیں۔ کیوں کہ ان ۷۳ فرقوں میں سے ایک کو جنتی اور بقیہ کو ناری فرمایا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ اخروی لحاظ سے عقائد مذہب ہی کے حسن و قبح سے ممکن تھا۔ نہ کہ محض خیالات معاشرت اور طرق مدنیت سے کہ یہ چیزیں فی نفسہٖ دین اور دیانات نہیں بلکہ محض مقامات دین یا دینی شوکت کے ذرائع میں سے ہیں جو نیت دین سے دینی بنتی ہیں ورنہ دنیائے محض رہ جاتی ہیں۔ اسی لیے دیانات و معاشرات اور معاملات کی تقسیم میں دیانات کو معاملات اور معاشرت کا قسیم اور مد مقابل بنایا گیا ہے۔ جو ان کے باہمی تغائر کی دلیل ہے۔ پس جبکہ مسلمانوں کی فرقہ بندی بنص حدیث دیانت کے معیار سے ثابت ہوتی ہے نہ کہ معاشرت و اقتصادیات اور سیاسیات کی رو سے۔ اس سے صاف ظاہر و اضح ہے کہ یہ قوم، قوم ہی بلحاظ دین ہے جس کا اجتماع بھی معیار دین ہی سے ہے۔ حاصل یہ ہے کہ مسلم قوم کی جو وحدت و اجتماعیت مطلوب ہے، وہ اسلامی اور دینی حیثیت ہی کی مطلوب ہے، جو دینی معیار سے ہو۔ اس سے ایک نکتہ یہ حل ہوتا ہے کہ آج جب کہ مسلمانوں میں تمدنی اور سیاسی حیثیت سے فرقہ بندی ہو رہی ہے تو اس عرض کردہ اصول پر یہ اس کی صریح دلیل ہے کہ اب ان کی وحدت کا بھی معیار بدل گیا ہے۔ وہ آج متحد ہونا

ضرور چاہتے ہیں لیکن عصری سیاسی مقاصد کے معیار سے۔ نہ کہ دینی عقائد کے معیار سے آج ان کا وہ دینی معیار سست پڑ چکا ہے اور وہ اپنی بنیاد سے ہٹ چکے ہیں۔ کیوں کہ آج کل ان کی فرقت سیاسی ہے تو اس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ وہ وحدت بھی سیاسی ہی چاہتے ہیں اور سیاسی بھی وہ جو محض قومیت کی رسم لیے ہوئے ہو۔ نہ وہ جو اسلامی دیانت سے پیدا شدہ اور لادینی سے دور خالص للہی سیاست ہو، جس کا حاصل دنیا میں خدائی اخلاق اور خدائی قانون کا رواج دنیا اور انسانی دساتیر کی ظلماتی بندشوں سے بنی آدم کو رہائی دلانا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ صورت حال اسلامی نقطۂ نظر سے اس لیے سخت افسوس ناک ہے کہ اجتماعیت تو امت میں برسوں سے گم بلکہ صدیوں سے مضمحل ہے اور عرصہ ہائے دراز سے اس قوم کو تفرق اور انتشار کلمہ نے گھیر رکھا ہے، جو آج بھی موجود ہے۔ مگر فرق اتنا ہے کہ پہلا انتشار یا تخرب مذہبی اور دینی حیثیت سے تھا جو اس کی دلیل تھا کہ ابھی تک ان کا معیار اجتماعیت بھی دینی ہے اور جب بھی مجتمع ہوں گے تو دینی اساس ہی پر تعمیر اجتماع کریں گے۔

لیکن آج کا انتشار ملکی، تمدنی، اقتصادی اور عصری سیاست کے معیار سے ہے، جس کے یہ معنی ہیں کہ ان کی قومیت اور اجتماعیت کا معیار خالص دین نہیں رہا ہے بلکہ اس میں خالص دنیا کا دخل آ گیا ہے۔ گویا پہلے تو آفات ان کی دنیا پر پڑتی تھیں، دین محفوظ تھا اور اب آفات ان کے دین پر ہیں۔ اور دنیا کے تحفظ کی فکر ہے جو یقیناً امت کے لیے قابل تحسین پہلو نہیں ہے۔ اس سے میری غرض یہ ہرگز نہیں ہے کہ میں قوم کو سیاسیات یا اجتماعیات میں حصہ لینے سے روکنا چاہتا ہوں۔ بلکہ میرا تو موضوع ہی اس وقت اجتماعیات ہیں جیسا کہ اس تقریر سے آپ سمجھ رہے ہیں، نیز میرے نزدیک قوم میں ایسے افراد کی اشد ضرورت ہے جو سیاسی شعور سے آراستہ ہوں اور نہ صرف شرعی سیاست بلکہ عصری سیاست کو بھی پوری طرح سمجھتے ہوں۔ نیز ایسے افراد کی بھی میرے نزدیک سخت ترین ضرورت ہے، جو سیاسی میدان میں بھی بے جگری کے ساتھ کودے ہوئے ہوں۔ پس میرا مقصد سیاسی اقدامات سے روکنا نہیں، غرض صرف یہ ہے کہ ایک سیاسی مسلمان کا ہر ایک اقدام خالص شرعی ہدایات کے ماتحت اور شرعی رنگ میں ہو اور سیاسیات میں رہ کر بھی اسوۂ ہائے سلف کا دامن اس کے ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ تاکہ اس کے دماغ میں دیانت کی اہمیت بھی باقی رہے کہ وہی مقصود اصلی اور مطلوب حقیقی ہے۔ نیز یہ کہ اس کا معیار اجتماعیت محض سیاست اور وہ بھی عصری سیاست نہ رہ جائے جس کا دوسرا نام مکر وفریب اور دھوکہ دہی یا ہوسنا کی ہے بلکہ اس کا معیار اجتماعیت وہی ہو جو قرون اولیٰ کی اجتماعیت اور شیرازہ بندیوں کا تھا، جس کی روح اخلاص و دیانت اور پاک بازی وللہیت تھی۔

پس اس تنقید سے میری غرض سیاسی جذبات کا فنا کرنا نہیں، بلکہ ان جذبات کی بے ڈھنگی رفتار اور بے اصول کردار کو روکنا ہے۔

بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آج مسلمانوں کا معیار اجتماعیت بدل گیا ہے یعنی دین کے بجائے دنیا اور حظوظ آخرت کی جگہ حظوظ دنیا نے معیاری صورت اختیار کر لی جس سے لوگ فتن اور مہالک کا شکار ہو رہے ہیں اور

دنیا میں ہیبت ناک آفات کا ظہور ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کو اس صحیح معیار اجتماعیت کے سمجھنے کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں۔ صرف جماعت میں غور کر لینا کافی تھا۔ اور اب بھی تصحیح خیال کی مختصر صورت یہی ہے کہ ہم نماز پڑھ کر اس کے شرعی جوڑ بند پر دھیان کریں اور غور کریں کہ وہ ہمیں کس رفتار پر لے جانا چاہتی ہے تاکہ اسی رفتار کو ہم اپنی پوری دنیا اور اجتماعی زندگی میں بھی اختیار کر سکیں۔

اجتماعیت، معیارِ اجتماعیت اور نوعِ اجتماعیت ......نماز کا اہم بنیادی حصہ جماعت کی صورت یہ ہے کہ جو بھی مسجد میں آجائے وہ اگلی جماعت میں داخل ہونے اور شریکِ جماعت ہونے کا حقدار ہو جاتا ہے۔ خواہ وہ کسی وطن کا باشندہ ہو اور خواہ اس کی اقتصادی حالت اور سیاسی نظر کچھ بھی ہو شرط صرف یہ ہوگی کہ وہ مسلم ہو اور اس میں اسلامیت ہو، اس صورت حال سے نماز سے اجتماعیت بھی ثابت ہوئی اور معیارِ اجتماعیت بھی واضح ہو گیا کہ نہ وہ وطنیت ہے، نہ رنگ و نسل بلکہ صرف اسلامیت ہے۔ اسی کے ساتھ اگر نماز ہی میں غور کریں گے تو اجتماعیت کی نوعیت بھی واضح ہو جائے گی کہ وہ کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ نماز کے اجتماع میں اجتماعیت کے معنی محض جمع ہو جانے یا بھیڑ بھڑکا کے نہیں ہیں بلکہ نظم و تنظیم کے ساتھ خاص قسم کے اجتماع کے ہیں۔ ورنہ یوں تو مسجد میں جماعت کھڑے ہونے سے پیشتر بھی اجتماع ہوتا ہے اور کافی بھیڑ ہوتی ہے مگر نہیں کہا جاتا کہ جماعت ہو رہی ہے جبکہ تک کہ اس میں تنظیم اور ایک منظم ہیئت پیدا نہ ہو جائے۔

اس نظم کا پہلا رکن جو ظاہر نظم سے تعلق رکھتا ہے، اصطفاف ہے یعنی صف بندی اور پرا باندھ کر کھڑے ہونا۔ جیسا کہ ملائکہ صف بندی کرتے ہیں تاکہ مجمع میں ترتیب قائم ہو کر یکسانی کی صورت نمایاں ہو۔ ورنہ بغیر اس کے نظم جماعت ہی قائم نہیں ہو سکتا، چنانچہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اس حقیقت کو تفصیل سے واشگاف کیا گیا ہے جس کو حضرت جابر ابن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ: **خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرَاٰنَا حِلَقًا فَقَالَ مَالِيْ اَرَاكُمْ عِزِيْنَ ثُمَّ خَرَجَ عَلَيْنَا فَقَالَ اَلَا تَصُفُّوْنَ كَمَا تَصُفُّ الْمَلٰٓئِكَةُ عِنْدَ رَبِّهَا قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَكَيْفَ تَصُفُّ الْمَلٰٓئِكَةُ عِنْدَ رَبِّهَا قَالَ يُتِمُّوْنَ الصُّفُوْفَ الْاُوْلٰى وَيَتَرَاصُّوْنَ فِي الصَّفِّ** ①

’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے تو ہمیں حلقہ در حلقہ اور ٹولیاں بنے ہوئے دیکھا، فرمایا کیا بات ہے کہ میں تمہیں منتشر دیکھ رہا ہوں؟ پھر تشریف لائے تو فرمایا تم صف بندی کیوں نہیں کر لیتے جیسا کہ فرشتے اپنے پروردگار کے پاس صف بندی کیے رہتے ہیں۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! اور فرشتے کیسے صف بندی کرتے ہیں اپنے رب کے پاس؟ فرمایا پہلے اولین صفوف کو پورا کرتے ہیں اور صفوں میں گتھ کر اور مل کر کھڑے ہوتے ہیں‘‘۔ (مشکوٰۃ)

① الصحيح لمسلم، كتاب الصلوة، باب الامر بالسكون في الصلاة والنهي عن الاشارة باليد، ج: ١٠ ص: ٣٦٢ رقم: ٦٣٠.

اس حدیث سے واضح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے تو اس پر ملامت فرمائی کہ تم لوگ متفرق کیوں بیٹھے ہو، جو اس کی علامت ہے کہ تمہارے دلوں میں مل بیٹھنے کی خواہش نہیں ہے گویا حکم فرمایا کہ مل کر بیٹھو۔ پھر فرمایا کہ محض مل جانا اور جمع ہو جانا یا اکٹھے ہو جانا بھی کافی نہیں بلکہ اس اجتماع میں ترتیب نظم پیدا کرو یعنی صف بندی کرو۔ پھر محض صف بندی بھی کافی نہیں بلکہ صفوں کا اہتمام کرو جب تک صف اولیٰ مکمل نہ ہو دوسری صف مت بناؤ کہ آدھی تہائی اور ادھوری صفیں بھی بدنظمی اور بدسلیقگی ہے اور پھر تمام صفوں کا اس منوال پر مکمل کر لینا بھی کافی نہیں جب تک کہ ان میں تراص یعنی گتھ کر کھڑے ہونے کی صورت پیدا نہ ہو۔ یعنی ایک دوسرے سے خوب مل کر کھڑے نہ ہوں جس سے ذرا بھی درمیانی فرجہ باقی نہ رہے کہ یہ بھی نظم کے منافی ہے اور پھر ان سارے آداب اجتماعیت کے بعد بھی یہ اجتماعیت کافی نہیں جب تک اس میں عِنْدَ رَبِّهَا کی قید نہ پائی جائے۔ یعنی اللہ کے سامنے حاضر ہو کر حضور قلب اور خشوع باطن کے ساتھ قرب ونزدیکی کی نیت سے یہ اجتماعیت ہو کہ اس کے بغیر یہ ساری تنظیم محض ایک رسمی ہو گی۔ جس میں کوئی بھی حقیقت نہ ہو گی۔ پس صورت تفریق مٹانا، صورت وحدت قائم کرنا، اس میں نظم وترتیب کا لحاظ رکھنا۔ پھر درجہ بدرجہ اپنی ترتیبات کو تدریجاً مکمل کرنا۔

پھر تو اصل باہمی پیدا کرنا جس میں میل ملاپ ظاہری بھی ہو۔ اور پھر ان سب مہمات میں للٰہیت اور بے نفسی سے کام لینا۔ کیا عام نظام ملت قائم کرنے کے لیے اس اصول کے سوا بھی کوئی اور راستہ ہو سکتا ہے جس پر حیات اجتماعیت کی عمارت کھڑی کی جائے؟ ہرگز نہیں۔ پس نماز فرش مسجد پر اجزائے ملت کا ایک ایسا با اصول اور مکمل نظام روزانہ تیار کرتی ہے کہ اس سے ان اصول پر مطلع ہو کر نمازی قوم اگر پوری ملت کا نظام قائم کرنا چاہے تو بآسانی کر سکتی ہے، کیوں کہ محل کے بدل جانے سے اصول میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ورنہ اصول کا اصول ہونا ہی باقی نہ رہے۔

اس لیے یہ اصول مسجد میں جماعت صلوٰۃ بنائیں گے۔ اور بیرون مسجد نمازی ملت کی مکمل تشکیل کر دیں گے۔ جس سے حیات اجتماعی کا نقشہ خود بخود ملت میں نمایاں ہو جائے گا۔ پس ان اصول سے گویا نماز ہمیں عملاً ہدایت کرتی ہے کہ میری جیسی تنظیم جو تم مسجد میں آ کر کرتے ہو۔ اپنے گھروں میں اور اپنے ممالک میں بھی اختیار کرو، تمہاری خانگی زندگی اور ملکی زندگی بھی ایسی ہی ایک صف اور ایک لائن کی ہونی چاہیے جس میں تم باہم گتھے ہوئے ہو، تمہارے درمیان فرجے اور تفرقے نہ ہوں، تم میں اجتماعیت ہو، تفرق کلمہ نہ ہو، گروہ بندیاں نہ ہوں بلکہ تمام مسلمان مل کر ایک ہوں اور ایک جسد کی طرح ہوں، اس قومی جسم میں اعضاء مختلف سہی مگر روح سب کی ایک ہو، پھر اس وحدت یا قوم کی وحدانی شکل کے لیے کسی پنڈال یا مقام پر جمع ہو جانا یا زائد سے زائد کسی خاص نقطۂ خیال اور نظریہ پر آ جانا اور ایک پارٹی بن جانا کافی نہیں جب تک کہ اس میں نمازی اصول کے مطابق تنظیم نہ ہو۔ یعنی خیالات کی رو یکسانی کے ساتھ کسی نظم کے ماتحت نہ دوڑ رہی ہو یا جماعت کی عملی سطح اور افکار ایک نہ ہوں پوری قوم صف صلوٰۃ کی طرح ایک آہنی دیوار کی طرح سے نہ کھڑی ہو۔ جس میں کسی دیکھنے والے کو کوئی ادنیٰ فتور یا خلل نظر نہ

آئے۔ پھر صفوف نماز کی استقامت اور سیدھ کی طرح اس مسلم جماعت میں بھی جماعتی استقامت ہو یعنی قلوب میں زیغ نہ ہو، خیالات میں تزاحم اور تخالف نہ ہو، مقاصد ایک ہوں، دل ایک لائن پر چل رہے ہوں، اور وہ بھی صرف اپنی ہی لائن پر جمے ہوئے ہوں۔

پھر ساتھ ہی نماز کے عِنْد ربھا کی طرح اس اجتماعی حیات میں بھی مسلمانوں کا شعار رجوع وانابت الی اللہ اور اخلاص وللّٰہیت ہو۔ یعنی وہ جو کچھ بھی کر رہے ہوں دنیا کی خاطر نہیں بلکہ آخرت کی خاطر۔ نفس کے لیے نہیں بلکہ اللہ کے لیے اور نفسانیت سے نہیں بلکہ للّٰہیت سے کر رہے ہوں۔ غرض عند ربھا کا یہاں بھی پورا ظہور ہو۔

نماز اور مرکزیت...... ادھر نماز نے ان منتشر افراد کو جمع کر کے ایک پہلو یہ اختیار کیا کہ ان سب جمع شدہ افراد کے آگے ایک فردِ واحد کو بنام امام آگے بڑھا کر ساری قوم کو اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ جس سے ایک اصول یہ نکلا کہ اس جماعتی تنظیم کا قوام ان تمام مذکورہ شرائط اور حدود وقیود کے باوجود پھر بھی قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس جماعت کا شیرازہ بند اور بندھن موجود نہ ہو۔ یہ صف بندی، یہ لائنوں کی یکسانی، یہ گتھ کر کھڑے ہونا جب ہی تو وجود پذیر ہو سکتا ہے کہ کوئی طاقت اس کو بروئے کار لائے اور اس میں سے تشتت کی راہیں مسدود کر دے، کیوں کہ محض اصول کتنے ہی معقول ہوں کافی نہیں ہو سکتے، جب تک کہ ان اصول کو چلانے والی کوئی طاقت نہ ہو۔

پس نماز کی ان صف بندیوں اور عام تشکیلات کو جو طاقت بروئے کار لاتی ہے اور اس میں صورت نظم یا اجتماعیات قائم کرنے کے لیے بندھن کا کام دیتی ہے وہ نصب امام ہے۔ اگر امام نہ ہو تو جماعت ہی نہیں بلکہ ایک بھیڑ ہے خواہ وہ کتنی ہی خوبصورت رد کار کی ساتھ کھڑی ہو۔ کیوں کہ وہ سب چلنے والے ہیں، چلانے والا تو امام ہی ہو سکتا ہے۔

چنانچہ فقہاء تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ مسجد میں جماعت کو کھڑے ہو کر صف بندی ہی اس وقت کرنی چاہیے جب کہ امام مصلّی پر پہنچ جائے۔ ورنہ بلا امام جماعت کا اقدام گویا جماعتی نہ ہوگا بلکہ انفرادی ہوگا گو بہت سے افراد کے ایک دم اکٹھے ہو جانے کے سبب اس کی شکل جماعت کی سی ہو جائے۔

اب سمجھ لیجئے کہ نصب امام کا جو اصول اس امامت صغریٰ میں ضروری تھا۔ بعینہٖ وہی اصول امامت کبریٰ میں بھی ناگزیر ہے۔ گویا نماز نے ہدایت کی ہے کہ مسلمانوں کی جماعت کتنی ہی خوبصورت تنظیم کی رسم پیدا کر لے وہ جماعت نہیں کہلائی جا سکتی۔ جب تک کہ اس کے لیے کوئی امیر اور امام منتخب نہ کیا جائے جو سب کو ایک خاص لائن پر چلائے اور ان کی اول وآخر کی نگرانی کرے۔ نیز امام کے بغیر ایک جماعتی نظم ہی نہیں بلکہ باہمی ربط بھی قائم نہیں ہو سکتا جو نظم کی بھی روح ہے۔ کیوں کہ یہ ایک فطری اصول ہے کہ ایک اصل کے چند شریک جس طرح سب کے سب اصل سے مربوط ہوتے ہیں۔ اسی طرح وہ باہم بھی مربوط ہوتے ہیں۔ جیسے ایک باپ کے چند بیٹوں میں محبت واخوت ہوتی ہے۔ ایک جد کے چند قبائل میں جد کے ساتھ ساتھ باہم بھی قبائل میں نسلی تعلق ہوتا ہے۔ گو قرب وبعد کا تفاوت بھی ہو کہ اصل قریب کے شرکاء کا باہمی ربط زیادہ مضبوط ہوتا ہے بہ نسبت اصل بعید کے۔ مگر

نفس رابطہ قدرتی ہے۔ایسے ہی معنوی رشتوں میں بھی یہ فطری اصول کارفرما ہے بلکہ زیادہ مضبوطی کے ساتھ۔چنانچہ ایک استاد کے چند شاگرد استاد سے بھی اور باہم بھی مربوط ہوتے ہیں کیوں کہ استاد ان کی معنوی اصل ہے۔ایک پیر کے چند مرید پیر سے بھی اور آپس میں بھی متحد ہوتے ہیں کہ پیران کی معنویت کی اصل ہے۔اسی طرح امام صلوٰۃ تمام مقتدیوں کی نماز کی اصل ہے تو اس اصول کی رو سے لازمی ہے کہ مقتدیوں کو امام سے بھی اور بواسطۂ امام آپس میں بھی ایک رابطۂ اخلاص واتحاد ہو۔

بشرطیکہ امام ومقتدی اپنی شرعی شرائط پر پورے اترتے ہوں کیوں کہ امام مقتدیوں کی نماز کا اصل اصول ہے گویا اصل نماز اس کی ہے اور اس کے ضمن میں پھر نماز مقتدیوں کی ہے،اسی لیے حدیث میں ارشاد ہے:اَلْاِمَــامُ ضَامِنٌ ① امام (بحق جماعت) ضامن ہے۔

پس امام ضامن ہے اور مقتدی مضمون ہے جو اس کے ضمن میں لپٹا ہوا راہ صلوٰۃ میں چلا جارہا ہے۔امامت کا یہ اصول جو اس امامت صغریٰ میں بتایا گیا ہے بعینہ امامت کبریٰ کی بھی روح ہے اور اس میں بھی اسی طرح کارفرما ہے۔امام المسلمین یا امیر المؤمنین تمام مسلمانوں کی ایک اصل کلی ہے۔اور بمنزلہ مربی باپ کے ہے جو ان کی علمی،دینی، سیاسی اور اخلاقی تربیت کا ذمہ دار اور ان مدارج کی روح رواں ہے کیوں کہ وہ خلیفۂ الٰہی اور خلیفۂ رسالت پناہی ہے۔اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے بارہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ:اَنَا لَكُمْ بِمَنْزِلَةِ الْوَالِدِ ② ”میں تمہارے لیے بمنزلہ (روحانی) باپ کے ہوں“۔

اس لیے لازمی ہے کہ مشرق ومغرب کے تمام مسلمان اس امیر عامہ سے مربوط ہوں تاکہ وہ اسی ربط کی قدر آپس میں بھی مربوط ہو جائیں۔بشرطیکہ امیر بھی ان شرائط وصفات سے موصوف ہو جو شریعت نے اس کے لیے تجویز کی ہیں اور رعایا بھی اس کی تربیت سے اسی لائن پر ہو جو اس کے لیے شریعت نے بچھائی ہے۔چنانچہ اسی بناء پر ایسے امیر اور رعایا سے شریعت نے بیزاری کا اظہار کیا ہے جن میں یہ باہمی ربط نہ ہو اور یہ صورت اسی وقت ہے کہ راعی اور رعایا دونوں مقررہ شرعی اوصاف سے عاری ہوں۔ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

خِيَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تُحِبُّوْنَهُمْ وَيُحِبُّوْنَكُمْ وَتُصَلُّوْنَ عَلَيْهِمْ وَيُصَلُّوْنَ عَلَيْكُمْ وَ شِرَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تَبْغُضُوْنَهُمْ وَيَبْغُضُوْنَكُمْ قَالَ قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَلَا نُنَابِذُهُمْ ؟قَالَ اَلَا مَا اَقَامُوْا فِيْكُمُ الصَّلٰوةَ اَلَا مَنْ وُّلِيَ عَلَيْهِ مِنْ وَّالٍ فَرَاٰهُ يَاْتِيْ شَيْئًا مِّنْ مَّعْصِيَةِ اللّٰهِ فَلْيَكْرَهْ مَايَاْتِيْ مِنْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ وَلَا يَنْزِعَنَّ يَدًا مِّنْ طَاعَةٍ. ③

① السنن لابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب مایجب علی المؤذن من تعاهد الوقت ج:۲ ص:۱۱۰ .

② السنن لابی داؤد، کتاب الطهارة، باب کراهية استقبال القبلة عند قضاء الحاجة ج:۱ ص:۱۲ .

③ الصحیح لمسلم، کتاب الائمة، باب خيار الائمة وشرارهم ج:۳ص:۱۴۸۲ رقم:۱۸۵۵ .

’’تمہارے بہترین امراء وہ ہیں کہ تم ان سے محبت کرو۔ اور وہ تم سے، تم انہیں شفقت سے یاد کرو اور وہ تمہیں، اور تمہارے بدترین امراء وہ ہیں کہ تم ان سے بغض رکھو اور وہ تم سے، تم انُ پر لعنت بھیجو اور وہ تم پر۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! تو کیا ایسے امراء کو ہم چھوڑ دیں؟ فرمایا نہیں! جب تک وہ تم میں نماز کو قائم کرتے رہیں ہرگز نہیں، لوگو ! آگاہ ہو جاؤ کہ جو شخص کسی پر والی (امیر) بنایا جائے اور وہ امیر میں کسی معصیت کا مشاہدہ کرے تو اس گناہ کو تو برا سمجھتا رہے مگر امیر کی اطاعت سے منہ نہ موڑے‘‘۔

اس سے جہاں امام کی شرائط واضح ہوئیں کہ وہ اپنے مامورین کا محبّ ہو یعنی اخلاق ربانی رکھتا ہو اور معصیت کار نہ ہو، وہیں مقتدیوں اور رعایا کی شرط بھی واضح ہوگئی کہ وہ بہر حال محبِّ امیر اور بااخلاق بن کر اس کی اطاعت پر کمربستہ رہیں اور گاہے بگاہے امیر کی ذاتی حرکات ناشائستہ بھی دیکھیں تو اطاعت سے منحرف نہ ہوں جب کہ وہ اقامت دین کرتا رہے جس کی بڑی زبردست علامت یہ ہے کہ وہ رعایا کے ساتھ مل کر نماز قائم کرتا رہے۔

پس جو اصول نماز نے اپنی امامت میں بتلایا تھا وہی بعینہٖ امامت کبریٰ کے لیے بھی ناگزیر نکلا۔ یعنی امام کا خلیق و متواضع اور ساتھ ہی مہمات دین سے باخبر ہونا۔ اس کے بعد نماز نے امامت کے سلسلہ میں شرائط امام کے متعلق ایک اور پہلو پیش کیا اور وہ یہ کہ امام صلوٰۃ کے لیے کسی حد تک امتیازی نشان بھی ہونا چاہیے تاکہ مقتدیوں پر امام کو کوئی نہ کوئی فوقیت و برتری حاصل رہے۔ جس کے سبب مقتدیوں کو اس کی اقتداء میں عار نہ پیدا ہو۔ چنانچہ اسی لیے حدیث میں فرمایا گیا کہ: يَؤُمُّ الْقَوْمَ اَقْرَأُهُمْ لِكِتَابِ اللّٰهِ فَاِنْ كَانُوْا فِي الْقِرَآءَةِ سَوَاءً فَاَعْلَمُهُمْ بِالسُّنَّةِ فَاِنْ كَانُوْا فِي السُّنَّةِ سَوَاءً فَاَقْدَمُهُمْ هِجْرَةً فَاِنْ كَانُوْا فِي الْهِجْرَةِ سَوَاءً فَاَقْدَمُهُمْ سِنًّا. ① ’’امامت قوم کی وہ کرے جو، ان میں سب سے زیادہ قرآن پڑھا ہوا ہو اگر قرآءت قرآن میں سب برابر کا درجہ رکھتے ہوں تو پھر امامت وہ کرے جو سب سے زیادہ عالم سنت ہو۔ اور اس میں بھی سب برابر ہوں تو جو ہجرت میں سب سے مقدم ہوں اور اس میں بھی سب مساوی ہوں تو جو عمر میں سب سے زیادہ ہو‘‘۔

آگے اسی اصول پر فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر سن میں بھی سب برابر ہوں تو نسب میں جو اعلیٰ ہو۔ اور اگر نسب میں بھی سب مساوی ہوں تو حسن و جمال میں جو سب سے بہتر ہو۔ اس سے اصول یہ نکلا کہ امام میں کوئی نہ کوئی امتیازی فضیلت ایسی ہونی چاہیے کہ مقتدی اسے اپنے سے بڑھا ہوا تسلیم کرلیں اور اس کی اقتداء سے گریز نہ کرسکیں، ہاں ! اگر اس ساری تعلیم کے باوجود کوئی شخص خواہ مخواہ ازراہ زبردستی امامت کے مصلّٰی پر جا کھڑا ہو، درحالیکہ اس میں کوئی بھی خاص فضیلت یا خصوصیت نہ ہو۔

بلکہ فرض کرلو کہ اس میں فسق و فجور بھی پایا جاتا ہو تو پھر یہ نہیں کہا گیا کہ جماعت ترک کردو، یا اسے ہاتھ پکڑ کر وہاں سے ہٹاؤ، جب تک کہ وہ نماز ہی خراب کرنے کی فکر میں نہ پڑ جائے۔ کیوں کہ اس میں فتنہ ہے اور فتنہ قتل سے

① الصحیح لمسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب من احق بالامامۃ ج: ۳ ص: ۴۲۸.

بھی بڑھ کر شدید اور ناقابلِ برداشت ہے۔ الا یہ کہ فتنہ کا خوف نہ ہو تو پھر بلاشبہ ایسے امام کو بدل دینا چاہیے۔

غور کرو تو یہی اصول حیاتِ اجتماعی کی بھی روح ہے اور اس کے بغیر سیاسی اور ملکی زندگی میں بھی کوئی نظم قائم نہیں ہو سکتا۔ یعنی امامت کبریٰ کے سلسلے میں بھی امیر میں کچھ اوصاف امتیازی اور فضیلتیں ممتاز ہونی چاہئیں تا کہ لوگ اس کے سامنے گردنِ اطاعت خم کر سکیں۔ قرآن نے ان امتیازی فضائل کی دو جامع نوعیں ذکر فرمائی ہیں کہ وہ وجاہت ظاہری اور وجاہت باطنی یا جسمانی قوت وصحت اور روحانی علم ومعرفت میں امتیازی شان رکھتا ہو۔

چنانچہ طالوت کے بارہ میں فرمایا گیا جب کہ اسے بنی اسرائیل کا بادشاہ بنایا گیا تھا وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ. ① گو آگے یہ بھی ارشاد ہے کہ وَاللّٰهُ یُؤْتِیْ مُلْكَهٗ مَنْ یَّشَآءُ (خدا جسے چاہے اپنا ملک سونپ دے) جس سے واضح ہے کہ نفسِ امارت وملوکیت مطلقاً کسی نہ کسی بادشاہ کے برسرِ اقتدار آجانے سے بھی معتبر ہو جاتی ہے، ہاں مطلوب امارت وہی ہے جس میں امیر اپنے منصوص اوصاف کے ساتھ تختِ امارت پر جلوہ گر ہو۔ جن کی مزید تفصیلات احادیث میں اور تشریحاتِ فقہ میں مذکور ہیں۔ جن کے بارہ میں مسلمانوں کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص جانتے بوجھتے ہوئے کسی غیر اصلح شخص کو امیر منتخب کرے گا تو وہ بلاشبہ اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم سے خیانت کا مرتکب ہوگا۔

بہر حال اصولی ضابطہ یہی ہے کہ کسی اصلح اور فائق فرد کو امام بنایا جائے خواہ نماز ہو یا غیر نماز، امامت صغریٰ ہو یا امامت کبریٰ۔ لیکن اس کے خلاف کوئی امیر متغلب ہو کر زبردستی قوت کے سہارے خلافت کی گدی سنبھال لے تو پھر اسے ہٹانا بھی جائز نہیں کہ اس میں فتنہ اور اجتماعیت کی تخریب ہے۔ اس کے بعد نماز نے یہ پہلو پیش کیا کہ نماز میں اس پیش امام کی اقتداء کرو اور سمع وطاعت سے پیش آؤ کہ اس کی اطاعت فرض ہے اور جو ذرا بھی اس کی اطاعت سے گریز کرے گا۔ اس کی نماز نہ ہوگی۔ گویا یہ عباداتی زندگی رائگاں ہو جائے گی۔ ہاں اس کی اطاعت سے انحراف ایسے وقت کیا جائے گا جب کہ وہ نماز ہی کو خراب کرنے کے فکر وعمل میں لگ جائے ظاہر ہے کہ اس اصول سے اجتماعی زندگی میں بھی انحراف نہیں کیا جا سکتا کہ امیر کی اطاعت واجب ہے کہ وہ طاعت حق ہے۔ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: وَمَنْ اَطَاعَ اَمِیْرِیْ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ وَمَنْ عَصٰی اَمِیْرِیْ فَقَدْ عَصَانِیْ ② جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

ہاں امیر کی اطاعت سے صرف اس وقت انحراف وگریز جائز بلکہ واجب ہے کہ وہ کفر صریح اور اسلام کی کھلی تخریب پر اتر آئے کہ لَا طَاعَةَ فِیْ مَعْصِیَةِ اللّٰهِ اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِی الْمَعْرُوْفِ ③ (خدا کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں) جس کی وجہ یہ ہے کہ نصب امام کی غرض وغایت شوکتِ دین اور اقامتِ حدود اللہ ہے،

---

① پارہ: ۲، سورۃ: البقرۃ، الآیۃ: ۲۴۷. ② الصحیح للبخاری، کتاب الاحکام، باب قول اللہ تعالیٰ: واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول ج: ٦ ص: ۲٦۱۱ رقم: ٦۷۱۸.

③ الصحیح لمسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب طاعۃ الامراء ج: ۹ ص: ۳۷۱ رقم: ۳۴۲۴.

جب وہی نہ رہے تو خود امام کی ذات مقصود نہیں ۔اس لیے ایسے مخرب دین امام کا عزل واجب ہو جائے گا۔ ورنہ بہر صورت سمع وطاعت واجب رہے گی۔ چنانچہ کثرت سے احادیث وآثار سمع وطاعت کے حق میں آئے ہیں۔

نیز کثرت سے احادیث میں اس کی تاکید کی گئی ہے کہ فتنہ اور اختلاف ونزاع کے وقت امام کی جانب اختیار کرو، نظم کا ساتھ دو، غدر کے ساتھی مت ہو، اور مسلمانوں کے کسی قائم شدہ نظام کی تخریب مت کرو۔ ہاں کفری نظام بہر صورت بقدر استطاعت توڑ پھینکنے ہی کے لائق ہوتا ہے اور وہ عالم بشریت کے حق میں مرض ہے اور مرض ازالہ ہی کے لیے ہے نہ کہ پالنے کے لیے۔

بہر حال جماعت بغیر مرکزیت کے نہیں ہوسکتی اور مرکزیت بغیر انتخاب امیر اور نصب امام کے ناممکن ہے اور یہ سب اصول نماز نے قائم کر دیئے۔ اس کے بعد نماز نے ایک اور پہلو پیش کیا اور وہ یہ کہ نماز میں اسی مرکز جماعت امام کو مطاع تو اس درجہ میں مانا گیا کہ ایک ہی آواز پر جماعت کے لاکھوں افراد جھک جائیں جو وہ کرے سب وہی کرنے لگیں اور جو وہ کہے سب وہی کہیں۔

اِنَّمَا جُعِلَ الْاِمَامُ لِیُؤْتَمَّ بِہٖ فَاِذَا رَکَعَ فَارْکَعُوْا وَاِذَا سَجَدَ فَاسْجُدُوْا وَاِذَاقَالَ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ فَقُوْلُوْا آمِیْن ① ”امام اسی لیے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے وہ رکوع کرے تو تم رکوع کرو، وہ سجدہ میں جائے تو تم سجدہ میں چلے جاؤ، وہ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ کہے تو تم آمین کہو“۔

غرض! اس کے ایک اشارہ پر لاکھوں گردنیں خم ہو جائیں اور اس کی ایک حرکت بدن پر لاکھوں بدن حرکت میں آجائیں، کسی ایک مقتدی کی مجال نہیں کہ امام سے انحراف کر سکے۔ ورنہ نماز نہیں ہوسکتی، لیکن ساتھ ہی اس مطاعیت کے باوجود امام کو استبداد سے بھی اتنا ہی دور رکھا گیا ہے جتنا کہ اسے واجب الاطاعت بنایا گیا ہے۔ چنانچہ یہی مطیع جماعت اس کے اشاروں پر چل رہی تھی۔ اگر امام کی کوئی غلطی کسی رکن صلوٰۃ میں دیکھ پائے تو جماعت کے لیے ہرگز اجازت نہیں کہ اس غلطی پر صبر کر کے خاموش ہو رہے بلکہ اس کا فرض ہے کہ امام کو ٹوکے اور اس کی غلطی پر اسے متنبہ کرے مثلاً امام، قرآءت میں غلطی کر جائے تو مقتدی اسے لقمہ دیں اور اگر ارکان وافعال صلوٰۃ میں کوئی غلطی یا سہو کرے تو فوراً پیچھے سے سبحان اللہ وغیرہ پکار کر اسے متنبہ کریں۔

حتی کہ اگر عورتیں بھی مقتدی ہوں تو وہ بھی امام کی اصلاح سے نہ چوکیں مگر قول سے نہیں کہ عورت کی آواز بھی عورت ہے۔ بلکہ تالی بجا کر، اور امام کا فرض ہے کہ قوم کی اس تنبیہ پر اپنی غلطی کو مانے اور عملاً اس کا اعتراف کرتے ہوئے سجدۂ سہو میں جھک جائے۔ یہ عملی طور پر اپنی خطاء کا اعلان واعتراف بھی ہے اور تدارک بھی اس سے اصول یہ نکلا کہ امام کا استقلال تو اتنا ہونا چاہیے کہ اس کے اشاروں پر صفوں کی صفیں جھک جائیں مگر ساتھ ہی قوم کا وقار بھی

① الصحیح لمسلم، کتاب الصلوۃ، باب النھی عن مبادرۃ الامام بالتکبیر وغیرہ ج: ۱ ص: ۳۱۰ رقم: ۴۱۵.

اتنا ہی ہونا چاہیے کہ امام کی غلطی دیکھ کر اعتراض سے نہ چوکے کیوں کہ امامت و امارت خود قوم کی امانت ہے جو امیر کے پاس ہے، اس کی ذاتی ملک نہیں کہ اس میں کسی کو دم زدن کی مجال نہ ہو۔

نماز نے اسی اصول کو قائم کر کے ملت کو متنبہ کیا ہے کہ جماعت کبرائے اور ملت مسلمہ کا نظام بھی اسی اصول پر قائم کرو کہ امت کا امام و امیر مطاع تو اتنا ہو کہ اس کے اشاروں پر پوری امت نقل و حرکت کرے، کسی طرح جائز نہ ہو کہ سمع و طاعت کے دائرہ سے باہر نکلے۔

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: اِنْ اُمِّرَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ مُجَدَّعٌ یَقُوْدُکُمْ بِکِتَابِ اللّٰہِ فَاسْمَعُوْا لَہٗ وَاَطِیْعُوْا. ① ''اگر تم پر کسی ہاتھ پیر کٹے ہوئے ناکارہ غلام کو بھی امیر بنا دیا جائے تو سمع و طاعت سے کام لو اور اس کی اطاعت کرو''۔ کسی کو حق نہیں کہ اس امیر جماعت کی مرجعیت اور مرکزیت میں فرق ڈالے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: مَنْ اَتَاکُمْ وَاَمْرُکُمْ جَمِیْعٌ عَلٰی رَجُلٍ وَّاحِدٍ یُّرِیْدُ اَنْ یَّشُقَّ عَصَاکُمْ اَوْ یُفَرِّقَ جَمَاعَتَکُمْ فَاقْتُلُوْہُ . ② ''جب کہ تم ایک شخص واحد پر مجتمع ہو اگر کوئی شخص اس مرکزیت میں خلل انداز ہو اور تمہاری بندھی بندھائی لاٹھی کے دو ٹکڑے کرنا چاہے تو اسے قتل کر دو''۔

پس امیر کی حفاظت و طاعت تو یہ ہو مگر اسی کے ساتھ قوم کی عظمت و شان بھی ایسی ہو کہ امام میں استبداد کا کوئی شائبہ بھی نہ آنے پائے۔ اسے کوئی حق نہ ہو کہ وہ اپنی ہر من مانی بات منوا کر قوم کو جس راہ اس کا جی چاہے چلا سکے، کیوں کہ وہ بحیثیت ذات قوم کا مرکز نہیں بلکہ خلافت و نیابت قوم کا مرجع ہے اس لیے جس کا وہ خلیفہ اور نائب ہے، اسی کے قانون اور بتائے ہوئے راستہ پر وہ قوم کو چلانے کا ذمہ دار ہے۔ اس کا فرض ہے کہ قانون الٰہی کے ماتحت احکام جاری کرے اور حکم کا جو گوشہ اس پر مخفی رہ جائے اس میں قوم سے مشورہ کرے۔ اس لیے تجویز احکام میں امام کے لیے تو مشورہ لازمی ہے۔ وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ . اور قوم کے لیے امام پر تنقید اور اسی روک ٹوک یا نصیحت کا حق حاصل ہے تا کہ امام میں شائبہ استبداد باقی نہ رہے۔ جیسا کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے منبر پر فرمایا کہ ''اگر میں حکم دوں تو کیا تم اطاعت کرو گے؟ سب نے کہا، کریں گے، فرمایا کہ ''اگر کتاب اللہ کے خلاف حکم کروں؟ کہا گیا کہ اگر ایسا ہوا تو ہم تکلے کی طرح اس تلوار سے تمہارے بل نکال دیں گے۔ بہر حال اسلام نے امیر کو مرتبۂ عظیمہ بھی دیا ہے کہ وہ نائب حق ہے مگر جب کہ وہ مقام معصومیت پر پہنچا ہوا نہیں ہے تو اس کا ہر کہا ہوا علی الاطلاق واجب الاطاعت بھی نہیں ہے۔ جبکہ قانون الٰہی کے معیار پر پورا اترا ہوا نہ ہو۔

غرض امامت میں جمہوریت تو یہ کہ قوم کو حق رائے دہندگی حاصل ہے اور ساتھ ہی شخصیت یہ کہ صاحب عزم صرف امام ہی ہوگا جس کی اطاعت لازم ہوگی۔

① الصحیح لمسلم، کتاب الحج، باب استحباب رمی جمرة العقبة ج: ۲ص: ۹۴۴ رقم: ۱۲۹۸.

② الصحیح لمسلم، کتاب الامارة، باب حکم من فرق امر المسلمین وھو مجتمع ج: ۳ص: ۱۴۸۰ رقم: ۱۸۵۲.

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ. ①"اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ لوگوں سے مشورہ فرمائیں اور جب عزم فرمالیں تو پھر اللہ پر بھروسہ کریں"۔

پس امام کو مفروض الاطاعت بھی رکھا ہے جبکہ وہ راہ راست پر چلے اور اس کی تقویم واصلاح بھی جماعت پر واجب کی ہے۔ جب کہ وہ بے راہی پر آ جائے کہ اس کے بغیر جماعت کا نظام حق وصداقت پر قائم نہیں رہ سکتا ۔غرض نماز نے نظام ملت کے اس اہم رکن کے لیے بھی ایک طبعی اور عقلی اصول پیش کیا ہے جو نظام کی روح ہے ۔ہاں اس کے بعد نماز نے ایک اور اصولی راستہ اختیار کیا اور وہ یہ کہ اگر قوم کے متنبہ کرنے پر امام صلوٰۃ اپنی غلطی کو تسلیم کرے اور تدارک کی طرف متوجہ ہو یعنی سجدۂ سہو کرے جس میں گویا علانیہ اپنی غلطی کا اعتراف ہے۔تو پھر قوم کا بھی یہ فریضہ ہے کہ اس غلطی تک میں امام کا ساتھ دے اور اس کے تدارک میں بھی اتباع کرے۔

گویا قوم بھی اپنے عمل سے اعلان کردے کہ باوجودیکہ امام کا یہ فعل غلط اور سہو سے سرزد ہوا مگر جب کہ وہ علانیہ اس غلطی کا معترف اور تدارک پر آمادہ ہے۔تو ہم سب اس کے اس مخلصانہ رجوع کے سبب اس کے ساتھی اور حامی ہیں، کیوں کہ اس نے جان بوجھ کر صلوٰۃ کی تخریب کرنا نہیں چاہی تھی، گویا قوم عمل سے اعلان کرتی ہے کہ ہم منشط ومکرہ میں اپنے امام کے ساتھی اور مطیع ہیں اور یہی نظم صلوٰۃ کی اساس ہے حتی کہ اگر امام سے کوئی مخفی غلطی ہو جائے جس پر قوم مطلع بھی نہ ہو اور وہ سجدۂ سہو کرلے، تو اس میں بھی قوم کو ساتھ دینا واجب ہے اور اس غلطی اور تدارک میں اپنے کو بھی شریک امام بنانا ناگزیر ہے تاکہ نظم صلوٰۃ میں انتشار اور دوعملی واقع نہ ہو۔

نماز نے بتلایا کہ یہی صورت امامت کبریٰ میں بھی ہونی چاہیے کہ اگر کسی خطاء اجتہادی پر قوم، امیر کو متنبہ کرے تو امیر کا فرض ہے کہ اس غلطی کے تدارک کی فکر کر کے اپنی غلطی کی اصلاح کرے اور جب ایسا کرلے تو قوم اسے تنہا نہ چھوڑے، بلکہ اس کا ساتھ دے اور اطاعت میں فرق نہ آنے دے، خواہ یہ غلطی مخفی طور پر ہوئی ہو یا علانیہ ،جس پر قوم نے متنبہ کیا ہو کہ نظام ملت اس معتدل راستہ کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔اگر قوم مطلقاً امیر کی مطیع بن جائے خواہ وہ برا کرے یا بھلا تو یہ بھی نظام ملت کی تباہی ہے اور اگر ذرا ذرا سی جزئیات پر امیر کی اطاعت چھوڑنے پر آمادہ رہے تو یہ بھی تخریب نظم اور ملت کی بربادی ہے۔معتدل راستہ یہی ہو سکتا ہے کہ امیر کی اطاعت منشط ومکرہ میں واجب اور اس کی اغلاط پر صحیح مشورہ بھی واجب۔تاکہ نہ؟ لامرکزیت پیدا ہو، نہ استبداد کا ظہور ہو۔

شرائط امام یا مناصب امام کے سلسلہ میں نماز نے ایک اور زرین اصول یہ رکھا کہ وہ مقتدیوں میں ممتاز ہے۔ مگر منصب امامت پر پہنچ کر اس کے لیے یہ امتیاز کافی ہے کہ امام ہے۔رہی امتیازات، ظاہری شوکتیں اور نمائشی اقتدارات کی اسے حاجت نہیں، مثلاً امام کو کسی بلند جگہ پر کھڑا کرنا کہ سب میں اونچا نظر آئے مکروہ کہا گیا حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے مدائن میں امامت کی اور کسی اونچی جگہ پر کھڑے ہوئے جس سے مقتدی سب نیچے تھے، تو

① پارہ:۴،سورۃ :آل عمران، الآیۃ:۱۵۹.

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور عمار رضی اللہ عنہ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر نیچے اتار لائے۔ جب جماعت ہوچکی تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ جب آدمی کسی قوم کی امامت کرے تو قوم سے اونچا نہ کھڑا ہو، عمار رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ پھر اسی بناء پر تو میں نے کوئی چون و چرا نہیں کی اور تمہارے اشارہ پر نیچے اتر آیا۔ نماز کے اس جماعتی مسئلہ نے بتلایا کہ امامت کبریٰ کے امیر کو بھی امارت کی عزت کافی ہے۔ ظاہری کروفر، حشم وخدم اور عجم کے رسمی تکلفات اسلامی امیر کا شیوہ نہیں۔ اس کی امارت جب تک کہ صدیق وفاروق رضی اللہ عنہما کی امارت کی سی سادگی اور بے تکلفی اور حقیقی عظمت لئے ہوئے نہ ہو وہ اسلامی نقطۂ نظر سے خلافت نہیں ہے۔ ملوکیت ہے جو اسلام میں مطلوب نہیں۔

غرض جماعتی زندگی کے تمام اہم مقامات امیر کی سادگی، امیر کی امتیازی شان، امیر کی حق پسندی، امیر کی امتیازی فضیلت، جماعت کی اطاعت، مطیع جماعت کی حریت ونصیحت کیشی۔ امیر کا اعتراف حق اور جماعت کا منشط ومکرہ میں ساتھ دینا، نماز کے مختلف پہلوؤں سے ثابت ہوجاتے ہیں اور صرف نماز ہی کو سامنے رکھنے سے ملت کا پورا اجتماعی نظام تشکیل پاسکتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ نماز نے اپنے اجتماعی نظام میں فرق مراتب کا سسٹم بھی قائم کیا ہے تاکہ مساوات عامہ کے ساتھ مراتب کے فروق بھی نظر انداز نہ ہوں کہ اس کے بغیر عدل کی عمارت کھڑی نہیں ہوسکتی تھی۔

نماز نے جماعت میں مثلاً مرد وعورت کا فطری درجہ اور مرتبہ قائم رکھا، مردوں میں بالغ ونابالغ کے مراتب کے فروق ملحوظ رکھے۔ بالغوں میں تقدم وتاخر کا فرق قائم کیا۔ تقدم صفوف میں یمین ویسار کے درجات قائم کئے۔ یمین میں قریب وبعید کا تفاوت پیش نظر رکھا۔

قریب میں امام کے محاذی اور غیر محاذی کی تفریق سامنے رکھی ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: لِيَلِيَنِي مِنْكُمْ أُولُو الْأَحْلَامِ وَالنُّهٰى ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ① ''(چاہیے کہ (جماعت صلوٰۃ میں) عقلاء اور بالغ مجھ سے قریب رہیں یعنی صف اولیٰ میں رہیں، پھر جوان سے قریب ہوں، اور پھر جوان سے قریب ہوں''۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: عَنْ اَبِيْ مَالِكِ ۣالْاَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ اَلَا اُحَدِّثُكُمْ بِصَلٰوةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ؟قَالَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَصَفَّ الرِّجَالُ وَصَفَّ بِهِمُ الْغِلْمَانُ ثُمَّ صَلّٰى بِهِمْ ثُمَّ قَالَ هٰكَذَا صَلٰوةُ اُمَّتِيْ ۔② ''ابومالک الاشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز تمہارے سامنے بیان نہ کروں؟ فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز قائم فرمائی، تو مردوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے اولین صف بندی کی اور لڑکوں نے ان بالغوں کے پیچھے صف بنائی، پھر

① الصحيح لمسلم، كتاب الصلوٰة، باب تسوية الصفوف واقامتها ج: ۱ ص: ۳۲۳ رقم: ۴۳۲.

② السنن لابی داؤد، كتاب الصلوٰة، باب مقام الصبيان من الصف ج: ۲ ص: ۳۲۱.

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو نماز پڑھائی اور فرمایا اسی طرح ہے نماز میری امت کی"۔

اس روایت سے واضح ہے کہ اولین صفوف بالغ مردوں کی ہونی چاہئیں اس کے بعد لڑکوں اور نابالغ بچوں کی۔

دوسری ترتیب کے بارے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: صَلَّى النَّبِيُّ ﷺ فِي بَيْتِ أُمِّ سُلَيْمٍ فَقُمْتُ وَيَتِيْمٌ خَلْفَهُ وَأُمُّ سُلَيْمٍ خَلْفَنَا. ① "ام سلیم کے گھر میں، میں نے اور ایک یتیم لڑکے نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے (صف بنا کر) نماز پڑھی اور ام سلیم ہمارے پیچھے کھڑی ہوئی تھیں"۔

اس سے واضح ہوا کہ عورتوں کا مقام لڑکوں سے بھی پیچھے ہے، کیوں کہ لڑکوں کی نوعیت بہر حال مردوں کی ہے، بلحاظ عقل وفہم کے جو عورتوں کی نوعیت سے اکمل ہے گو فی الحال وہ حد بلوغ پر نہیں ہے۔

یمین ویسار کے فرق کے بارہ میں ارشاد ہے کہ دائیں جانب کے مقتدی عنایات خاصہ کے مورد ہوتے ہیں۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰئِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلٰى مَيَامِنِ الصُّفُوْفِ. ② "اللہ اور اس کے فرشتے صفوں کے دائیں جانب پر رحمت بھیجتے ہیں"۔

پھر میامن اور دائیں جانب کے مقتدیوں کے بارہ میں فرمایا کہ جو امام ہے وہ رحمت سے زیادہ قریب ہے، پھر ان مقربین کے بارہ میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ: وہ رحمت اولاً امام کے سر پر آتی ہے، اس سے پھر صف اولیٰ میں اس شخص کی طرف چلتی ہے جو ٹھیک امام کی سیدھ میں ہے اور اس سے پھر دائیں جانب جو قریب ہے اول اس کی طرف۔ پھر اسی طرح ترتیب وار درجہ بدرجہ صف اولیٰ کے دائیں جانب آخر تک چلتی جاتی ہے۔ اور اس کے بعد پھر اسی صف اولیٰ کی بائیں جانب کے مقتدیوں کی طرف اسی ترتیب سے لوٹتی ہے۔

بہر حال نماز نے بتلایا کہ قرب و بعد کے معیار سے مقتدیوں کے مراتب میں تفاوت ہے، اور اس قرب و بعد کا معیاری نقطہ امام ہے کہ قرب و بعد کا اعتبار امام سے کیا جاوے گا جو اس سے قریب ہوگا وہ قریب سمجھا جائے گا اور جو اس سے بعید ہوگا بعید شمار ہوگا۔ پس اس سے یہ اصول واضح ہوا کہ جماعت کے قلوب تھامنے کے لیے من اللہ اس اجتماع صلوٰۃ میں بھی جو مساوات کا انتہائی مظاہرہ ہے۔ فرق مراتب معتبر مانا گیا ہے۔ ورنہ مختلف المراتب اشخاص کبھی جماعتی لائن میں کھڑے نہیں رہ سکتے تھے۔ اور ان میں باہم کبھی اعتماد واطمینان اور بشاشت کی لہر نہ دوڑ سکتی۔

ادھر فرق مراتب سے ممکن تھا کہ اعلیٰ مراتب پانے والے اشخاص کے قلوب میں غرور نفس سے ادنیٰ مراتب کے افراد کی تحقیر سما جاتی تو اس فرق مراتب کو ساتھ ہی ساتھ کلمۂ صلوٰۃ نے مظاہرۂ عامہ مساوات ہی کا قائم کر لیا ہے اور ان متفاوت المراتب اشخاص کو حکم یہی دیا ہے کہ سب کے سب رہیں، ایک ہی صف میں ایڑی ٹخنہ ایک سیدھ میں کر کے اور مونڈھے سے مونڈھا ملا کر کھڑے ہوں۔ اگر صف میں ذرا آگے پیچھے ہوئے تو انہیں دھمکی دی گئی ہے

① الصحيح للبخاری، كتاب الاذان، باب صلاة النساء خلف الرجال ج: ٣ ص: ٣٨١ رقم: ٦٢٤.

② السنن لابی داؤد، كتاب الصلوة، باب من يستحب ان يلی الامام، ج: ٢ ص: ٣١٩.

کہ تمہارے دلوں میں بھی اللہ ایسا ہی اختلاف ڈال دے گا، جیسا یہ ظاہر میں تم نے پس وپیش ہو کر گوارہ کرلیا۔

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: لَتُسَوُّنَّ صُفُوْفَكُمْ اَوْ لَيُخَالِفَنَّ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ. ① ''یا تو تم اپنی صفیں سیدھی کرلو اور یا پھر اللہ تمہارے دلوں میں اختلاف ڈال دے گا''۔ چنانچہ ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو باہم مختلف اور لڑتا جھگڑتا دیکھ کر تسویۂ صفوف کی نصیحت کرنے کے بعد فرمایا کہ: فَاَنْتُمُ الْيَوْمَ اَشَدُّ اخْتِلَافًا. ② ''تم آج کے دن سب سے زیادہ اختلاف کے شکار ہو'' (کیوں کہ صفیں برابر کرنے کا اہتمام نہیں کرتے۔) کہیں تاکید فرمائی گئی کہ: حَاذُوْا بِالْاَعْنَاقِ : کہ دونوں کو ایک سیدھ میں رکھو ③ کہیں فرمایا: حَاذُوْا بَيْنَ مَنَاكِبِكُمْ. ④ ''مونڈھوں کو ایک سیدھ میں رکھو''۔ پھر مونڈھے درست کرنے کے لیے جو شخص بھی بڑھے یعنی صفوں کی سیدھ کی خاطر یا ان کے ملانے کی خاطر اس کے بارہ میں نرمی برتنے یعنی اطاعت کا حکم دیا۔ لِيْنُوْا فِيْ اَيْدِيْ اِخْوَانِكُمْ. ⑤ ''اپنے بھائیوں کے ہاتھوں کے بارہ میں نرمی اور نرم خوئی اختیار کرو''۔ اس میں اطاعت کرنے والے کے لیے فرمایا: خِيَارُكُمْ اَلْيَنُكُمْ مَنَاكِبَ فِي الصَّلٰوةِ. ⑥ ''تم میں بہترین وہ ہے جو صف بندی صلوٰۃ میں مونڈھوں کے بارے میں نرم ہو یعنی کہتے ہی مونڈھے سے مونڈھا ملالے اور صف سیدھی کرلے''۔ پھر ایک لائن کے لوگوں کو ہدایت ہوئی کہ ایک صف میں قریب قریب اور مل کر کھڑے ہوں کہ تمہارے قلوب میں بے گانگی اور چھوت نہ پیدا ہو۔ لہٰذا تقطیع صفوف مت کرو۔ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: مَنْ وَّصَلَ صَفًّا وَصَلَهُ اللّٰهُ وَمَنْ قَطَعَ صَفًّا قَطَعَهُ اللّٰهُ. ⑦ آگاہ ہو کہ جس نے صف ملائی یعنی صف میں مل کر کھڑا ہوا، اسے اللہ اپنے سے ملالے گا اور جس نے صف کاٹ دی یعنی مل کر کھڑا نہ ہوا تو خدا بھی اسے اپنے سے قطع کردے گا۔

کہیں فرمایا کہ اتمامِ صف بھی کرو۔ یہ نہ ہو کہ پہلی صف مکمل ہوئے بغیر ہی دوسری بنالی جائے کہ اس عمل سے کہیں پیچھے رہنے کی خو نہ پڑ جائے کہ پھر جو خود پیچھے ہوا تو اللہ بھی اسے پیچھے کردیتا ہے۔

نیز صفوں کا ادھورا چھوڑنا، بدنظمی اور بدہیئتی بھی ہے۔

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: اَتِمُّوا الصَّفَّ الْمُقَدَّمَ ثُمَّ الَّذِيْ يَلِيْهِ فَمَا كَانَ مِنْ نَّقْصٍ فَلْيَكُنْ

① الصحيح لمسلم، كتاب الصلوة، باب تسوية الصفوف واقامتها ج: ۱ ص: ۳۲۳ رقم: ۴۳۶.

② الصحيح لمسلم، كتاب الصلوة، باب تسوية الصفوف واقامتها ج: ۱ ص: ۳۲۳ رقم: ۴۳۲.

③ السنن لابی داؤد، كتاب الصلوة، باب تسوية الصفوف، ج: ۲ ص: ۳۱۰. ④ مسند احمد، حديث ابی امامة الباهلی الصدی، ج: ۴۵ ص: ۲۲۸. حدیث صحیح ہے دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۱ ص: ۲۸۶. ⑤ مسند احمد، حديث ابی امامة الباهلی الصدی، ج: ۴۵ ص: ۲۲۸. حدیث صحیح ہے دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۱ ص: ۲۸۶.

⑥ السنن لابی داؤد، كتاب الصلوة، باب تسوية الصفوف ج: ۲ ص: ۳۱۴.

⑦ السنن للنسائی، كتاب الامامة، باب من وصل صفا ج: ۳ ص: ۳۱۸.

فِی الصَّفِّ الْمُؤَخَّرِ. ① ''صف اولیٰ مکمل کرو، پھر اس سے پچھلی صف، جو بھی کمی رہے وہ سب سے پچھلی صف میں رہنی چاہیے''۔ پھر باہمی میل اور شدتِ تواصل کے لیے تراص کا حکم دیا کہ آپس میں گتھ کر کھڑے ہوں، بیچ میں فاصلہ ذرا سا بھی نہ ہو۔ أَقِيْمُوْا صُفُوْفَكُمْ وَتَرَاصُّوْا. ② صفوں میں گتھ کر اور خوب مل کر کھڑے ہو۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: سُدُّوا الْخَلَلَ. ③ درمیانی فاصلہ کو بھرو۔

بہر حال ایک طرف اگر یہ منشاء تھا کہ فرقِ مراتب قائم رہے اور قریب وبعید کا فرق جیسے حسی ہے ویسے ہی بلحاظ ثمرات واجر بھی رہے تاکہ مقربین کی امنگ قائم رہے اور متاخرین کا تکاسل ٹوٹے اور نہ ٹوٹے تو پھر ندامت قائم رہے۔ تو دوسری طرف یہ بھی منشاء ہے کہ ان متفاوت المراتب افراد جماعت کی مساوات باہمی اور قانونی یکسانی میں بھی کوئی فرق نہ آنے پائے تاکہ متقدمین مغرور نہ ہوں، اور متاخرین دل شکستہ نہ ہوں، نماز نے اپنی جماعت میں جو یہ اصول اعتدال قائم کیا جس میں فرقِ مراتب بھی ہے اور آئینی یکسانی بھی۔ تو ظاہر ہے کہ اس اصول کے بغیر ملت کا جماعتی نظام بھی قائم نہیں ہو سکتا۔ اس لیے نماز ہی سے ملت کی شیرازہ بندی اور وحدت بندی اور وحدتِ عمل پر بھی اصولی روشنی پڑی۔ کیوں کہ جب اجتماع عبادت اس اصول کے بغیر ناممکن تھا تو اجتماع ملت یا تمدنی اور اجتماعی زندگی اس اصول کے بغیر کیسے قائم ہوتی؟

ضروری تھا کہ ایک طرف امیر المسلمین لوگوں کے مراتب میں فرق قائم رکھے تاکہ وہ بکھرنے نہ پائے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے مختلف مراتب ومناقب پر روشنی ڈالی اور ان کے واقعی اوصاف کمال کو جو فیضانِ نبوت سے ان میں قائم ہوئے، خوب خوب سراہا اور درجاتِ مراتب کا تفاوت واضح فرمایا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے رتبہ اور اپنے ساتھ قربِ خاص کے بارہ میں ارشاد فرمایا: عُرِجَ بِیْ إِلَی السَّمَاءِ فَمَارَأَيْتُ شَيْئًا إِلَّا وَجَدْتُّ اسْمِيْ مَكْتُوْبًا مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَأَبُوْبَكْرِ ِ الصِّدِّيْقُ خَلِيْفَتِيْ. ④ ''مجھے آسمانوں کی معراج کرائی گئی تو میں نے کوئی چیز ایسی نہ دیکھی جس پر نہ لکھا ہوا کہ محمد اللہ کے رسول ہیں اور ابوبکر صدیقؓ ان کے خلیفہ ہیں''۔ شیخین کے بارہ میں فرمایا: أَبُوْبَكْرٍ وَّعُمَرُ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ السَّمْعِ وَالْبَصَرِ. ⑤ ''ابوبکر وعمر میرے لیے آنکھ اور کان جیسے ہیں''۔ کہیں فرمایا: اِقْتَدُوْا بِالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِيْ أَبِيْ بَكْرٍ وَّعُمَرَ. ⑥ ''میرے بعد ابوبکر وعمر رضی اللہ عنھم کی اقتداء کرو''۔ پھر خلفاء اربعہ کے مراتب کے بارہ میں ارشاد

---

① السنن لابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ باب تسویۃ الصفوف ج: ۲ ص: ۳۱۳. ② السنن الکبریٰ للبیھقی، کتاب الامامۃ والجماعہ ج: ۱ ص: ۲۸۸ رقم: ۸۸۹. ③ مسند احمد، مسند عبداللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ج: ۱۲ ص: ۳. ④ کنز العمال، ج: ۱۱ ص: ۵۴۹ رقم: ۳۲۵۸۰ (الحسن بن عرفۃ فی جزئہ، عدو ابو نعیم فی فضائل الصحابہ عن ابی ھریرۃؓ) ⑤ المعجم الاوسط للطبرانی، من اسمہ: قیس ج: ۱۱ ص: ۲۳۳. علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں: وفیہ حماد بن عمر النصیبی وھو متروک دیکھئے: مجمع الزوائد ج: ۹ ص: ۱۵۶.

⑥ السنن للترمذی، کتاب المناقب، باب فی مناقب ابی بکر وعمرؓ ج: ۱۲ ص: ۱۲۱ رقم: ۳۵۹۵.

فرمایا: یَاعَلِیُّ! اِنَّ اللّٰہَ اَمَرَنِیْ اَنْ اَتَّخِذَ اَبَابَکْرٍ وَّزِیْرًا وَّعُمَرَ مُشِیْرًا وَّعُثْمَانَ سَنَدًا وَّاِیَّاکَ ظَهِیْرًا اَنْتُمْ اَرْبَعَةٌ ، فَقَدْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَکُمْ فِیْ اُمِّ الْکِتَابِ لَا یُحِبُّکُمْ اِلَّا مُؤْمِنٌ وَّلَا یُبْغِضُکُمْ اِلَّا فَاجِرٌ اَنْتُمْ خَلَائِفُ نُبُوَّتِیْ وَ عَقْدُ ذِمَّتِیْ وَحُجَّتِیْ عَلٰی اُمَّتِیْ . ①

”اے علیؓ! اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں ابوبکرؓ کو وزیر اور عمرؓ کو مشیر اور عثمانؓ کو سند و حجۃ اور تجھے مددگار بناؤں، تم چار ہو تمہارے بارہ میں اللہ نے میثاق وعہد دیا ہے لوح محفوظ میں کہ تم سے صرف مؤمن ہی محبت کر سکے گا اور تم سے بغض رکھنے والا فاجر ہوگا، تم چاروں میری نبوت کے خلف رشید ہو اور میری ذمہ داریوں کی مضبوطی ہو اور میری حجۃ ہو، میری امت پر“۔ (الحدیث ابن السمان فی الموافقة (من روایة الریاض)

غرض خلیفۂ اول کا مرتبہ پھر شیخین رضی اللہ عنہ کا رتبہ پھر خلفاء کا درجہ ترتیب وار ارشاد فرمایا۔ پھر ان حضرات کے علاوہ بقیہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا فرق مراتب بھی کھولا، فقہاءِ صحابہؓ کا امتیاز واضح فرمایا۔ اصحاب بدر کی تفصیل بیان فرمائی۔ اصحاب حدیبیہ کے مقامات پر روشنی ڈالی، شہداء احد کی فضیلت ظاہر فرمائی مہاجرین اول کا رتبہ کھولا۔ پھر عامۂ صحابہ تک کے باہمی مراتب وفضائل بیان فرمائے، مثلاً فرمایا: اَنَا سَابِقُ الْعَرَبِ وَصُهَیْبٌ سَابِقُ الرُّوْمِ وَسَلْمَانُ سَابِقُ الْفُرْسِ وَبِلَالٌ سَابِقُ الْحَبَشِ ۔② ”میں عرب میں اول ہوں، صہیب روم والوں میں، سلمان، فارسیوں میں اور بلال حبش میں سب سے مقدم ہیں دین میں“۔

غرض ہر صاحب منقبت کے مناقب کھول دیئے، جس سے ایک نے دوسرے کو پہچانا۔ ہر ایک کے کمالات سے دوسرا متنبہ ہوا۔ اور ان کے باہمی مراتب کا فرق نمایاں ہوگیا، لیکن ساتھ ہی ان کی منصبی مساوات قائم رکھنے کے لیے یہ بھی فرمایا کہ: اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّهِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِهْتَدَیْتُمْ ، ③ ”میرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین ستاروں کی مانند ہیں، جس کی بھی اقتداء کرلو گے ہدایت پا جاؤ گے“۔

جس سے ان کے ہادی مہدی ہونے کی شان مساوات کے ساتھ ظاہر ہوئی۔ اسی طرح ان کے منصبی اور آئینی حقوق میں بھی کوئی تفاوت نہ تھا۔ مجلس نشینی میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ معاشرتی اجتماعات میں کسی قسم کی تمیز اور تفریق نہ تھی۔

غرض ایک طرف حضرت امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ماً مؤمنین اور قوم میں فرق مراتب کو بھی کھول کھول کر نمایاں کر دیا اور دوسری طرف ان میں مساوات اور یکسانی کی روح بھی بدرجۂ اتم پھونک دی۔

---

① کنز العمال، ج:۱۳ ص:۲۳۴ رقم:۳۶۷۰۳. (الزوزنی، خط وابو نعیم فی معجم شیوخه وفی فضائل الصحابة والدیلمی، کروابن النجار من طرق کلها ضعیفة)

② المعجم الکبیر للطبرانی ج:۷ ص:۱۸ رقم:۷۱۳۵. حدیث صحیح ہے دیکھئے: مجمع الزوائد، باب فضل صہیبؓ وغیرہ ج:۹ ص:۳۰۵. ③ تخریج گذر چکی ہے۔

پس مساوات وتفاضل کا جو اصول امامت صغریٰ میں تھا وہی بعینہٖ امامت کبریٰ میں رہا۔اور نماز نے جماعتی زندگی کے اس اہم پہلو کو بھی واشگاف کر دیا۔

اسی کے ساتھ نماز نے ہمیں یہ بھی بتلایا کہ امام نماز کا سب سے پہلا مقصد یہ ہے کہ وہ تمام مقتدیوں کو خدا کے سامنے لے جا کر ڈال دے اور جھکا دے اور انہیں رجوع الی اللہ ،انابت اور تضرع وزاری کے مقام پر لا کھڑا کرے۔ دوسرا یہ ہے کہ کلمات ربانی باآواز بلند سب کو سنا دے اور اعلائے کلمۃ اللہ سے سب کے کان کھٹکھٹائے ۔قرأت قرآن یعنی ارشادات الٰہی اوران کی معنوی ہدایت مقتدیوں کے کانوں تک پہنچا دے۔

اس سے نماز نے رہنمائی کی کہ امامت کبریٰ اور نظم ملت میں بھی امیر کا وظیفہ یہ نہ ہونا چاہیے کہ وہ قوم کو تفوق اور تعیش کے مرض میں مبتلا کرے یا امارت کو اپنے لیے ذریعہ جاہ وباہ بنالے۔ بلکہ اس کا اولین اور آخری فریضہ اعلاء کلمۃ اللہ اور خدا کے نام کی عالم میں منادی کرنی ہے، نیز اس کے بندوں کو اس کی بارگاہ تک پہنچانے کے لیے انہیں نصیحت کرنا ،انہیں معروف اور نیکیوں کا آرڈر دینا اور بدی سے باز رکھنا ہے۔تا کہ دنیا میں خدا کا نام اور اس کا قانون عام رائج ہو اور ساری دنیا اس کے زیر سایہ زندگی بسر کر کے امن ورفاہ کی فضائے عام پیدا کر سکے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ ①

غرض نماز نے جماعتی زندگی امامت وامارت ،امام کی شان وصفت رعیت کے فرائض ،امام کا نصب العین اور جماعتی زندگی کے دوسرے لوازم پر ایسی اصولی روشنی ڈالی ہے کہ اگر امیر قوم صرف نماز ہی کو سامنے رکھ کر امارت شرعیہ کے اصول وضع کرنا چاہے تو وضع کر سکتا ہے۔

پھر جماعتی شیرازہ بندی کو توڑنے اور فاسد کر دینے والے محرکات بھی نماز میں موجود ہیں۔سب سے پہلے جو چیز جماعتی نظام کو تباہ کرتی ہے وہ افراد جماعت کا کبر نفس ہے کہ متکبر انسان دوسرے سے کبھی مربوط نہیں ہوسکتا۔ یہ کام صرف متواضع انسان ہی کا ہے کہ وہ اپنے سے فائق انسان کے سامنے حق پسندی کے ساتھ جھک جائے اور بغاوت وسرکشی سے کنارہ کش رہے۔سو نماز سے زیادہ کبر توڑنے والی چیز اور کیا ہوسکتی ہے ،جس کا موضوع ہی تواضع لِلّٰہ ہے جیسا کہ واضح ہو چکا ہے۔

دوسری چیز ہوائے نفس ہے کہ بسا اوقات انسان اپنی اغراض اور خواہشات کی بناء پر جماعتی مفاد کو نظر انداز کر دیتا ہے۔گو اس میں کبر نفس نہ ہو،سو ہوائے نفس کو نماز کی عبادت سے زیادہ فنا کرنے والی چیز اور دوسری کیا ہوسکتی ہے کہ وہاں سرے سے نفس ہی کو شکست دی جاتی ہے۔

تیسری چیز سوءِ ظن ہے کہ بلا تبیّن اندھیرے میں رہ کر آدمی کسی کی نسبت کوئی بری رائے قائم کرے اور پھر اس

---

① پارہ:۱۷، سورۃ: الحج، الآیۃ: ۴۱.

سے متارکت کر بیٹھے جس سے جماعتی نظام برباد ہو جائے سو نماز میں اس کا علاج بھی موجود ہے۔ جب کہ وہ نمازی کو بے لوث اور بے غرض بنا کر اس کے قلب میں ایسی نورانیت پیدا کر دیتی ہے کہ آدمی خیر و شر میں خود ہی امتیاز پیدا کر لیتا ہے اس کے دل میں بے اصول اور مضر چیز کوئی جگہ اور وقعت نہیں پاتی کہ وہ مبتلائے سوءِ ظن ہوا اور ہوتا ہے تو بغیر تحقیق و تفتیش اسے کسی کی نسبت بری رائے قائم کرنا خلاف عدل محسوس ہونے لگتا ہے۔ بہر حال نماز کی تنویر اور روشنی سے جہاں ساری کائنات کے حقائق کھلنے لگیں وہاں ظنی گنجلکوں کا وجود کیا رہ سکتا ہے؟

چوتھی چیز درجاتی امتیازات، نسلی تفریقیں اور جماعتی تعصبات ہیں جو نظام کو درہم برہم کرتے ہیں تو نماز کی مساوات اور صفوں کی یکسانی اس تہلکہ کو بھی مٹا ڈالتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسباب تفریق و اختلاف کو بھی اگر دیکھا جائے تو نماز میں اصولی طور پر ان کا علاج بھی موجود ہے۔ یعنی اس میں جہاں اجتماعیت کا ثبوت ہے وہاں مہلکات اجتماعیت کا مداوا بھی تنقیح کے ساتھ موجود ہے۔ اس لیے نماز اجتماعیت اور نظم ملت کے مالۂ و ماعلیہ کے لیے بھی جامع نکلی۔ جس سے نمایاں ہوا کہ ایک نمازی انسان جس درجہ نظام ملت کی بقاء و استحکام کا ذریعہ بن سکتا ہے بے نمازی آدمی نہیں بن سکتا، کیوں کہ نماز تمام مخربات نظم کا ایک مکمل علاج ہے۔ اس لیے با نماز انسان میں تخریب نظم کے جراثیم کبھی بھی قوت سے نہیں ابھر سکتے۔ غرض نماز نے اصول تقویت نظام پر فکری روشنی بھی ڈالی اور عملاً بھی وہ نظام ملت کے لیے ایک آہنی دیوار ثابت ہوئی۔

ہاں پھر نظام ملت کے لیے جہاں اصول کی ضرورت ہے وہاں طاقت کی بھی ضرورت ہے۔ دنیا میں کوئی نظام بغیر طاقت کے نہیں چل سکتا۔ اصول کتنے ہی معقول ہوں لیکن طبائع کی ظلمت انہیں بلا مادی شوکت و طاقت کے قبول نہیں کرتی۔ شریر النفس انسان ہر دور میں موجود رہے ہیں جنہوں نے اصول حق اور عمل صالح کو اپنی اغراض پر بھینٹ چڑھانے کی سعی کی ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے افراد کا مقابلہ محض اخلاق سے نہیں ہو سکتا کہ وہ اخلاقی انسان ہی نہیں ہوتے بلکہ طاقت سے ہوتا ہے۔ اگر آپ غور کریں تو اس نماز جیسی عبادت خالصہ نے مقابلہ اور مقابلہ کے اصول جنگ اور جنگی تدبیر سکھلانے میں کوئی کمی نہیں کی بلکہ شاید نماز کو جس قدر مناسبت جہاد سے ہے اتنی کسی اور عبادت سے نہیں ہے۔ چنانچہ ایک حقانی اور راست باز انسان کے دو ہی قسم کے دشمن ہیں جو اسے راہ حق سے ہٹاتے ہیں۔ ایک ظاہری دشمن جیسے کفار و فجار اور ایک باطنی اعداء جیسے شیاطین یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ انسان کی حق و صداقت کے دشمن شیاطین، مگر شیاطین دو قسم کے ہیں ایک بصورت انسان جو نوع انسان میں سے ہوں اور ایک جنات جو نوع شیطانی میں سے ہوں۔

قرآن نے شیاطین ہی کی دو نوعیں مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ کہہ کر قائم فرما دی ہیں۔ یعنی شیاطین الانس اور شیاطین الجن۔ شیاطین کی یہ دو نوعیں ایک منٹ کے لیے بھی کبھی گوارا نہیں کر سکتیں کہ دنیا میں اللہ کا کوئی مطیع بندہ اس کی اطاعت و فرمانبرداری میں کامیاب ہو شیاطین جن چونکہ مخفی دشمن ہیں اور انسانی نفس میں اپنی جیسی سرکشی اور

ظلمت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اسے ذکر اللہ اور یادِ حق سے طرح طرح سے ہٹاتے ہیں۔ اور پھر خصوصیت کے ساتھ نماز جیسی قربِ افزاء عبادت میں تو ان کی انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ اس رابطہ کو قطع کر دیں جو اللہ اور بندہ کے درمیان نماز سے قائم ہوتا ہے۔ حتی کہ نماز اور متعلقات نماز کے لیے شیاطین کا ایک مستقل لشکر کمربستہ ہو کر آتا ہے جو وضوء کے وقت سے انسان کے گھات میں لگتا ہے۔ وضوء میں وسوسے ڈالنے والے شیطان کا نام ہے وَلَهَان اور نماز کو خراب کرنے والے شیطان کا نام خِنْزَب ہے۔ خدا ہی کو معلوم ہے کہ کتنے ولھان اور کتنے خنزب پرے باندھ کر نمازی انسانوں پر حملہ آور ہوتے ہوں گے۔ کہ ان کو قربِ الٰہی کے ملک سے باہر نکال دیں۔ اس لیے نمازی کو بھی پوری تیاریوں کے ساتھ صفوفِ صلوٰۃ میں کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ اس جنگ میں ان دشمنانِ جنی سے ہزیمت نہ اٹھائیں۔

چنانچہ بعض اوقات حسی طور پر بھی یہ خفی دشمن آجاتے ہیں اور آنکھوں سے نظر آنے لگتے ہیں۔ اور اللہ اپنے مخصوص بندوں کو قدرت دیتا ہے کہ وہ انہیں پکڑ کر سزا دے سکیں۔ چنانچہ حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: اِنَّ عِفْرِيْتًا مِّنَ الْجِنِّ تَفَلَّتَ الْبَارِحَةَ لِيَقْطَعَ عَلٰى صَلٰوتِيْ فَاَمْكَنَنِي اللّٰهُ مِنْهُ فَاَخَذْتُهٗ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَرْبِطَهٗ عَلٰى سَارِيَةٍ مِّنْ سَوَارِي الْمَسْجِدِ حَتّٰى تَنْظُرُوْا اِلَيْهِ كُلُّكُمْ فَذَكَرْتُ دَعْوَةَ اَخِيْ سُلَيْمَانَ "رَبِّ هَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِيْ فَرَدَدْتُّهٗ خَاسِئًا① ''ایک شیطان جنات میں سے رات میرے سامنے آگیا کہ میری نماز کو قطع کر دے، اللہ نے مجھے اس پر قدرت دی اور میں نے اسے پکڑ لیا اور ارادہ کیا کہ مسجد کے ستونوں میں سے کسی ستون سے باندھ دوں تاکہ تم سب اپنی آنکھوں سے دیکھ سکو۔ مگر مجھے اپنے بھائی سلیمان علیہ السلام کی دعاء یاد آگئی کہ ''الٰہی! مجھے ایسی سلطنت دے جو میرے بعد کسی کو نہ ملے یعنی جنات تک پر قدرت حاصل ہو جائے۔ سو میں نے اسے نامراد بنا کر چھوڑ دیا''۔

جس سے صاف واضح ہے کہ نماز میں مقابلہ ان دشمنانِ خفی سے ہوتا ہے اور نماز فی الحقیقت ایک معنوی جہاد ہے جو خصوصیت سے شیاطین اور ان کی اندرونی فتنہ پردازیوں کو روکنے کے لیے رکھا گیا ہے۔ چنانچہ نماز کے کل معاملات میں رخنہ اندازی اگر ہے تو شیطانوں ہی کی طرف سے ہے۔ حتی کہ اوقاتِ نماز تک کے سلسلہ میں شیطان مقابلہ سے نہیں چوکتا۔ چنانچہ طلوع وغروب اور استواء کے اوقات نماز کے لیے اسی لیے ممنوع قرار دیئے گئے ہیں کہ ان میں شیطان کے اثرات کارفرما ہوتے ہیں۔ گویا یہ اوقات شیطان کے معنوی اثرات کی غیر محسوس چھاؤنیاں ہیں جن میں اس کے ناپاک اسلحہ شرک وکفر وغیرہ جمع رہتے ہیں۔ اس لیے شریعت نے نمازی کو جو شیاطین کے مقابلہ میں خدا کا سپاہی ہے حکم دیا کہ وہ دشمن کی چھاؤنی میں نہ گھسے کہ مغلوب ہو کر اسے واپس آنا پڑے، اس لیے ان اوقاتِ ثلثہ میں گھس کر نماز پڑھنا ممنوع ہوا۔

① الصحيح للبخاری، کتاب الصلوة، باب الاسير او الغريم يربط في المسجد ج:۲ ص:۲۵۹.

ہاں جب شیاطین خود آ کر نمازی کے اوقات میں خلل ڈالے تو اسے مقابلہ کے لیے تیار رہنا چاہیے بلکہ اس کی حملہ آوری سے پہلے ہی مدافعتی تدابیر اختیار کر لینی چاہئیں۔ چنانچہ نماز کے حقیقی اوقات شروع ہوتے ہی شیاطین ہجوم کر کے آنے شروع ہوتے ہیں تو اذان رکھی گئی جس کا آغاز تکبیر الٰہی سے ہوتا ہے۔ اور حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ اذان کے وقت شیطان آتا ہے کہ اعلانِ حق میں خلل اندازی کرے تو اذان کی تکبیر سے اس کے سر پر زد پڑتی ہے۔ اور بعض حدیث گوز کرتا ہوا بھاگتا ہے پھر نماز شروع ہونے پر عین صلوٰۃ میں صفوں میں آ کر گھستا ہے کہ اس باہمی ریل میل اور ملاپ میں فرق ڈالے۔ پھر نمازیوں کو کچھ سنگھا کر مدہوش کرنا چاہتا ہے کہ وہ ذکر اللہ سے غافل ہو جائیں پھر جماعت سے کوئی رہ جائے تو اس کی نماز کو خطرہ میں ڈالتا ہے۔ جیسے ریوڑ سے رہی ہوئی بکری بھیڑیا اچک کر لے جاتا ہے۔

پھر وسوسہ اندازی الگ کرتا ہے تا کہ نماز میں دل جمعی اور یکسوئی باقی نہ رہے۔ کبھی رکعتیں بھلا دیں۔ کبھی قرأت میں شک ڈال دیا۔ کبھی رکوع و سجود میں شبہ پیدا کر دیا۔ بہر حال نماز کے مبادی سے لے کر مقاصد تک اول سے لے کر آخر تک شیطان کی سعی ہوتی ہے کہ پورا مقابلہ کر کے آدمی کو اس راہ حق اور طریق وصال ربانی سے ڈگمگائے اس لیے بندوں کو بھی متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ بھی نماز میں اس ظالم کا پورا مقابلہ کریں۔ صف بندی کر کے اجتماعی صرب و ضرب کے لیے تیار ہو جائیں، اور مسلح ہو کر کمر بندی کر لیں، تا کہ اس دشمن انسانیت شیطان کی کمر ٹوٹ جائے۔ اور وہ اس جنگ میں شکست کھا کر ہزیمت پر مجبور ہو جائے۔

حدیث میں ارشاد ہے: اَلصَّلٰوۃُ تُسَوِّدُ وَجْهَ الشَّيْطَانِ وَالصَّدَقَةُ تُكَسِّرُ ظَهْرَهُ وَالتَّحَابُّ فِي اللّٰهِ وَالتَّوَدُّدُ فِي الْعَمَلِ يَقْطَعُ دَابِرَهُ فَإِذَا فَعَلْتُمْ ذٰلِكَ تَبَاعَدَ مِنْكُمْ كَمَطْلِعِ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا. ① ”نماز شیطان کو روسیاہ کر دیتی ہے اور صدقہ اس کی کمر توڑ دیتا ہے اور لوجہ اللہ باہمی محبت اور عمل میں باہمی رسائی اس کی جڑ کاٹ دیتی ہے پس جب تم یہ عمل کرو گے تو شیطان تم سے اتنا ہی دور ہو جائے گا جتنا کہ مشرق و مغرب میں بعد ہے“۔

نماز نے اس جنگ معنوی کے سلسلہ میں جن معنوی اسلحہ کی فراہمی کا حکم دیا ہے ان میں سب سے بڑا ہتھیار تعوذ ہے کہ اللہ کی پناہ میں آ جاؤ اور پہلے ہی اعوذ باللہ پڑھ لو جس کی وجہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص حسی دشمن ہو تو آدمی سامنے جا کر مقابلہ کرے کہ ہتھیار نہ ہو تو ہاتھ ہی سے لڑے، حملہ کی قدرت نہ ہو تو صرف بچاؤ ہی کر لے۔ دشمن بھی سامنے ہے اور اس کا حملہ بھی سامنے ہے۔ لیکن جب کہ دشمن گھات میں ہو پیچھے سے آئے اور اس طرح اچانک حملہ کر بیٹھے کہ ہم اسے دیکھ بھی نہ سکتے ہوں اور وہ ہمیں دیکھ رہا ہو۔

اِنَّهٗ يَرٰكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ② ”وہ (شیطان) اور اس کا قبیلہ تمہیں اس طرح دیکھتا ہے کہ تم اسے نہیں دیکھ سکتے“۔ تو بجز اس کے اور چارہ کار ہی کیا ہے کہ ایسی ذات کی پناہ لیں جو اسے بھی دیکھتی

① کنز العمال، ج:۷ ص: ۲۸۴ رقم: ۸۸۹۳، (فر عن ابن عباس) ② پارہ:۸، سورۃ: الاعراف، الآیۃ: ۲۷.

ہو اور ہمیں بھی دیکھ رہی ہو اور ساتھ ہی اس کے زبردست حملے اور ہمارے عجز ولاعلمی سے بھی خوب واقف ہو اور اوپر سے قدرت والی ایسی ہو کہ سارے جن وانس اور بحر و برمل کر بھی آجائیں تو اس کے ملک میں ذرہ برابر کمی نہ کر سکیں۔ بلکہ اسے پا بھی نہ سکیں۔ لَاتُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَيُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَاللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ① ''نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک رکھتا ہے اور وہ لطیف وخبیر ہے''۔ اسی لیے آغاز صلوٰۃ ہی میں جب کہ ثناء کے بعد قرأت کا آغاز ہوتا ہے جو قیام صلوٰۃ کا اصل مقصود ہے، پہلے اعوذ پڑھی جاتی ہے۔ گویا شیطان کے مقابلہ کے لیے تعوذ کا ہتھیار سنبھال لیا جاتا ہے نماز کے اس عام طرز عمل نے ہمیں بتلایا کہ دشمن کی اپنی چھاؤنی بھی ہوتی ہے۔ جیسے شیطان کے مخصوص اوقات، تو ان میں خود نہ گھسو کہ تمہیں اس کی اندرونی طاقت کا علم نہیں ہے۔ دشمن کی حملہ آوری سے پہلے ہی مدافعت کا بھی بندوبست رکھو۔ جیسے اذان کا اصول ہے دشمن تمہارے مورچوں میں شگاف بھی ڈالے گا۔ جیسے شیطان صفوں کے بیچ میں گھسنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو خوب گتھ کر صف بندی کرو۔ دشمن پروپیگنڈا کر کے تمہارے خیالات بھی تبدیل کرے گا جیسے شیطان وسوسہ اندازی کرتا ہے سو ذکر اللہ سے بیدار رہو۔ دشمن تم پر خواب آور گیس بھی پھینکے گا، جیسے شیطان صفوں کے درمیانی فاصلوں میں گھس کر غفلت آور شیشیاں سنگھاتا ہے۔ جس سے معنوی ہوش جاتے رہتے ہیں تو درمیانی خلل ہی مت چھوڑو کہ اسے آنے اور شیشی سنگھانے کی نوبت آئے چونکہ دشمن اور اس کی چالیں غیر مرئی ہیں تو ایک ایسی طاقت کے قلعہ سے قلعہ بند ہو جاؤ جو دشمن کی طاقت سے لامحدود فوقیت و برتری رکھتی ہو۔ جیسا کہ تعوذ سے پناہ خداوندی کے قلعہ میں آجانے کی تدبیر سے واضح ہے کیا اگر امارت عامہ کے ماتحت پوری ملت اسلامیہ کا نظام قائم کیا جائے اور معاندین حق کے مقابلہ پر جنگی طاقت فراہم کی جائے تو کیا ان اصول جنگ کے سوا کوئی چارۂ کار ہے جو نماز نے ہمیں تلقین کیے ہیں؟ اس لیے نماز جہاں ایک بزمی عبادت ہے، جس میں سکون ہی سکون ہے، وہیں ایک رزمی عبادت بھی نکلی جس میں ہجوم ہی ہجوم اور حرکت ہی حرکت ہے۔

پھر اس مجموعی تفصیل سے جو کلی اصول نکلتا ہے وہ یہ کہ جیسا شیطان ہو ویسے ہی اسلحہ بھی فراہم کیے جانے چاہئیں۔ اور ویسی ہی بچاؤ کی مناسب تدبیریں بھی اختیار کی جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس اصول سے جہاد میں بھی انحراف نہیں کیا جاسکتا۔ ضروری ہوگا کہ اسی ڈھنگ پر جہاد میں بھی پہلے ہی سے ہتھیار درست کر لیے جائیں اور وہ بھی دشمن کے طاقت کی مناسب حال۔

پس جہاد میں جبکہ دشمن حسی ہیں تو ہتھیار بھی حسی فراہم کیے جانے ناگزیر ہوں گے۔ اور پھر جس قسم کے ہتھیاروں سے یہ دشمنانِ انسی آراستہ ہوں گے اسی نوع کے ہتھیار ملت کو بھی فراہم کرنے پڑیں گے۔ جیسے نماز میں دشمن خفی تھا۔ تو ہتھیار بھی خفی اور معنوی ہی سنبھالے گئے۔

① پارہ: ۷۔ سورۃ: الانعام، الآیۃ: ۱۰۴۔

پھر اس سلسلہ میں مزید غور کرو تو معلوم ہوگا کہ نماز میں وسوسہ انداز شیطان کے لیے ابتداء ہی جنگ کی اجازت نہیں۔ بلکہ پہلا حکم یہ ہے کہ اسے طرح دو فلینتہ و لیتعوذ (شیطان وسوسہ ڈالے تو ادھر دھیان بھی مت کرو۔ صرف خدا سے پناہ مانگو) یعنی اس سے اعراض کرو۔ اور ایک طرف قلب کو کرلو۔ جب نہ مانے تو پھر تعوذ کے ساتھ اسے تھتکار دو۔ گویا ابتداءً عدم تشدد اور پھر تشدد اور کھلی جنگ ہے کیا جہاد میں بھی اس اصول کے سوا کوئی دوسرا طریق کار ہوسکتا ہے کہ اگر کفار تعدی پر آمادہ ہوں تو ابتداءً انہیں طرح دی جائے۔ امن قائم رکھنے کی سعی کی جائے لیکن جب وہ حملہ آوری کی ٹھان ہی لیں تو پھر جم کر ان کا مقابلہ کیا جائے، چنانچہ حدیث میں ارشاد ہے: لَاتَتَمَنَّوْا لِقَآءَ الْعَدُوِّ ...... فَاِذَا لَقِيْتُمُوْهُمْ فَاصْبِرُوْا. ① "دشمن سے بھڑنے کی تمنا مت کرو، لیکن اگر سامنے آجائے تو پھر جم جاؤ" (اور جم کر مقابلہ کرو) غرض نماز کے ایک ایک اصول نے جہاد کے جنگی اصول پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے اور عبادت کی صف میں بھی پورا نقشۂ جنگ ایک بہادر انسان کے پیش نظر رکھا ہے تا کہ وہ عین عبادت کی خلوتوں میں بھی جہاد کی ہنگامہ خیزیوں کو فراموش نہ کر سکے۔ پس نماز کا ہر ہر جزو گویا جہاد کا ایک ایک پہلو ہے۔

نماز کی جماعت میں اگر صف بندی ضروری ہے تو جہاد میں بھی لازمی ہے، پھر نماز کی صفوف میں جو امام سے متصل ہیں وہ مرتبہ میں اعلیٰ ہیں اور پچھلی صف والے ادنیٰ، ایسے ہی جہاد میں بھی صف اولیٰ افضل ہے صف آخری سے جو سب سے پہلے گولی اپنے سینے پر لیتی ہے اور امام سے قریب رہتی ہے، پھر نماز کی صفوں میں اگر یمین ویسار ہے تو صفوف جہاد میں بھی میمنہ اور میسرہ ہے نماز میں میمنہ اور میسرہ کے درمیان صف اولیٰ کا وہ مقتدی جو امام سے اقرب اور اس کا محاذی ہے، بمنزلہ قلب کے ہے تو جہاد میں بھی یمین ویسار کا درمیانی لشکر قلب ہے جو امام جہاد سے اقرب اور بمنزلہ اس کے پیش دست کے ہے۔ پھر نماز میں اگر گتھ کر کھڑے ہونے کا حکم ہے تا کہ صفوں میں کوئی رخنہ نہ رہے تو عسکری صفوف کے رخنہ بند کرنے کا بھی حکم ہے تا کہ دشمن درمیان میں گھس کر کسی مورچہ کو کمزور نہ کردے۔

پھر اگر نماز کی صفوں کے آداب ہیں کہ ادھر ادھر مت دیکھو صرف سجدہ گاہ پر نظر رہے آسمان کی طرف نگاہیں مت اٹھاؤ۔ جانوروں کی ہیئت مت اختیار کرو، چنانچہ تدبیح حمار (رکوع کے وقت گدھے کی طرح کمر میں کوب نکال دینا) بروک جمل (اونٹ کی طرح اگلے ہاتھ ٹیک کر بیٹھنا) اقعاء کلب (کتے کی طرح سرین زمین پر رکھ دینا) افتراش ثعلب سجدہ میں لومڑی کی طرح بازو اور پنچے زمین پر رکھ دینا، نقر دیک (ادائیگی ارکان میں جلد بازی کرتے ہوئے رکوع وسجود میں مرغے کی سی ٹھونگیں مارنا) تخصر شیطان (کوکھ پر ہاتھ رکھ کر شیطان کی طرح کھڑے ہونا)

غرض جیسے نماز کے لیے قواعد ہیں اور صفوف صلوٰۃ میں یکسانی اور تسویہ پیدا کیا جاتا ہے۔ تا کہ پوری جماعت ایک آہنی دیوار نظر آئے، ٹھیک اسی اصول پر جہاد کی صفوف کے بھی عسکری قواعد رکھے گئے ہیں کہ ہیئتوں کی یکسانی

① الصحيح للبخاري، كتاب الجهاد والسير، باب كان النبي ﷺ اذالم يقاتل اول النهار اخر القتال حتى تزول الشمس ج: ١٠ ص: ١٢٣ رقم: ٢٧٤٤.

ہو۔نقل وحرکت میں معیت اور تساوی (برابری) ہو،ادھر ادھر التفات نہ ہو۔مجاہدین کی صفیں ایک سیدھ میں رہیں، ساری فوج ایک دیوار نظر آئے ،سب کا فعل ایک ہو،ایک ساتھ سب کا ہاتھ اسلحہ پر پڑے، یکبارگی سب کا حملہ ہوتا کہ ترتیب میں فرق نہ آئے۔

غرض یہاں بھی قواعد اور پریڈ اسی طرح یکسانی قائم رکھنے کے لیے وضع کی گئی ہے تا کہ اس قوی دشمن جنی (شیطان) پر متحدہ زد پڑے اور اس کی ہزیمت سے خدا کا یہ لشکر کامیاب ہوکر اپنی مراد کو پہنچے۔

پھر جیسے نماز میں امام کی آواز پر رکوع وسجود کی طرف انتقالات ہوتے ہیں جو شیطان پر سب سے زیادہ بھاری اور شاق ہوتے ہیں اور وہ خائب ہوکر بھاگتا ہے۔ٹھیک اسی اصول پر جہاد میں بھی امام کے اشاروں پر فوجی نقل وحرکت اور اقدام رجوع رکھا گیا ہے جس سے دشمن کے چھکے چھوٹتے ہیں۔

پھر جیسے صلوٰۃ کا شعار نعرۂ تکبیر ہے کہ نماز کے سارے انتقالات اسی نعرہ سے ہوتے ہیں۔ایسے ہی جہاد میں بھی نعرۂ تکبیر ہی شعار بنایا گیا ہے جو عموماً اقدام وہجوم کے وقت لگایا جاتا ہے۔اور جس طرح نماز کی تکبیر سے شیاطین بھاگتے چلے جاتے ہیں۔حتی کہ اذان میں بھی جب اللہ اکبر کہا جاتا ہے تو بنص حدیث شیطان میلوں بھاگتا چلا جاتا ہے۔ ایسے ہی جہاد میں نعرۂ تکبیر سے کفار کے دل لرز جاتے ہیں اور وہ بھی چھوٹے ہوئے دل سے بھاگتے ہی نظر آتے ہیں۔ اگر سچے قلوب کی گہرائیوں سے یہ نعرہ سرزد ہو۔پھر جو آثار نماز کے اہتمام پر مرتب ہوتے ہیں وہی جہاد پر ہوتے ہیں مثلاً حدیث میں ہے کہ نمازیوں کی صف آرائی کے وقت حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے(کَمَا یَلِیْقُ بِشَأْنِهٖ) کہ دیکھو میرے بندے کس طرح اپنے عیش وآرام کو چھوڑ کر میرے گھر کی طرف دوڑ رہے ہیں اور میرے دشمن شیطان کو مار بھگانے کے لیے آمادہ ہیں۔ٹھیک اسی طرح بنص حدیث مجاہدین کی صف بندی کے وقت بھی حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے کہ دیکھو میرے بندے کس طرح سروں کو ہتھیلی پر لیے ہوئے میری راہ میں جان دینے کے لیے آرہے ہیں۔

پھر جیسے نماز کی جماعت اور شیاطین کی اجتماعی مدافعت گھروں میں نہیں رکھی گئی۔ بلکہ اس کے لیے مخصوص مکانات ہیں جنہیں مساجد کہا جاتا ہے اور انہی میں اس کی ادائیگی کی ضرورت اور افضلیت ہے۔ٹھیک اسی طرح جہاد بھی گھر کے کونوں میں نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے مخصوص میدان ہوتے ہیں جن میں یہ اجتماعی مقابلے عمل میں آتے ہیں، پھر جیسے نماز کے ختم پر اوراد واذکار اور تسبیح وتہلیل وغیرہ رکھی گئی ہے جو مثل ایک غنیمت باردہ کے ہیں کہ اصل نماز کا ثواب لینے کے بعد یہ زوائد ...فوائد اور فاضل برکات ہیں جنہیں لوٹنا اور ان میں حصہ قائم کرلینا نمازیوں کے لیے لھم الحسنی وزیادۃ کا مصداق ہوتا ہے۔اور گویا یہ روح صلوٰۃ کا تتمہ ہیں جنہیں کمالے جانا غنیمت ہے اور فضیلت ہے ٹھیک اسی طرح جہاد کی عبادت کا تتمہ احراز غنیمت (مال غنیمت لوٹنا ہے کہ اجر وثواب بھی اور مادی منفعت بھی ہے پھر جیسے نماز کا آغاز وانجام سب ہی ادعیۂ واذکار پر ہے بلکہ اس کی روح ہی ذکر اللہ ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صدہا انواع اذکار وادعیہ مروی ہیں جو نماز کے اول وآخر اور درمیان میں پڑھے

جاتے ہیں۔ایسے ہی جہاد کا آغاز وانجام بھی ذکر اللہ اور مختلف قسم کی دعاؤں پر رکھا گیا ہے۔

چنانچہ احادیث میں یہ اذکار مختلف مواقع جہاد کے لیے روایت کیے گئے ہیں، پھر جیسے نماز کے مقدمہ سے لے کر خاتمہ تک انتشار معاصی یعنی گناہوں کے بکھرنے کی صورتیں رکھی گئی ہیں کہ بندہ کے گناہ بھی معاف ہوں اور ساتھ ہی اس کے لیے نشاط خاطر کی صورت بھی پیدا ہوجائے جس سے وہ مسرور ہوکر بار باراس عبادت کوشوق کے ساتھ ادا کرے۔مثلاً وضو میں ایک ایک عضو دھونے سے اس کے کیے ہوئے گناہ جھڑتے ہیں۔نیز عین صلوٰۃ میں بنص حدیث نمازی جب رکوع میں جاتا ہے تو اس کے کندھوں پراس کے گناہوں کو لادتے ہیں۔اور جب وہ کھڑا ہوتا ہے یا سجدہ میں جاتا ہے تو وہ گناہ دونوں طرف سے خشک پتوں کی طرح گرنے اور بکھرنے شروع ہوجاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بندہ گناہوں سے پاک صاف ہوجاتا ہے ٹھیک اسی طرح جہاد کے بارہ میں فرمایا گیا کہ اَلسَّیْفُ مَحَّآءٌ لِلذُّنُوْبِ. (تلوار سارے گناہوں کوختم کردینے والی ہے۔)

جس سے ایک ایک گناہ جھڑ جاتا ہے اور خون کے ایک ایک قطرہ کے ساتھ آدمی کا نفس دھل کر صاف ستھرا اور چمک دار ہوجاتا ہے۔غرض نماز اور جہاد میں مناسبت ہی نہیں بلکہ مشابہتوں کا ایک غیر مختتم سلسلہ قائم ہے اور اس کا جزو جزو اس کے جزو جزو سے مطابقت کھاتا ہے۔پس اگر جہاد کے اصول معلوم کرنے ہوں اور دشمنوں کے مقابلہ میں جنگی اسپرٹ تیار کرنی ہو تو نماز ہی اس کی بھی اسکیم اپنے اندر رکھتی ہے،اوردن میں پانچ مرتبہ اس جنگی اسپرٹ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔اوراس کے آداب وقواعد سکھاتی ہے،شاید اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں جہاد کے متعلق ضروری ترتیبات نماز میں سوچ لیتا ہوں۔حالانکہ یہ صورت اگر اسی معنیٰ کرلی جائے کہ نماز میں انہیں بے فکری ہوتی ہوگی جس سے طبیعت میں یکسوئی آجاتی ہوگی اور کافی سوچ بچار کا موقع مل جاتا ہوگا تو بظاہر یہ برمحل نہ ہوگا۔کیوں کہ نماز از قسم افعال ہے،از قسم تروک نہیں ہے۔افعال میں تو خود انہی افعال کی طرف طبیعت متوجہ رہ سکتی ہے نہ کہ دوسرے افعال کی طرف۔اور اگر یہ کہا جائے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ افعال صلوٰۃ کی طرف سے توجہ ہٹا کر افعال جہاد کی طرف منعطف کرتے ہوں گے تو ظاہر ہے کہ عین صلوٰۃ میں افعال صلوٰۃ سے گریز کرکے افعال جہاد کو سوچنا حضرت عمر جیسی برگزیدہ شخصیت سے بعید ہے کیوں کہ منافی خشوع صلوٰۃ ہے ہاں ایسا سکون تروک میں تو ہوسکتا ہے کہ آدمی کی نیت کے ساتھ کچھ کاروبار ترک کرکے بیٹھ رہے اور فارغ شدہ طبیعت کو دوسرے افعال کی طرف لگادے۔مثلاً صوم تروک کا مجموعہ ہے فعل اگر ہے تو وہ صرف قلب کا ہے یعنی نیت،اور اس کا استحضار ہر آن ضروری نہیں ہے اس لیے سوچ بچار کی فراغت روزہ میں زیادہ ہوسکتی ہے نہ کہ صلوٰۃ میں۔نیز ایام صیام میں شیاطین بھی قید ہوتے ہیں کہ وسوسوں کا خطرہ ہو اور نفس کا دانہ پانی بھی بند ہوتا ہے کہ وہ تخیلات وافکار میں مبتلا کرے۔اس لیے اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ فرماتے کہ میں روزہ کی حالت میں جہاد کی تشکیلات سوچ لیتا ہوں تو ایک برمحل بات بھی تھی۔یہ نماز کی کیا خصوصیت ہے کہ اس میں جنگی تشکیلات کو ترتیب دیا جائے۔

جبکہ اس عبادت میں علاوہ افعال صلوٰۃ کے خود بہت سے شیاطین مستقلاً مصروف وسوسہ اندازی رہتے ہیں جس سے طبیعت کی یکسوئی اور دوسرے امور کی سوچ بچار کے لیے نماز کو کیوں خاص فرمایا گیا؟ سو بخیال احقر اس کی دل لگتی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ نماز خود ایک جنگی اسپرٹ اپنے اندر رکھتی ہے اس کے ہر ہر رکن کو جہاد سے مشابہت کامل ہے ۔ایک نماز گزار اگر حقیقت صلوٰۃ کو پیش نظر رکھ کر نماز ادا کرے تو وہ خود ہی تمام مراحل جہاد سے گزرے گا، گو وہ معنوی اور غیر حسی ہوں، مگر نوعیت تو جنگ ہی کی رکھتے ہیں کہ جہاد معنوی ہے سو اگر اس کی طبیعت اس جہاد معنوی سے جہاد حسی کی طرف منتقل ہو جائے اور وہ ان مختلف جہادی مقامات پر گزرتے وقت جہاد حسی کے ان ہی مقامات کی طرف توجہ کرے جن کی طرف قدرتاً بھی اس کی طبیعت متوجہ ہے اور پھر ان حسی جہادیات کی وہی ترتیب و تشکیل سوچنے لگے۔ جس کی نوعیت کی طرف بلا سوچے سمجھے بھی اس کی طبیعت چل رہی تو یہ نہ صرف غیر عجیب ہی نہیں بلکہ ہونا بھی یوں ہی چاہیے۔ کیوں کہ نماز کو اگر کسی چیز سے جزئی جزئی مطابقت ہے تو وہ صرف جہاد ہی سے ہے اس لیے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا خاص کر نماز میں جہاد کی تشکیلات سوچ لینا کسی بے فکری یا خشوع صلوٰۃ سے اعراض کی دلیل نہیں بلکہ عین صلوٰۃ میں توجہ کی دلیل ہے کہ صلوٰۃ اور جہاد اصولاً ایک دوسرے پر کلیۃً منطبق اور ایک دوسرے سے بالکلیہ متشابہ ہیں پس فاروق اعظم کا مقولہ درحقیقت نماز و جہاد کی ایک مستقل مشابہت کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو ہمارے عرض کردہ مضمون کی زبردست تائید بلکہ برہان ہے۔

بہر حال اس سے واضح ہوا کہ نماز کے افعال اور حقائق میں پورا نظام سیاست، امام اور امیر ملت کی صحیح پوزیشن شخصیت اور جمہوریت کی حدود، نصب امام، پھر امام کا مقام پھر قوم کا منصب، سمع و طاعت، امام کے ساتھ تعاون، قومی وحدت۔ اتفاق و اتحاد۔ پھر سیاست کا جنگی پروگرام۔ فوج کے جنگی پروگرام، فوج کے جنگی قواعد تشدد اور عدم تشدد، فوج کی صف بندی و یکسانی، پھر اس میں مرکزیت، جنگی مورچے اور ان کا استحکام، جنگ کے آداب، جنگ میں خالص اللہ کے لیے لڑنا، احراز غنیمت دشمن کے ساتھ مناسب حال معاملہ، خلاصہ یہ کہ تعمیری اور تخریبی پروگرام کی ساری ہی اصولی تفصیلات کھپی پڑی ہیں۔ پس اگر ایک شخص اپنی ذاتی اصلاح چاہتا ہے تو بھی اس کا درماں نماز ہی ہے۔ اور اگر ایک شخص نظام سیاست اور نظم مملکت قائم کرنا چاہتا ہے تب بھی اسے ساری راہنمایاں نماز میں غور کرنے سے حاصل ہو سکتی ہیں پس نماز ایک طرف تو اللہ سے ملاتی ہے۔ ایک طرف مخلوق سے بھڑاتی ہے ایک طرف انفرادیت اور تبتل سکھاتی ہے اور ایک طرف اجتماعیت تو صل پر لاتی ہے۔ ایک طرف سلم و سلامتی دکھاتی ہے اور ایک طرف حرب و ضرب پر آمادہ کرتی ہے۔ ایک طرف شخصی حالت درست کرتی اور ایک طرف جماعتی ڈسپلین اور نظام قائم کرتی ہے اس سے ثابت ہوا کہ نماز میں جہاں جمعیت ہے وہاں جامعیت ہے اور جہاں جامعیت ہے وہاں اس میں اجتماعیت بھی ہے۔ جمعیت سے شخصی نفوس قرار پکڑتے ہیں جامعیت سے جماعتی تشکیل ہوتی ہے اور اجتماعیت سے نظام و ڈسپلین قائم ہو کر جماعت باعزت و شوکت بن جاتی ہے۔

اب دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ عبادات اور عادات کا جو مفصل پروگرام سارے اسلام میں پھیلا ہوا ہے وہ سب کا سب تنہا ایک نماز میں سمٹا ہوا موجود ہے۔ پس اگر اسلام اسلام کبیر ہے تو نماز اسلام صغیر ہے، پس نماز خود بذات مکمل اسلام بھی ہے اور پورے اسلام کی میزان الکل بھی ہے کہ اسلام کی ساری عبادتیں اس میں جمع ہیں، اقوال کی ساری عبادتیں اس میں جمع ہیں اور اکوان کی ساری عبادتیں اس میں جمع ہیں اور افعال کی اس میں اور اقوال کی اس میں ہیئات کی عبادتیں اس میں ہیں اور اشارات کی اس میں ہیں۔ پھر انسان کی شخصی عادات کا مداوا اس میں ہے اور جماعتی خصائل وشمائل کی اصلاح اس میں۔ خلوت اس میں ہے اور جلوت اس میں تبتل اس میں ہے اور تواصل اس میں۔ صلح اس میں ہے اور جنگ اس میں۔ غرض انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو اصولاً نماز میں موجود نہ ہو۔ پس اگر اسلام محض اس لیے دنیا کا ایک جامع ترین مذہب ہے کہ اس میں ہر شعبۂ زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ اسلامی مذہب صرف اس لیے اکمل ترین مذہب ہے کہ اس میں جمعیت نفوس جامعیت اقوام اور اجتماعیت نظام کے سارے اسوے موجود ہیں۔ تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ نماز کو مستقل اسلام نہ کہا جائے اور کلیۃً اسے پورا دین کہہ کر نہ پکارا جائے کہ یہی سارے سارے شعبہ ہائے حیات اس میں عجیب وغریب کمال تشریع کے ساتھ جمع فرمادیئے گئے ہیں پس اسی کیفیت کے ساتھ نماز گویا ایک تخم ہے پورا اسلام اسی تخم میں سے نکلا ہوا ایک شجرۂ طیبہ ہے۔ جو چیز نماز میں لپٹی ہوئی تھی۔ وہی سب چیزیں اسلام میں تفصیلی جزئیات کے ساتھ پھیلی ہوئی ہیں۔ پس پورا دین بڑا اسلام ہے اور صرف نماز چھوٹا اسلام ہے یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرک ومسلم کے درمیان میں اگر کسی چیز کو فارق فرمایا ہے تو وہ نماز ہے: ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: اِنَّ بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلٰوةِ ① ''ہمارے اور مشرکوں کے درمیان فرق نماز ہے''۔ یہی وجہ ہے کہ کسی عبادت کے ترک کو آپ نے کفر سے تعبیر نہیں فرمایا، بجز نماز کے۔ ارشاد ہے: مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ . ② ''جو قصداً تارک صلوٰۃ ہوگیا، اس نے کفر کیا''۔ کیوں کہ نماز جب پورے اسلام کی میزان الکل ہے اور بلحاظ حقیقت خود اسلام ہے تو ظاہر ہے کہ اس ترک اسلام کو کفر کے سوا اور کیا لقب دیا جاسکتا تھا، اس لیے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ نماز کا گرادینا پورے دین ہی کو منہدم کردینا ہے۔ اَلصَّلٰوةُ عِمَادُ الدِّيْنِ مَنْ اَقَامَهَا فَقَدْ اَقَامَ الدِّيْنَ وَمَنْ هَدَمَهَا فَقَدْ هَدَمَ الدِّيْنَ . ③ ''نماز دین کا ستون ہے، جس نے اسے قائم رکھا اس نے دین قائم رکھا اور جس نے اسے منہدم کردیا اس نے دین کی عمارت منہدم کردی''۔

---

① الصحيح لمسلم، كتاب الايمان، باب اطلاق اسم الكفر على من ترك الصلوٰة ج: ١ ص: ٢٢٨.

② المعجم الاوسط للطبراني، من اسمه جعفر ج: ٧ ص: ٢٦٢. ③ شعب الايمان للبيهقي، الحادى والعشرون من شعب الايمان وهو باب في الصلوٰة. علامہ پٹنیؒ امام سخاویؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں: "الصلوٰة عماد الدين فمن تركها فقد هدم الدين" البيهقي، ضعیف دیکھئے: تذكرة الموضوعات ج: ١ ص: ٣٨.

جس کا راز وہی ہے کہ فی الحقیقت پورا اسلام اور جامع عبادات اسلام ہے اس سے یہ لطیف نکتہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ جب نماز جامع عبادات ہے تو گویا نماز کا ادا کرنا درحقیقت ساری عبادتوں کا اجمالاً ادا کرنا ہے، اور ساتھ ہی تفصیلی ادائیگی کے لیے مستعد ہوجانا ہے، اسی لیے حدیث میں ہے کہ روز قیامت سب سے پہلے نماز ہی کی پرسش ہوگی، اگر نمازیں پوری نکلیں تو فرمایا جائے گا کہ اب دوسری عبادتیں تفصیل سے دیکھنے کی ضرورت نہیں اور اگر نمازیں پوری نہ ہوں تو فرمایا کہ اس کی اور عبادتیں بھی پوری نہ ہونگی لہٰذا سب کی پڑتال اور چھان بین کی جائے۔

اس کا راز بھی وہی ہے کہ نماز میں ساری عبادتوں کے نمونے موجود تھے جب وہ ادھوری رہی تو ساری عبادتیں ادھوری رہیں۔ پس اور ساری عبادتیں نماز کے لحاظ سے جزوی نکلیں اور نماز سب طاعات کے لحاظ سے کلی نکلی کہ یہ سب عبادتیں اس کے دامن میں پڑی ہوئی ہیں۔ ان کا ادا کرنا گویا اس سب کا اجمالاً ادا کردینا ہے اور تفصیلی عمل کے لیے تیار ہوجانا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح ہوگیا کہ تارک نماز گویا ساری ہی عبادتوں کا تارک ہے اور سب سے بڑا ظالم ہے۔ جیسا کہ فاعل صلوٰۃ ساری ہی عبادتوں کا فاعل ہے کہ وہ سب عبادتیں اس میں بھی تھیں اور سب سے بڑا عادل ہے اور شاید اسی لیے نماز کو شغف سے ادا کرتے رہنے سے اور عبادتوں کی ادائیگی کی طرف خود بخود میلان اور رجحان ہوتا ہے کہ آدمی ان کے اجمال کو نماز ہی میں انجام دے لیتا ہے اور گویا ان کا مزہ چکھ لیتا ہے جس سے اسے تفصیلی ادائیگی کا شوق پیدا ہوجانا چاہیے۔ مزید غور کرو تو نماز پڑھنے کی ذاتی خاصیت بھی یہی ہوسکتی ہے کہ اور عبادتیں بھی سہولت سے ادا ہونے لگیں اور تمام حسنات کی توفیق ہو، گویا نماز علاوہ جامع عبادات ہونے کے مفتاح عبادات بھی ہے، اس کے کرنے سے اور طاعات کی ادائیگی کا راستہ ہموار ہوجاتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ کاموں کو مستمراً چلاتے رہنے کا راز انضباط اوقات میں مضمر ہے یعنی اوقات منضبط کرلینے سے تمام کام بروقت ہوتے رہتے ہیں اگر کسی کے کاموں کا کوئی وقت ہی مقرر نہیں جب جی میں آیا کرلیا، جہاں یاد آیا انجام دے لیا۔ نہ وقت مقرر، نہ جگہ معین۔ تو قدرتی بات ہے کہ کاموں میں ناغہ بکثرت ہوگا۔

اور ناغہ کی خاصیت ہے کہ بالآخر کام رہ جاتا ہے۔ اور جب ایک کام اپنے وقت سے ٹلا تو دوسرے کاموں پر بھی طبعاً اثر پڑتا ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسے شخص کے سارے ہی کاموں کا نظام درہم برہم ہوجاتا ہے اور جہاں یہ عملی زندگی منتشر ہوئی وہیں اس کا اثر یہ ہے کہ قلب کا سکون واطمینان جاتا رہتا ہے۔

پس جیسا کہ ضبط اوقات اور نظام عمل کی برکت ہے کہ ہر ایک کام اپنی اپنی جگہ بروقت گویا خود بخود انجام پاتے رہنے سے قلب کو تسکین اور بشاشت وطمانینت حاصل رہتی ہے۔ اب سمجھو کہ نماز کے بارہ میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے: اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ۔ (1) ''نماز مومنوں پر ایک باوقت فریضہ ہے''۔

نماز وقت کی عبادت ہے جس کے لیے زمانہ بھی متعین ہے اور مکان بھی یعنی مسجد، جب ایک شخص کے مہم کے

(1) پارہ: ۵، سورۃ: النساء، الآیۃ: ۱۰۳۔

اوقات جو درحقیقت دن رات میں صرف اوقات نماز ہی ہیں، جیسا کہ واضح ہو چکا ہے، نماز میں مصروف ہو گئے تو علاوہ اس کے کہ اسے پابندیٔ اوقات کی عادت پڑے گی، قدرتی طور پر نمازوں کے درمیان کے اوقات کے کام بھی خود بخود متعین اور منضبط ہو جاویں گے اور ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ یہ درمیانی کام نیکیوں ہی کے متعین ہوں گے بدیوں کے نہیں، کیوں کہ دو نمازیں نمازی کے قلب کو اس درمیانی فاصلہ کے لیے اتنا منور اور متاثر کر دیتی ہیں کہ اس کی اندرونی رہنمائی عموماً نیک ہی کام کی طرف ہو سکتی ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ توقیت نماز سے عین نمازوں ہی کے اوقات نہیں بلکہ نمازوں کے درمیانی اوقات میں بھی انضباط پیدا ہو جانا ضروری ہے اور یہ کہ یہ اوقات نیکیوں ہی سے بھرپور رہیں گے جس سے واضح ہوا کہ نماز مفتاح طاعات ہے کہ باعث انضباط اوقات ہے۔

پس جبکہ نماز گویا دوسری طاعات کو مستلزم ہے تو اگر اس لحاظ سے بھی قیامت کے دن نمازوں کو مکمل دیکھ کر حکم لگایا جائے کہ اس کی اور عبادتیں درست اور پوری ہیں۔ تو اس میں کیا غیر موزونیت ہو سکتی ہے؟ کیوں کہ نماز نے ان سب طاعات کو ضبط اوقات اور تنظیم عمل کی وجہ سے سہل الوصول اور بے تکلف معمول بنایا ہوا ہوگا جس سے وہ یقیناً پوری ہی ادا شدہ نکلیں گی۔ بہر حال اس سے واضح ہوا کہ نمازی آدمی درحقیقت تمام اعمال دین اور تمام اوصاف ایمان کا جامع اور تمام امور دنیا کی طرف سے مطمئن ہوتا ہے اور تارک نماز ان سب خوبیوں سے محروم ہوتا ہے۔ اس کے تمام اوصاف، کمال اعمال، اسلام بلکہ اس کے تمام دنیوی امور بھی پراگندہ رہتے ہیں جس سے اس کے قلب میں نہ سکون ہوتا ہے نہ سلامتی، طمانیت، نہ بشاشت اور نہ نورانیت بلکہ وہ ایک مریض قلب ہوتا ہے جس کا علاج ہو تو درست بنے ورنہ ابدی موت مر جاتا ہے۔ والعیاذ باللہ۔

غرض تعلق مع اللہ کے جتنے شعبے ہیں نماز میں ان سب کی تکمیل ہو جاتی ہے اور عبادت کی تمام انواع اس مختصر اور سہل عبادت کے اندر لپٹ کر خود بخود ادا ہو جاتی ہیں اس لیے نماز کو تعلق مع اللہ کے سلسلہ میں عبادت کا فرد کامل کہنا چاہیے گویا عبادت صرف نماز ہی ہے اور بالذات عبادت ہے۔

پس اس معنی کر بھی عبودیت کا حصر نماز ہی میں نکلا کہ نماز کے سوا اور دوسری عبادتیں محض اضافی عبادتیں ہیں جنہیں امتثال امر نے عبادت بنا دیا ہے ورنہ بذات خود عبادت نہیں اور اس معنی کر بھی عبادت کا انحصار نماز ہی میں نکلتا ہے کہ اس کی ادائیگی سے اور عبادتوں کی تقویم بھی ہوتی ہے اور ساری عبادتیں اسی ایک عبادت کے ذیل میں آ جاتی ہیں، گویا یہ اصل ہے اور سب دوسری اس کی فرع ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ فروع کے وجود اور ثبوت کا دار و مدار اصل پر ہوتا ہے اس لیے اصلی وجود اصل ہی کا ہوتا ہے نہ کہ فروع کا فروع گویا اصل کے سامنے معدوم اور بے وجود ہوتی ہیں اسی لیے بھی عبودیت کا انحصار نماز ہی میں نکلا۔ پس تنہا ایک نماز ہی اس لیے عبادت ہے کہ اور عبادتوں میں عبادت کے معنی ہی نہیں پائے جاتے، صرف اس میں پائے جاتے ہیں اور اس لیے بھی وہی تنہا عبادت ہے کہ

اگر کسی عبادت میں کچھ بھی عبودیت کی شان پائی جاتی ہے تو وہ نماز کی بدولت ہے۔

غرض جو معنی ہوں بہر صورت تعلق مع اللہ کے سلسلہ میں فردِ کامل اور جوہر فرد نماز ہی ثابت ہوتی ہے جس سے معارفِ الٰہیہ کھل کر ذات وصفات کے کمالات نہ صرف عیاں ہوتے ہیں بلکہ بندے میں جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔

ادھر تعلق مع الخلق کے سلسلہ میں نماز ہی سے نظامِ ملک وملت درست ہوتا ہے، تمدن کی روح آجاتی ہے یعنی میل ملاپ، تعاون وتناصر اور توارد باہمی پیدا ہو جاتا ہے۔ ادھر تعلق مع النفس کے سلسلہ میں بھی نماز ہی سے نفسانی اخلاق ومقامات درست ہو جاتے ہیں آدمی بہیمہ (جانور) اور شیطان نہیں رہتا بلکہ آدمی بن جاتا ہے۔ پس آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ جیسا کہ انسان عالم صغیر تھا کہ اس میں عالم کبیر کے تمام نمونے اور نقشے مجتمع تھے۔ اسی طرح نماز اسلام صغیر ہے جس میں اسلام کبیر کے تمام نمونے اور نقشے جمع ہیں، اگر انسان تکوینیات میں جامع الحقائق تھا تو نماز تشریعیات میں جامع الحقائق ہے۔ اس لیے جامع کا رشتہ جامع ہی سے ہونا چاہیے تھا تو انسان کو منتخب کیا گیا کامل نماز کے لیے اور مسلم انسان کو منتخب کیا گیا، اسلامی نماز کے لیے جو جامع الصلوٰۃ ہے کہ مسلم انسان ہی معرفت میں سب اقوام سے اکمل تھا اور اگلوں پچھلوں کے تمام معارف اسلام کی بدولت اس پر منکشف تھے کہ یہ آخری قوم تھی اور اسلامی نماز تمام اقوام کی نمازوں کو جامع تھی کہ آخری نماز تھی۔

پس مسلم انسان کا اسلامی نماز کے لیے انتخاب کیا جانا امر طبعی تھا تا کہ اس کی ہر ہر تشریعی حقیقت سے نورانیت اور جلا پیدا ہو۔ اور انسانیت کا ہر ہر گوشہ نماز کے ہر ہر گوشہ سے منور ہو جائے، تو پھر جس طرح یہ انسان نماز کی جامعیت کی وجہ سے تشریع کی ہر ہر عبادت کا ادا کنندہ ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح اپنی ذاتی جامعیت کے ہر ہر نورانی پہلو کے سبب تکوین کی ہر ہر حقیقت کے علم کا جامع اور اس سے آشنا ثابت ہوگا۔ یعنی تکوینیات کی تمام حقائق نماز کی وجہ سے اس میں چمک اٹھیں گی، اور جمادات نباتات، حیوانات، سب ہی کی حقیقتیں اس پر پوری طرح کھل جائیں گی تو اس کی باخبری اور علم ومعرفت کے اس وفور سے اس کی فوقیت بھی ان پر ثابت ہوگی اور نمایاں برتری کے سبب اس کی حکومت بھی ان پر قائم ہوگی جس سے خلافت الٰہیہ کا وہ مقصد پورا ہو جائے گا جس کے لیے انسان کی تخلیق عمل میں آئی تھی، اسی لیے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ، نے تمام محروسہ ہائے اسلامی میں ضابطہ کا فرمان نافذ فرمایا تھا: اِنَّ اَهَمَّ اُمُوْرِ دِيْنِكُمْ عِنْدِى الصَّلٰوةُ فَمَنْ ضَيَّعَهَا فَهُوَ لِمَا سِوَاهَا اَضْيَعُ. ''تمہارے دینی امور میں میرے نزدیک سب سے اہم نماز ہے جس نے اسے ضائع کر دیا وہ دوسری طاعات کو اس سے زیادہ ضائع کرے گا''۔ گویا ضیاعِ صلوٰۃ کو ضیاعِ دین سمجھا، جس سے نماز کی غیر معمولی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تمام عبادات تو اسلام میں اس طرح نازل ہوئیں کہ کسی کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر الہام فرمایا گیا۔ کسی عبادت کو وحیٔ ملک کے ذریعہ نازل کر دیا گیا، کسی عبادت کو خواب کے ذریعہ منکشف کیا گیا.... کسی کو دوسروں کے فعل اور حضور تقریری سکوت سے شروع کیا گیا۔ لیکن نماز کی فرضیت کے لیے ان سب سے نرالا اور جدا اور ایک ممتاز طریقہ اختیار فرمایا

گیا اور وہ یہ کہ نماز کی فرضیت کے لیے خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے اپنے پاس بلا بھیجا۔ شب معراج میں عرش عظیم پر مدعو فرمایا۔ اور پھر انتہائی قرب سے مقرب بنا کر یہ نماز کا ہدیہ عطا فرمایا۔ اور عبادتیں تو خود اوپر سے نیچے اتریں اور اس عبادت کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نیچے سے اوپر اٹھایا گیا۔

اور عبادتوں کی وحی زمین پر ہوئی اور نماز کی وحی آسمانوں سے بھی اوپر ہوئی اور عبادتیں تو بواسطۂ ملائکہ مشروع ہوئیں اور نماز بلا واسطہ خود معبود حقیقی نے بطور شرعی تحفہ عنایت فرمائی۔ اس سے نماز کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے کہ حق تعالیٰ کو اس عبادت کا کس قدر اہتمام ہے جس کا راز وہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ جامع طاعات خود ایک مستقل مذہب اور پورا مجمل اسلام ہے، اس لیے حدیث میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ: اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ. ''نماز مؤمن کی معراج ہے''۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ محض کوئی تشبیہ و تمثیل نہیں بلکہ ایک واقعی حقیقت ہے کہ نمازی کو نماز میں معراج ہوتی ہے خواہ اسے ابھی فوری احساس ہو جائے اگر وہ کاملین میں سے ہے یا بعد مرگ احساس ہو اگر ناقص ہے۔ مگر معراج بہر حال ہر ایک نمازی کو نصیب ہوتی ہے جیسا کہ واضح ہو چکا ہے، ساتھ ہی بایں معنی بھی معراج ہونا واضح ہے کہ معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو برکات اور روحانی سربلندیاں عطا ہوئی ہیں ان کا خلاصہ تین چیزیں ہیں۔ ایک مشاہدۂ حق جیسا کہ قرآن نے کہا: مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ① (قلب نے جو کچھ دیکھا وہ اس میں جھوٹا نہیں تھا) دوسرے قرب انتہائی۔ قرب کا ارشاد ہے: ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ○ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى . ② تیسرے مکالمۂ حق۔ چنانچہ التحیات میں اسی مکالمہ کی حکایت کی جاتی ہے جو تشہد میں ابدالدھر تک دہرایا جائے گا۔

اگر باخبری سے کام تو سرور کائنات علیہ افضل التحیات والتسلیمات کی جوتیوں کے طفیل میں ہر نمازی مسلمان کو یہ تینوں مقامات دن میں پانچ مرتبہ نماز میں عطا ہوتے ہیں۔ اول مشاہدہ، تو حدیث میں ارشاد ہے کہ بحالت قیام بندہ کی نظر اللہ کے چہرہ پر ہوتی ہے جیسا بھی چہرہ اس کی شان کے مناسب ہے۔

دوم قرب کی انتہاء ہو جاتی ہے کہ بنص حدیث اللہ کے قدموں پر بندہ کا سر پڑا ہوتا ہے۔ جیسے بھی قدم اس کی شان کے مناسب ہیں۔

سوم کلام، تو وہ ہر رکعت میں میسر ہوتا ہے کیوں کہ ہر رکعت میں فاتحہ لازم ہے اور فاتحہ کے بارے میں حدیث میں صریح ارشاد ہے۔ کہ اس کے ایک ہر جملہ کا جواب اللہ کی طرف سے ہاتھ در ہاتھ دیا جاتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ وہ فوراً فرماتے ہیں حَمِدَنِیْ عَبْدِیْ بندہ کہتا ہے اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ فوراً فرماتے ہیں اَثْنٰی عَلَیَّ عَبْدِیْ ، بندہ کہتا ہے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تو وہ فوراً فرماتے مَجَّدَنِیْ عَبْدِیْ بندہ کہتا ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ تو وہ فوراً فرماتے ہیں هٰذَا بَيْنِیْ وَبَيْنَ عَبْدِیْ بندہ کہتا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (الی آخر السورۃ) تو فرماتے ہیں هٰذَا لِعَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَا سَاَلَ . نیز یوں بھی نماز میں قرآن کی تلاوت فرض ہے۔ اور

① پارہ ۲۷، سورۃ: النجم، الآیۃ ۱۱ ② پارہ ۲۷ سورۃ النجم الآیۃ: ۸، ۹

تلاوت قرآن بنص حدیث اللہ سے ہمکلام ہونا ہے۔

پس جبکہ نماز میں بھی قرب انتہائی ہے، مشاہدہ بھی حقیقی ہے اور کلام بھی منہ در منہ اور یہی تین چیزیں معراج کی روحیں تھیں تو پھر نماز کو مؤمن کی معراج فرمانا محض تشبیہ واستعارہ کیسے کہا جا سکتا ہے؟ جب کہ معراج کی سب حقیقتیں واقعیت کے ساتھ نماز میں موجود ہیں جس کو اہل مشاہدہ تو دنیا ہی میں محسوس کر لیتے ہیں اور اہل مراقبہ معرفت کے درجہ میں پہچان لیتے ہیں اور اہل مجاہدہ ایمان رکھتے ہیں جن کے مشاہدہ کا وقت مجاہدۂ موت کے بعد آتا ہے۔

اس وقت انہیں محسوس ہوتا ہے کہ حقیقتاً ہم نے دنیا میں بسلسلۂ نماز اللہ سے کلام بھی کیا تھا جس کا حظ ہم میں اب راسخ نظر آ رہا ہے۔ اس کا قرب بھی ہمیں انتہائی ہوا تھا۔ جس کی ٹھنڈک ہم اب محسوس کر رہے ہیں۔ اور اس کا مشاہدہ بھی ہم کرتے تھے جس کا انس اس وقت ہم میں رچا ہوا ہے اور اب ہم اس معرفت بلکہ استحضار پر ہیں کہ اگر حق تعالیٰ کی تجلیات ہمارے سامنے آ جائیں تو ہم فوراً پہچان لیں گے کہ یہ وہی تجلی ہے جو روزانہ ہماری روحوں پر کھلا کرتی تھی اور ہم اس سے وابستہ ہوتے تھے۔ چنانچہ حدیث حشر سے واضح ہے کہ حق تعالیٰ مسلمانوں کے سامنے ایک خاص صورت سے متجلی ہوں گے اور فرمائیں گے انا الرحمٰن (میں رحمٰن ہوں) تو یہ سب کہہ دیں گے کہ (نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْکَ) ہم اللہ کے ساتھ تجھ سے پناہ مانگتے ہیں) پھر (یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ) کے وعدہ کے مطابق پنڈلی والی تجلی منکشف ہوگی تو سب سجدہ میں گر پڑیں گے اور اس کے رحمٰن ہونے کا اعتراف کریں گے اس سے واضح ہے کہ کوئی نہ کوئی جلوہ حق ان کا متعارف اور پہچانا ہوا ہوگا۔ جب ہی تو ایک جلوہ سے وحشت اور ایک سے انس کا اظہار کریں گے، پنڈلی والے جلوہ کو سب پہچان جائیں گے اور سب سجدہ میں گر جائیں گے۔ شاید یہ پنڈلی کی تجلی وہی ہو جس کے نچلے حصے (قدم) پر یہ لوگ سجدہ میں روزانہ سر دھرا کرتے تھے اور ان کا سر اللہ کے قدموں پر پڑتا تھا۔ اسی لیے اسے ہر شخص پہچان لے گا کہ عادتاً روزانہ اسی تجلی کے سامنے سر بسجود ہوا کرتا تھا اور اس تجلی سے روح نے کافی مناسبت پیدا کر لی تھی..... خلاصہ یہ کہ عوام الناس اگر قدم الٰہی کا یہاں مشاہدہ نہیں کر سکتے تو یہ بھی نہیں کہ وہ اس قدم اور ساق کو بالکل پہچانتے ہی نہیں ہیں۔

اسی پر مکالمۂ الٰہی اور قرب حق کو بھی قیاس کر لیجئے۔ غرض یہ نماز میں مکالمۂ حق اور یہ انتہائی قرب اور یہ مشاہدۂ تجلی قدم کوئی استعارۂ وتشبیہ نہیں بلکہ واقعہ ہے اور یہی تین چیزیں معراج کی روح ہیں اس لیے ہر مؤمن کو حقیقتاً روزانہ پانچ مرتبہ نماز میں معراج ہوتی ہے۔

یہاں سے ایک لطیفہ یہ بھی کھلا کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر چونکہ مراتب عبودیت سب ختم تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم عبد کامل تھے اور عبدیت وتواضع للہ ہی میں رفعت وسر بلند ہوتی ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بقدر عبدیت ہی رفعت دی گئی۔ یعنی عبدیت انتہائی تھی تو رفعت بھی انتہائی عطا ہوئی۔ جسے معراج کہتے ہیں۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عرش تک رسائی میسر ہوئی اور پھر اس معراج میں نماز کا ہدیہ عطا ہوا۔ تو اس سے واضح ہوا

کہ نماز کو کچھ عروج ومعراج ورفعت اور بلندی سے کافی ربط ومناسبت ہے، جس کی وجہ یہی ہے کہ جب مطلقاً تواضع اور عبدیت کے لیے رفعت کا ثمرہ ہے اور رفعت وبلندی بقدر تذلل وپستی ملتی ہے تو نماز میں تو آدمی اپنی ذلت کی انتہا کر دیتا ہے، اس لیے نماز کے ذریعہ رفعت کی بھی انتہا ہونی چاہیے۔ اس لیے اگر مطلق تواضع وعبدیت سے مطلقاً رفعت ملتی ہے تو نماز جیسی انتہائی تواضع وعبدیت سے رفعت بھی انتہائی ملنی چاہیے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس جبکہ تذلل للہ میں انتہائی درجہ رکھتی تھی تو معراج بھی انتہائی ہوئی اور اوپر سے نماز میسر ہوئی تاکہ تذلل للہ اور بڑھتا جائے تو مقامات رفعت وعروج بھی اور ترقی کرتے جائیں، اس سے واضح ہوا کہ نماز کی ابتداء میں بھی عروج ومعراج ہے۔ اور انتہاء میں بھی عروج ومعراج ہے اور نماز کو دوطرفہ معراجوں نے گھیر رکھا ہے۔ اس بناء پر اگر بقدر قابلیت واستعداد ہر مسلمان کو نماز میں عروج نصیب ہو اور روحانی طور پر نماز میں اسے معراج نصیب ہوا کرے تو یہ نماز کا ایک طبعی خاصہ اور نا قابل تعجب بات ہوگی۔

چنانچہ اس حقیقت کو کسی قدر صاف لفظوں میں حدیث مذکور میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ نماز کو دو طرفہ عروج ومعراج سے نہ صرف مناسبت ہی ہے بلکہ اس کا اثر ہی معراج ہے اور نہ صرف پیغمبر ہی کے لیے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جوتیوں کے طفیل میں ہر ایک نمازی مسلمان کے لیے۔ پھر نماز کو اس سے نرالے ڈھنگ سے فرض کر دیئے جانے کے بعد نماز کا عملی اسوہ قائم کرنے کا بھی نرالا ہی ڈھنگ یہ اختیار کیا گیا کہ ہر عبادت فرض ہو جانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قلب منور کی رہنمائی اور حق تعالیٰ کے الہام سے اس کا عملی نمونہ خود قائم فرمایا اور امت کو وہ عبادت کر کے دکھلا دی تاکہ دنیا اس کی عملی شکل کو پہچان لے اور اس کے عملی گوشوں کو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے سمجھ لے۔ لیکن نماز کے بارہ میں یہ صورت کافی نہیں سمجھی گئی، بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی نماز کا ایک نمونہ لا کر رکھا گیا تاکہ جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے عملاً سمجھا تھا ویسے ہی رجال غیب کے عمل سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ہر ہر گوشۂ عمل کو محفوظ فرمالیں اور اس میں کسی ادنیٰ لغزش کا احتمال نہ رہے۔

چنانچہ کسی عبادت کو کر کے دکھلانے کے لیے فرشتے نہیں بھیجے گئے لیکن نماز کی عبادت کو کر کے دکھلانے نیز اس کے اوقات کی تحدید کرنے کے لیے سید الملائکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دو دن تک دنیا میں بھیجا گیا جنہوں نے اوقات نماز کی تشخیص کے لیے اس کے اوقات کا اول وآخر عملاً مشخص کر کے دکھلایا۔ جیسا کہ احادیث میں اس کی تفاصیل موجود ہیں۔

اس سے واضح ہے کہ عند اللہ اس عبادت کی کس درجہ اہمیت تھی، گویا حضرت جبرئیلؑ پورے اسلام کا تو وحی کے ذریعہ محض علم ہی لے کر دنیا میں آئے مگر نماز کا پورا عمل اور پورے اوقات کی تحدیدات بھی دے کر بھیجے گئے کہ اس کا علم براہ راست حق تعالیٰ نے شب معراج میں عطا فرما دیا تھا اس کو لے کر آنے کی ضرورت ہی نہ تھی جس سے نماز کا اہتمام شان واضح ہے کہ تعلیم اس کی براہ راست حق تعالیٰ دیں بیت نبوت میں نہیں بلکہ اپنے گھر عرش پر بلا کر دیں۔ اور عمل

اس کا سید المقربین جبرائیل علیہ السلام کے ہاتھ بھیجیں، ظاہر ہے کہ ایسی عبادت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کس درجہ تک وجہ تسلی ہو سکتی ہے۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک فرمایا ہے۔

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ . ① ''میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے''۔ اور اس لیے صرف نمازی کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے لوگو! اگر کوئی شخص دن میں پانچ مرتبہ نہر میں غسل کرے جو اس کے دروازے کے سامنے بہ رہی ہو تو کیا اس کے بدن پر میل کچیل باقی رہ سکتا ہے؟ عرض کیا گیا، ہرگز نہیں! فرمایا کہ نماز درحقیقت روحانی غسل ہے جو دن میں پانچ مرتبہ ہوتا ہے تو اس کے بعد روح میں معاصی کا میل کچیل کیسے باقی رہ سکتا ہے؟ اسی لیے ارشاد فرمایا گیا کہ: اَلصَّلٰوةُ اِلَى الصَّلٰوةِ كَفَّارَةٌ .... ② ایک نماز دوسری نماز تک کے درمیانی گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے۔

اور جبکہ یہ نماز اس درجہ کی اہم عبادت تھی کہ اس کے سلسلہ میں براہ راست حق تعالیٰ کا یہ اہتمام، ملائکہ کی مساعی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عروج اور اس کے علم و عمل دونوں کے لیے دوڑ دھوپ ہوئی۔ وہ اسلام کا مرکزی نقطہ تھی اور بلا شبہ تھی کہ اسلام کا موضوع عبادت ہے اور عبادات کا فردِ کامل نماز ہے۔ تو پھر ضرور تھا کہ اس مرکزی نقطہ کے لیے اسلام کا کوئی حسی مرکز قائم ہو جو پورے اسلام کا حسی شعار ہو۔ جیسا کہ نماز اس کا عملی شعار ہے۔ تو یہیں سے کعبہ کی بنیاد نماز ہی کے لیے رکھی گئی جس کا نام مسجد حرام ہے۔ مسجد کے معنی سجدہ گاہ کے ہیں اور سجدہ مکان کا اصل مقصود ہے اس لیے مسجد حرام بیت اللہ کی بنیاد فی الحقیقت نماز ہی کے لیے ڈالی گئی اگر اس کے اردگرد طواف ہوتا ہے تو طواف میں بھی یہ اہمیت اسی لیے آئی ہے کہ وہ حکم میں نماز کے ہے، چنانچہ حدیث میں صراحتہً فرمایا گیا ہے کہ طواف بھی حکماً نماز ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اس حکمی نماز میں سلام و کلام جائز ہے، اصل صلوٰۃ میں جائز نہیں۔

بہر حال بیت اللہ کی بنیاد کی غرض و غایت اگر طواف کو بھی رکھا جائے تو وہ بھی چونکہ حکماً صلوٰۃ ہی ہے۔ اس لیے اس کے واسطہ سے بھی مسجد حرام کی بنیاد نماز ہی کے لیے رہتی ہے۔ غرض اس مرکزی عمل کے لیے جگہ بھی مرکزی بنائی گئی ہے کہ جیسے نماز کی طرف ہر ہر مخلوق کا رجوع ہے۔ ایسے ہی نماز حقیقی و حکمی کی خاطر اس بیت عتیق کی طرف بھی سارے ہی عالم کا رجوع ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی تعمیر کر کے اس کے اردگرد اپنی اولاد کو آباد کرنے کی غرض و غایت صرف نماز ظاہر فرمائی ہے۔ اور صرف نماز ہی کے ذریعہ سے اولاد کی مقبولیت چاہی جس کو حق تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں نقل فرما دیا ہے۔ ارشادِ حق ہے: رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ ③ ''اور آخر میں پھر

① المعجم الصغير للطبراني، باب الفاء، من اسمه الفضل ج:۲ ص:۳۷۲.

② مسند احمد، مسند ابی هريرةؓ ج:۲۱ ص:۲۱۵. ③ پاره:۱۳، سورة: ابراهيم، الآية:۳۷.

مستقلاً جو دعا کی ہے وہ صرف یہی ہے کہ مجھے اور میری اولاد کو نمازی بنا دیا جائے‘‘۔

غرض ابوالانبیاء سے لے کر خاتم الانبیاء علیہ السلام تک اور جبرئیل علیہ السلام سے لے کر عام فرشتوں تک نماز کا ایک خاص اہتمام نظر آتا ہے۔نماز کے لیے مساجد کی تعمیر الگ ہو رہی ہے۔نماز کے لیے شہر الگ بسائے جا رہے ہیں،نماز کے لیے انبیاء علیہ السلام التجائیں کر رہے ہیں۔

غرض دین کا اول و آخر اور عالم کا مقصودِ واحد نماز ہی نماز نظر آتی ہے۔اور تو اور انتہائی بات یہ ہے کہ نماز سے حق تعالیٰ نے بھی اپنے کو مستثنیٰ نہیں رکھا۔جیسا کہ واضح ہو چکا ہے۔یہ الگ چیز ہے کہ اس کی صلوٰۃ کے معنی عیاذاً باللہ تذلل کے نہیں ہیں کہ وہ ہر عیب سے پاک اور ہر احتیاج و ذلت سے منزہ و مقدس ہے،وہاں صلوٰۃ کے معنی انزالِ رحمت ہی کے ہو سکتے ہیں اور ہیں۔لیکن بہر حال عنوان ہی کے درجہ میں سہی،اللہ نے اپنے کو صائم یا مزکی یا حاجی نہیں فرمایا مگر مصلّی ضرور فرمایا ہے جیسا کہ اس کی تفصیل میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں۔ارشادِ ربانی ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ ① خلاصہ یہ ہے کہ نماز میں جامعیت انتہائی ہے جمعیت بھی اعلیٰ ترین ہے اور اجتماعیت بھی فوق العادت ہے اور اس لیے اس میں تہذیب نفس بھی اکمل ترین ہے۔تدبیر منزل کے اصول بھی بہترین انداز سے جمع ہیں اور سیاست مدن کے قواعد و مقاصد بھی انتہائی کمال کے ساتھ جمع ہیں جس سے آدمی مہذب بن کر اپنی خانگی اور شہری زندگی کا نظام درست کرنے کے قابل ہو جاتا ہے،خلاصہ یہ ہے کہ نماز کی عبادات ادا کرنے سے انسان میں تہذیب نفس کے ذریعہ خدائی کمالات اجاگر ہوتے ہیں اور وہ خدا کے ان کمالاتی نمونوں کی وجہ سے اس قابل بنتا ہے کہ جو کام خدا کا اپنی مخلوق کے ساتھ یعنی ان پر رحم و کرم اور شفقت کر کے ان کا دینی و دنیوی نظم درست فرمانا اور ان کی ظاہری و باطنی اور مادی و روحانی تربیت کر کے انہیں حدِ کمال پر پہنچانا۔وہی کام ان خدائی نمونوں کے جامع ہونے کی حیثیت سے انسان کا بھی ہو جاتا ہے کہ وہ خود صالح بن کر دوسروں کو صالح بنائے ان کا نظامِ تہذیب و تمدن درست کرے اور ان پر قانون الٰہی کا کنٹرول کرے،انہیں خدائی حکومت کی وفادار رعایا بنائے اور اس کی شہنشاہی کا ڈنکا دنیا میں بجا دے۔جس سے واضح ہوا کہ نماز ہی کے ذریعہ آدمی عبادتِ الٰہی کا فریضہ بھی ادا کر سکتا ہے اور نماز ہی کے ذریعہ آدمی خلافتِ الٰہی کا مقصد بھی پورا کر سکتا ہے،قرنِ اول اس صلاح و اصلاح کو لے کر اٹھا جو نماز کی برکت سے ان میں پیدا ہوئی۔ انہوں نے فقیری میں بادشاہتیں کیں اور بادشاہتوں میں فقیری کی شانیں دکھائیں۔یعنی بادشاہتوں کے وقت تو ان کی نماز سے پیدا شدہ تواضع نہیں جاتی تھی اور تواضع و غنائے نفس کے وقت ان کی نماز سے پیدا شدہ اجتماعیت اور تنظیمِ ملت فنا نہیں ہوتی تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ امیر المؤمنین ہیں اور کندھے پر پانی کی مشک ہے اور رعایا کے گھر میں پانی بھرتے پھر

① پارہ: ۲۲،سورۃ: الاحزاب،الآیۃ: ۴۳.

رہے ہیں۔عرض کیا گیا کہ امیر المؤمنین بیت المال کے کسی خادم کو حکم فرما دیتے۔فرمایا کہ کل روم کا سفیر میرے پاس آیا تھا اور وہ مجھ سے مرعوب ہوا جس سے میرے نفس میں ایک قسم کا عجب اور خود پسندی کا نزعہ پیدا ہوا، اس کا علاج کرتا پھر رہا ہوں، دیکھ جو کہ وہ مسند خلافت پر بھی ہیں مگر خوئے عبادت اور تواضع نفس دامن کی ساتھ ساتھ ہے۔ایک دن فاروق اعظم رضی اللہ عنہ شب میں گشت کر رہے تھے تاکہ رعیت کے احوال سے باخبر ہوں۔سڑک پر ایک مکان میں سے گنگنانے کی آواز آئی کہ کوئی عورت یہ شعر پڑھ رہی ہے:

فَوَاللّٰهِ لَوْ لَا اللّٰهُ تُخْشٰى عَوَاقِبُهٗ　　لَزُحْزِحَ عَنْ هٰذَا السَّرِيْرِ جَوَانِبُهٗ

خدا کی قسم! اگر اللہ کے عذاب کا ڈر نہ ہوتا تو آج اس چارپائی کی چول چول ڈھیلی ہو جاتی یعنی میں کسی کے ساتھ اس چارپائی پر ہم بستری میں مشغول ہوتی۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ یہ بے باکانہ شعر سن کر غضبناک ہوئے۔اور جوش ایمان میں ایک دم بند مکان میں دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوئے اور زور سے فرمایا کہ کون ہے جو اس قسم کا فحش اور ممنوع شعر پڑھ رہا ہے؟ وہ عورت گھبرا گئی مگر جرأت کے ساتھ بولی کہ امیر المؤمنین! آپ مجھے تو کہہ رہے ہیں کہ میں نے خلاف شریعت اقدام کیا لیکن آپ خود اپنے کو نہیں دیکھتے کہ اس وقت کھڑے کھڑے تین باتیں خلاف شریعت کی ہیں۔فاروق اعظم رضی اللہ عنہ گھبرا گئے اور فرمایا، میں نے کیا کیا؟ اس نے کہا سب سے پہلے بات تو یہ ہے کہ اللہ کا حکم ہے: (غالباً یہ دو واقعے مخلوط ہو چکے ہیں۔حضرت عمر کا مکان میں گھسنے کا واقعہ کسی اور شخص کے ساتھ پیش آیا تھا، دیکھئے حیاۃ الصحابہ)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ①

آپ نے نہ استیذان کیا نہ سلام کر کے ہی گھر میں داخل ہوئے) دوسری بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا حکم ہے کہ: وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا. ② اور آپ دیوار پھلانگ کر گھر میں داخل ہوئے آپ کو اس کا کیا حق تھا، تیسرے یہ کہ حق تعالیٰ کا حکم ہے کہ: وَلَا تَجَسَّسُوْا ③ اور آپ نے گھر میں گھس کر خصوصی طور پر اسرار کا تجسس کیا۔اور ایک گھر میں پڑی ہوئی عورت کے مخفی احوال پر مطلع ہونا چاہا۔فاروق اعظم رضی اللہ عنہ وہیں کھڑے کھڑے رو پڑے اور اس عورت سے معافی چاہی، واپس ہوئے اور تمام رات استغفار میں مشغول رہے، صبح ہوتے ہی اس عورت کو طلب فرمایا اور فرمایا کہ اب بحیثیت امیر المؤمنین کے میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ وہ شعر تو نے کیوں پڑھا، جس سے بے حیائی کی بو آ رہی تھی؟ اس نے عرض کیا کہ امیر المؤمنین میں نوجوان ہوں اور شادی کو ابھی ایک ماہ گزرا ہے۔میرا خاوند آپ کی فوج میں جہاد پر گیا ہوا ہے۔اپنے جوش جوانی اور اس کے فراق میں بے ساختہ یہ اشعار زبان پر جاری تھے۔ورنہ الحمد للہ زنا اور بدکاری سے پاک ہوں۔فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر اپنی بیوی سے جا کر پوچھا کہ جوان عورت خاوند سے کتنے دن صبر کر سکتی ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ تین ماہ، اسی وقت امیر المؤمنین نے حکم فرمایا کہ فوج میں

① پارہ: ۱۸، سورۃ: النور، الآیۃ: ۲۷۔ ② پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ: الآیۃ: ۱۸۹۔ ③ پارہ: ۲۶، سورۃ: الحجرات، الآیۃ: ۱۲۔

کوئی شخص تین ماہ سے زائد نہ روکا جائے، تین ماہ ہوتے ہی اسے رخصت دی جائے اوراس کی جگہ دوسرا پہنچ جائے۔

اس واقعہ سے یہ واضح ہے کہ ان پاک باز افراد اور مقدس حضرات کے ہاتھوں امارت وخلافت کے فرائض بھی انجام پا رہے ہیں کہ رعایا کی تربیت اور ان کے اخلاق کی نگہداشت خود امیر المؤمنین راتوں رات گھوم کر فرما رہے ہیں جو اجتماعی زندگی کا راس المال ہے کہ ایک غریب عورت تک پر شفقت ایسی ہی مبذول ہے جیسے قوم کے ایک بڑے سے بڑے فرد پر ہوسکتی تھی، جس سے شفقت علی الخلق واضح ہے مگر ساتھ ہی عبدیت کا عالم یہ ہے کہ اسی عورت کے ڈانٹنے پر رو بھی رہے ہیں اوراس سے معافی چاہ رہے ہیں۔ اور معذرت کر کے رخصت ہو رہے ہیں جو جامعیت احوال کی انتہاء ہے کہ نہ دوسروں کو بھول رہے ہیں نہ اپنے کو اور حالت مقتضا کا حق ادا کر رہے ہیں۔ پھر عبادت کا یہ عالم ہے کہ پوری رات کھڑے ہوکر استغفار اور توبہ میں مصروف ہیں کہ میں نے اللہ تعالیٰ کی تین نافرمانیاں کیں۔ حالانکہ وہ عصیان نہ تھا۔ اور فرائض کے سلسلہ میں امیر کو تفتیش اسرار کا حق حاصل ہے جبکہ صلاح خلق پیش نظر ہو، مگر اپنے بلند مراتب کے لحاظ سے اسے گناہ ہی سمجھ رہے۔ اور رات بھر توبہ وزاری میں بھی مصروف ہیں جو جمعیت خاطر کا اعلیٰ مقام ہے۔ پس اجتماعیت اور جمعیت تینوں مقامات ایک دم موجود اور زیر عمل ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں یہ کیفیت اسی تعلق مع اللہ نے پیدا کی تھی جس کا مظہر اتم نماز تھا، چنانچہ ان کی ابتداء نماز ہی سے ہوتی ہے اور تمام تمام رات نماز میں رہ کر انہوں نے اپنے صالح نفوس کو مانجھا اور صاف کیا تھا۔

بہر حال نماز کی جامعیت دیکھو تو تمام احوال بشری کے مناسب اس میں شرعی حقائق کا اجتماع ہے اور اجتماعیت کو دیکھو تو ہر قسم کے معاملات باہمی کی اصلاح کے اصول اس میں موجود ہیں اور جمعیت کو دیکھو تو اس سے زیادہ دلوں کے گوشوں کو سکون وطمانیت اور حقائق کائنات اور حقائق الٰہیات کے علم ومعرفت سے بھر دینے والی چیز دوسری نہیں ہے۔ جس سے آدم زاد کی عبادت ونیابت دونوں مکمل ہوجاتی ہیں جو اس کی تخلیق کا اصل مقصد ہے اور ان ہی تینوں مقامات جامعیت، اجتماعیت اور جمعیت اور پھر ان کے دو موالید عبادت ونیابت کی یہ شرح ہے جو تفصیل وار عرض کی گئی ہے۔

یہی ہے نماز کی وہ حقیقت جس کو آپ فلسفہ کے عنوان سے سننا چاہتے تھے لیکن کیا حقیقتاً فلسفہ ہمیں ان حقائق تک پہنچا سکتا ہے؟ کبھی نہیں! فلسفیت نژاد عمل کی رسائی ان امور تک کبھی نہیں ہوسکتی کہ یہ عقل کی پرواز ہی سے بالا چیزیں ہیں۔ اسی لیے کسی فلسفی کے کلام میں آپ اس قسم کے معارف آلہیہ ملاحظہ نہیں کر سکتے۔ یہ چیزیں محض انبیاء علیہم السلام کی جوتیوں کی برکت، ان پر ایمان لانے کے طفیل اور وحی کے اتباع سے میسر آسکتی ہے۔ کیوں کہ یہ معرفت کی چیزیں ہیں تعقل کی چیزیں نہیں۔ ان کا دائرہ عقلیات کا دائرہ نہیں بلکہ وجدانیات کا دائرہ ہے جو سمعیات سے پیدا ہوتی ہیں۔ میں کوئی چیز نہیں ہوں۔ کہاں میں اور کہاں علمی حقائق۔ یہ محض اپنے بزرگوں کی جوتیوں کا صدقہ ہے کہ اس موضوع کے چار حرف زبان پر آگئے اور انہی کے کلام وفیض کا طفیل ہے کہ ہماری زبان کو

کچھ رسائی مل گئی اور ذہن کو کچھ راستہ ہاتھ آ گیا؟ فَلِلّٰهِ دَرُّهُمْ .

ہاں پھر نماز کے یہ تمام مقامات بندہ میں کب آتے ہیں جبکہ وہ ذکر اللہ اور یادِ حق کی خاطر نماز ادا کرے اور اس کے جزو جزو میں ذکر اللہ رچا ہوا ہو ورنہ اگر ذکر کی بجائے غفلت ہو تو پھر نہ جمعیت آ سکتی ہے نہ جامعیت نہ اجتماعیت، بلکہ غفلت اور قساوت بڑھ جاتی ہے اور غفلت آمیز نماز منہ پر مار دینے کے قابل ہو جاتی ہے چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ''بعض نماز پڑھنے والے نماز سے پورا حصہ لے کر لوٹتے ہیں، بعض نصف، بعض پاؤ اور بعض خالی ہاتھ چلے جاتے ہیں، انہیں کچھ بھی نہیں ملتا، اور وہی ہیں جنہوں نے ذکر کے بجائے غفلت کو نماز میں لحاف کی طرح اپنے اوپر اوڑھ لیا اور فرش کی طرح بچھا لیا ہو'' اس سے معلوم ہوا کہ نماز کا اصل فلسفہ اور حقیقت وغایت ذکر اللہ ہے، پھر ذکر اللہ کی برکت سے یہ تینوں مقامات مذکورہ بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اور ان تینوں مقامات ہی سے عبادت وخلافت کے مقاصد پورے ہوتے ہیں۔ اس لیے شروع میں میں نے یہ آیت پڑھی وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ ① (نماز قائم کرو میری یاد کے لیے) جس سے ذکر اللہ کا روحِ صلوٰۃ، حقیقتِ صلوٰۃ، منشائے برکاتِ صلوٰۃ۔ اور مرکزِ آثارِ صلوٰۃ ہونا واضح ہو جاتا ہے مگر یہ ذکر اللہ کی روح نماز میں کب پیدا ہوتی ہے؟ اس وقت جبکہ نماز کو اس کی حقیقی ہیئت وکیفیت کے ساتھ ادا کی جائے۔ اس کے آداب وشروط اور سنن وواجبات کی کما حقہ رعایت کی جائے۔ یہ چیز محض فعلِ صلوٰۃ سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اقامت کے معنی نماز کو درست کر کے پڑھنے کے ہیں۔ اور درستی کی حقیقت وہی استیفاء شروط اور اقامت حدود ہے، اسی لیے قرآنِ حکیم نے آیت مذکورہ میں یوں نہیں فرمایا کہ صَلِّ لِذِكْرِىْ بلکہ فرمایا ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ﴾ جس کا حاصل وہی ہے کہ نماز میں ٹکریں مت مارو، بلکہ اس کے آداب وسنن اور واجبات وفرائض کا حق ادا کرو۔ اس کے سنن ومستحبات کی رعایت کر کے پڑھو، تا کہ اس کے حقیقی ثمرات اس پر مرتب ہوں، پس خلاصہ یہ نکلا کہ اقامتِ صلوٰۃ پر ذکر اللہ موقوف ہے اور ذکر اللہ پر یہ تین مقامات معلق ہیں، اور ان تین مقامات پر خلقتِ آدمؑ کے دو مقاصد عبادت وخلافت مبنی۔ اگر اقامتِ صلوٰۃ نہیں اور اس میں ذکر اللہ نہیں تو جمعیت جامعیت اجتماعیت کچھ بھی نہیں اور جب یہ تینوں چیزیں نہیں تو عبادت وخلافت نہیں۔ اس لیے نماز کی اصل اساس جس پر اس کی یہ ساری عظیم الشان عمارت کھڑی ہوتی ہے، جو پورے اسلام کے ہم پلہ ہے محض ذکر اللہ ہے۔ اگر فی الحقیقت نماز اس روح کو لیے ہوئے ادا ہو تو اس کا اثر اس لیے ہم پر ہی نہیں غیر اقوام پر بھی پڑتا ہے، میں نے ایک ہندو سے کہا کہ میاں تم لوگ مساجد کے سامنے باجہ وغیرہ پر مسلمانوں سے لڑتے ہو اور چاہتے ہو کہ مساجد کے آگے باجے زور شور کے ساتھ لے جاؤ کیا تم اس معقول بات کو نہیں سمجھتے کہ نماز عبادتِ الٰہی ہے مخلوق کو ستانا نہیں ہے؟ پھر کیوں اس پاک چیز کو تم نے جھگڑے اور فساد کا حیلہ بنا رکھا ہے؟ اس کی تو حرمت ہر مذہبی انسان کو کرنی چاہئے۔ اس نے جواب دیا کہ میں کٹ گیا اور ندامت سے بجز

① پارہ: ۲۰، سورۃ: طٰہٰ، الآیۃ: ۱۴۔

سکوت اختیار کرنے کے اور کچھ نہ کرسکا۔ اس ہندو نے کہا کہ مولوی صاحب نمازی رہے کہاں ہیں اگر سچی نمازیں پڑھنے والے ہوں تو ہمارے گھر بھی ان کے لیے حاضر ہیں۔ اور کس کی مجال ہے کہ بے حرمتی کرسکے مگر اب تو ہر چیز سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے رہ گئے ہیں۔ دین سے اللہ کے نام سے، نماز کے اسم سے، اسلام کے لفظ سے اپنی اغراض پورے کرنے والے رہ گئے ہیں اس لیے دوسری قوموں کا معاملہ بھی ان کے ساتھ ویسا ہی ہوگیا جیسے وہ ہیں۔ حقیقتاً اس نے صحیح جواب دیا اور مجھے ساکت ہونے کے سوا اور کچھ نہیں پڑا، اگر سچی نماز والے سچے مسلمان ہوں تو اللہ اکبر! غیر اقوام تک پر رعب پڑتا ہے۔ جب کہ نماز شیاطین کو پسپا کردیتی ہے اور ان سے جنگ کرتی ہے۔ تو شیاطین الانس کی اس کے سامنے کیا حقیقت ہے کہ وہ ٹھہر سکیں، یا مرعوب نہ ہوں؟

کلکتہ کے گول میدان میں جب عید کی نماز ہوتی ہے اور غالباً بارہ لاکھ آدمی جمع ہو کر ایک امام کے پیچھے اقتداء کرتے ہیں، تو یہ منظر دیکھنے کے لیے اکثر غیر مسلم بھی جمع ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ ان تماش بینوں میں مسز سروجنی نائیڈو بھی آئی جو اس وقت کے لیڈروں میں شمار ہوتی ہے۔ وہ یہ منظر دیکھ کر حیران تھی اس نے کہا کہ یہ ڈسپلن اور یہ نظام کہ لاکھوں کی مرتبہ صفیں صرف ایک لیڈر کی آواز پر حرکت کر رہی ہیں؟ کیا ٹھکانہ ہے اس نظم کا؟ یہ نظم آج کسی قوم کو بھی میسر نہیں جو مسلمانوں کو مذہباً میسر ہے۔ سو یہی حقیقت ہے کہ اس صورت صلوٰۃ میں رعب اندازی کے آثار ہیں اگر کہیں اقامت صلوٰۃ میسر ہو جائے جس کی روح ذکر اللہ ہو اور مسلمانوں کا اتنا عدد ہو تو کیا دنیا کا نقشہ یہی رہ سکتا ہے جو آج ہے؟

پس میرے خیال میں اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے صرف ایک نماز اور اس کی یہ عرض کردہ حقیقت وخصوصیت ہی کافی ہے۔ اور غیروں میں بھی کوئی منصف مزاج انسان ہو تو وہ اس اعتراف کے سوا چارہ نہ دیکھے گا۔ کہ یہ عبادت یقیناً منجانب اللہ ہے۔ جس میں اس قسم کی رعائتیں رکھی گئی ہیں کہ کسی انسان کی عقل انہیں کبھی تجویز نہیں کرسکتی۔ اور متفرق طریق پر کچھ کر بھی سکے گی تو سہل ممتنع کے طور پر اس مختصر سے عمل میں ان سب کو جمع کرنے کی کوئی صلاحیت نہیں رکھتی۔ کوئی بھی انسان خواہ وہ کیسا ہی فلسفی ہو اپنی کسی مجوزہ اسکیم میں اتنی لامحدود رعائتیں نہیں رکھ سکتا کہ جن میں دین، دنیا، اخلاق، معاشرت، عبادت، عادت، خلوت، انفراز سیاست، حکومت، صلاح واصلاح، اعلاء کلمۃ اللہ اور اسفال کلمۂ کفر۔ سب ہی چیزیں بیک آن جمع ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ نماز باجماعت کو دانتوں سے پکڑلیں۔ کہ اس سے ان شاء اللہ فتن ان کے پاس کھڑے نہ رہیں گے، اور اسی سے پورے اسلام میں گھس جانے کا انہیں راستہ مل جائے گا۔ بس اب میں دعائے توفیق پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ.

محمد طیب غفرلہٗ مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ ۲۱ رجب المرجب ۱۳۶۱ھ

آدابِ نماز ماخوذ از تبلیغ دین

حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''میری یاد کے لیے نماز قائم کرو'' اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ''نماز دین کا ستون ہے'' خوب سمجھ لو کہ تم نماز میں اپنے پروردگار سے باتیں کرتے ہو۔ لہٰذا دیکھ لیا کرو کہ نماز کیسی پڑھ رہے ہو۔ اور چونکہ اللہ پاک نے اقامۃ صلوٰۃ یعنی نماز کے درست کرنے کا حکم فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نماز اور نماز کے متعلق تمام ضرورتوں کی پوری رعایت کرو، لہٰذا نماز میں ان تینوں باتوں کا پورا لحاظ رکھنا چاہیے۔

اول: نماز سے پہلے وضو کی نگہداشت کرو اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ وضو میں جس قدر سنتیں اور مستحبات ہیں ان کو بجالاؤ اور ہر عضو کے دھونے کے وقت وہ دعا پڑھو جو حدیث میں آئی ہے اور اس کے ساتھ ہی کپڑوں کا اور وضو کے پانی کا خیال رکھو کہ دونوں پاک ہوں۔ لیکن اس میں اتنا مبالغہ نہ کرو کہ وسواس تک نوبت پہنچ جائے کیوں کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے اور شیطان اکثر عبادت کرنے والے نیک بندوں کے اوقات شش و پنج میں ضائع کرتا ہے۔

وضو کرنے اور کپڑوں کی طہارت میں ایک عجیب حکمت ...... جاننا چاہیے کہ نمازی کے کپڑوں کی مثال ایسی ہے جیسے اندر کا چھلکا اور قلب کی مثال ایسی ہے جیسے اندر کی گری اور مغز۔

ظاہر مقصود مغز ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح اس ظاہری پاکی سے بھی قلب کا پاک ہونا اور نورانی بنانا مقصود ہے۔ شاید تم کو یہ شبہ ہو کہ کپڑے کے دھونے سے قلب کس طرح پاک ہوسکتا ہے۔ لہٰذا سمجھ لو کہ حق تعالیٰ نے ظاہر اور باطن میں ایک خاص تعلق رکھا ہے جس کی وجہ سے ظاہری تعلق کا اثر باطنی طہارت تک ضرور پہنچتا ہے۔ چنانچہ جب چاہے دیکھ لو کہ جب تم وضو کر کے کھڑے ہوئے۔ ہو تو اپنے قلب میں ایسی صفائی اور انشراح پاتے ہو جو وضو سے پہلے نہ تھی اور ظاہر ہے کہ یہ وضو ہی کا اثر ہے جو بدن سے بڑھ کر دل تک پہنچتا ہے۔

نماز پڑھنے سے بہر حال نفع ہے اگر چہ اس کے اسرار کو نہ سمجھے ...... دوم: نماز کے جملہ ارکان وہ سنتیں ہوں یا مستحبات اور ذکر یا تسبیح سب کو اپنے قاعدے پر ادا کرے اور یاد رکھو کہ جس طرح بدن کی ظاہری طہارت نے قلب کی باطنی صفائی میں اثر دکھایا تھا اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ نماز کے ارکان کا اثر قلب میں ہوتا ہے اور نورانیت پیدا کرتا ہے۔ اور جس طرح مریض کو دوا پینے سے ضرور نفع ہوتا ہے اگر چہ دوا کے اجزاء کی تاثیروں سے واقف نہ ہو اسی طرح تم کو نماز کے ارکان ادا کرنے سے ضرور نفع پہنچے گا اگر چہ تمہیں اس کے اسرار اور رموز سے واقفیت نہ ہو۔

نماز کی روح اور بدن ...... جاننا چاہیے کہ جاندار مخلوق کی طرح حق تعالیٰ نے نماز کو بھی ایک صورت اور روح

مرحمت فرمائی ہے چنانچہ نماز کی روح تو نیت اور قلب ہے اور قیام وقعود نماز کا بدن ہے اور رکوع وسجود نماز کا سر اور ہاتھ پاؤں ہیں اور جس قدر اذکار وتسبیحات نماز میں ہیں وہ نماز کے آنکھ، کان وغیرہ ہیں اذکار۔ وتسبیحات کے معنی کو سمجھنا گویا آنکھ کی بینائی اور کانوں کی قوت سماعت وغیرہ ہے اور نماز کے تمام ارکان کو اطمینان اور خشوع وخضوع کے ساتھ ادا کرنا نماز کا حسن یعنی بدن کا سڈول اور رنگ وروغن کا درست ہونا ہے۔

الغرض اس طرح پر نماز کے اجزاء اور ارکان کو بحضور قلب پورا کرنے سے نماز کی ایک حسین وجمیل اور پیاری صورت پیدا ہو جاتی ہے اور نماز میں جو تقرب نمازی کو حق تعالیٰ سے حاصل ہوتا ہے اس کی مثال ایسے سمجھو جیسے کوئی خدمتگار اپنے بادشاہ کی خدمت میں کوئی خوبصورت کنیز ہدیۃً پیش کرے اور اس وقت اس کو بادشاہ سے تقرب حاصل ہو۔ پس اگر تمہاری نماز میں خلوص نہیں ہے تو گویا مردہ اور بے جان کنیز بادشاہ کی نذر کر رہے ہو اور ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسی گستاخی و بے باکی ہے کہ ایسا گستاخ شخص اگر قتل کر دیا جائے تو عجب نہیں۔ اگر نماز میں رکوع وسجدہ نہیں ہے تو گویا لنگڑی لولی اور اپاہج لونڈی پیش کرتے ہو.... اور اگر ذکر وتسبیح اس میں نہیں ہے تو گویا لونڈی کے آنکھ کان نہیں اور اگر سب کچھ موجود ہے مگر ذکر وتسبیح کے معنی نہیں سمجھے اور نہ دل متوجہ ہوا تو ایسا ہے جیسے کہ اعضاء تو سب موجود ہیں لیکن اس میں حس وحرکت بالکل نہیں، یعنی حلقۂ چشم موجود ہے مگر بینائی نہیں ہے اور کان موجود ہیں مگر بہرے ہیں کہ سنائی نہیں دیتا، ہاتھ پاؤں ہیں مگر شل اور بے حس ہیں۔ اب تم خود سمجھ سکتے ہو کہ اندھی بہری کنیز شاہی نذرانہ میں قبول ہو سکتی ہے یا نہیں؟ شاید تمہیں یہ شبہ ہو کہ جب نماز کے فرض اور واجب ادا کر دیئے جاتے ہیں تو علمائے شریعت اس نماز کے صحیح ہو جانے کا فتویٰ دے دیتے ہیں خواہ معنیٰ سمجھے ہوں یا نہ سمجھے ہوں اور جب نماز صحیح ہو گئی تو جو مقصود تھا وہ حاصل ہو گیا، اس سے معلوم ہوا کہ معنی کا سمجھنا نماز میں ضروری نہیں لہٰذا سمجھ لو کہ علماء کی مثال طبیب کی سی ہے پس اگر کوئی لونڈی اپاہج اور کیسی ہی عیب دار کیوں نہ ہو اگر اس میں روح موجود ہے تو طبیب اس کو دیکھ کر ضرور یہی کہے گا کہ یہ زندہ ہے مردہ نہیں ہے۔

بلا حضور قلب والی نماز کی صحت پر علماء کا فتویٰ اور شبہ کا جواب...... اسی طرح نماز کی روح اور اعضائے رئیسہ کے موجود ہونے سے علماء فتویٰ دے دیں گے کہ نماز صحیح ہے اور فاسد نہیں ہے۔ ایسی صورت میں طبیب نے اور عالم نے اپنے منصب کے موافق جو کچھ کہا ہے مگر نماز تو شاہی نذرانہ اور سلطانی تقرب حاصل ہونے کی حالت ہے اور اتنا تم خود سمجھ سکتے ہو کہ عیب دار کنیز اگر چہ زندہ ہے مگر سلطانی نذرانہ پیش کرنے کے قابل نہیں ہے بلکہ ایسی کنیز کا تحفہ پیش کرنا گستاخی ہے اور شاہی عتاب کا موجب ہے۔ اسی طرح اگر ناقص کے ذریعہ سے اللہ کا تقرب چاہو گے تو عجب نہیں کہ پھٹے پرانے کپڑوں کی طرح لوٹا دی جائے اور منہ پر پھینک ماری جائے۔

الغرض نماز سے مقصود چونکہ حق تعالیٰ کی تعظیم ہے۔ لہٰذا نماز کے سنن اور مستحبات وآداب میں جس قدر بھی کمی ہو گی، اسی قدر احترام وتعظیم میں کوتاہی سمجھی جائے گی۔

نماز کی روح اور اعضاء......سوم: نماز کی روح کا زیادہ خیال رکھو یعنی نماز میں شروع سے اخیر تک اخلاص اور حضور قلب قائم رکھو یعنی نماز میں شروع سے اخیر تک جو کام اعضاء سے کرتے ہو ان کا اثر دل میں بھی پیدا کرو، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب رکوع میں بدن جھکے تو دل بھی عاجزی کے ساتھ جھک جانا چاہیے اور جب زبان سے اللہ اکبر کہے تو دل میں بھی یہ ہو کہ بے شک اللہ سے بڑی کوئی چیز نہیں ہے۔ اور جب الحمدللہ پڑھو قلب بھی اللہ کی نعمتوں کے شکریہ سے لبریز ہو۔ جس وقت زبان سے ایاک نعبد و ایاک نستعین . نکلے تو دل بھی اپنے ذلیل وضعیف اور محتاج ہونے کا اقرار کرے۔ یعنی قلب میں بھی یہی ہو کہ بے شک بجز خدا کے کسی چیز کا نہ مجھے اختیار ہو نہ کسی دوسرے کو غرض تمام اذکار و تسبیحات اور جملہ ارکان وحالات میں ظاہر وباطن یکساں اور ایک دوسرے کے موافق ہونا چاہیے اور سمجھ لو کہ نامۂ اعمال میں نماز وہی لکھی جاتی ہے جو سوچ سمجھ کر پڑھی گئی ہو۔

پس جتنا حصہ بغیر سمجھے ادا ہوگا وہ درج ہوگا ہاں یہ ضرور ہے کہ شروع شروع میں پوری طرح حضور قلب قائم رکھنے میں تم کو بہت دشواری معلوم ہوگی لیکن اگر عادت ڈالو گے تو رفتہ رفتہ ضرور عادت ہو جائے گی۔ اس لیے اس کی طرف توجہ کرو اور اس توجہ کو آہستہ آہستہ بڑھاؤ مثلاً اگر تمہیں چار فرض پڑھنے ہوں تو دیکھو کہ اس میں حضور قلب تم کو کس قدر حاصل ہوا۔

حضور قلب حاصل کرنے کی تدبیر......فرض کرو کہ ساری نماز میں دو رکعت کی برابر تو دل کو توجہ رہی اور دو رکعت کے برابر غفلت رہی تو ان دو رکعتوں کو نماز میں شمار ہی نہ کرو، اور اتنی نفلیں پڑھو کہ جن میں دو رکعت کی برابر حضور قلب حاصل ہو جائے۔

غرض جتنی زیادہ غفلت ہو اسی قدر نفلوں میں زیادتی کرو، حتی کہ اگر دس نفلوں میں چار فرض رکعتوں کا حضور قلب پورا ہو جائے تو امید کرو کہ حق تعالی اپنے فضل و کرم سے فرائض کا نقصان ان نفلوں سے پورا فرما دے گا۔ اور اس کمی کا تدارک نوافل سے منظور فرمالے گا۔

تفسیر سُورۃ المُلک

از: حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز

حق تعالیٰ شانہٗ کی بادشاہت کے نظام میں ایک نظام تو ہے تکمیلی ہے۔ کہ جس میں انسانوں کا دخل نہیں۔ وہ ایسا منظم ہے کہ تل برابر اس میں کسی وقت، کسی آن فرق نہیں، اپنے وقت پر یہ کھیتیاں اپنے طریق پر اگ رہی ہیں۔ پیدا ہونے والے پیدا ہو رہے ہیں مرنے والے مر رہے ہیں۔ ہر ایک کا وقت مقرر ہے۔ ذرہ برابر فرق نہیں۔ موسم اپنے وقت پر آرہے ہیں سورج اپنے وقت پر نکل رہا ہے۔ چاند اپنے وقت پر نکل رہا ہے۔

لیکن ایک بادشاہت کا نظام ہے تکوینی یعنی انسان کو خود اختیار دے کر انسان سے کہا گیا ہے کہ تو چلا اس نظام کو اس میں انسان خرابی پیدا کرتا ہے اس میں اپنی بدکرداری سے اور اپنی برائیوں سے اس نظام کو چلاتا ہے بلکہ اپنے ذاتی اقتدار کا نظام بنانا چاہتا ہے اپنی بادشاہت جتانا چاہتا ہے۔ دوسروں پر اللہ کی بادشاہی کو نہیں چلاتا، اور جب کسی کے اندر جاہ پسندی آئے گی تو فطرت انسانی اسے برداشت نہیں کرے گی۔

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.o

تمہید...... پہلے اتنی بات سمجھ لیجئے کہ اس دنیا میں جو کچھ بھی کارگزاری ہے وہ حق تعالیٰ شانہٗ کی صفات کمال ہیں۔ ہر صفت کمال سے جلوہ گر ہیں اور ہر صفت اپنا کام کر رہی ہے، ان میں سے ایک صفت حق تعالیٰ کی ہے "مَلِک" ہونا کہ وہ بادشاہ ہیں، جیسے وہ معبود ہیں۔ جیسے رحمٰن اور رحیم ہیں اور جیسا کہ قدوس اور سلام اور مؤمن اور مہیمن ہیں، اسی طرح سے وہ ملک بھی ہیں، بادشاہ بھی ہیں اور ساری کائنات کے، ان کی جیسے اور صفات اس عالم میں جلوہ گر ہیں وہ اپنی اپنی کارگزاری دکھلا رہی ہیں۔

خدائی بادشاہت کی جلوہ گری ......اسی طرح سے صفت ملوکیت، بادشاہت کی صفت (ہے) جو کہ جلوہ گر ہے

اس عالم میں، اور ذرہ ذرہ میں اللہ کی حکومت، حکمرانی اور بادشاہی نمایاں ہے اور اس سے ایک نظام قائم ہے۔ یہ نظام اجتماعی فطرت اللہ ہے۔ یعنی کائنات حق تعالیٰ نے جو بنائی اور اس کو چلایا عیاذ اًباللہ کوئی بدنظمی سے نہیں چل رہا۔ بلکہ ایک نہایت ہی محکم نظام ہے اور اس کائنات کا ایک ایک ذرہ اس نظام کی بندشوں میں جکڑا ہوا ہے۔ ایک چیز بھی اپنے نظم سے نہیں ہٹ سکتی۔

نظامِ تکوین...... فرق اتنا ہے کہ ایک نظام ہے تکوینی جس کا تعلق اللہ کے افعال سے ہے یہ نظام اس قدر محکم ہے کہ اس میں ذرہ برابر کوئی فرق نہیں ہے۔ مثلاً اس کائنات میں اللہ نے سورج پیدا فرمایا، روشنی کے لیے اس کی ایک حرکت قائم رکھی اس حرکت سے رات اور دن بنتے ہیں اور پھر رات اور دن کے مجموعے سے مہینے بنتے ہیں اور مہینوں کی ایک خاص تعداد سے سال بنتے ہیں جس سے ہم سن اور مہینے اور دن گھنٹے متعین کرتے ہیں تا کہ ہمارے جتنے کاروبار ہیں یہ اس نظم کے اندر بندھے رہیں اور ضبط و انتظام کے ساتھ ہماری زندگی گذرے۔

اس سورج کی حرکت میں اور دن رات بنانے میں کبھی کوئی ادنیٰ فرق نہیں پڑا۔ یہ اللہ نے ایسی گھڑی بنائی ہے کہ جب اسے چابی دی ہے دوبارہ کبھی چابی دینے کے ضرورت نہیں پیش آئی۔ نہ اس گھڑی کی بال کمانی کبھی بگڑتی ہے نہ کبھی اس میں مرمت کی ضرورت پیش آتی ہے کہ گھٹا اور بڑھا دیں۔ ایک سلسلے کے ساتھ نظامِ عالم چل رہا ہے۔ لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِىْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِىْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ① ''نہ سورج کی یہ مجال ہے کہ کوئی جلدی کر بیٹھے'' چاند کو جا پکڑے، نہ رات کی یہ مجال ہے کہ وہ ذرا آگے تو بڑھ کر دن پر قبضہ کرلے''۔

نظام الاوقات...... دن اپنے وقت پہ آرہا ہے۔ رات اپنے وقت پہ، پھر ان رات اور دن سے یہ زمانہ بن رہا ہے، موسم بن رہے ہیں۔ یہ موسم اپنی اپنی جگہ سب محکم اور استوار ہیں، گرمی اپنے وقت پہ آئے گی۔ سردی اپنے وقت پہ ہے ، برسات اپنے وقت پہ ہے، پھر ہر موسم سے متعلق جو پھل اور پھول اور دانے ہیں وہ اپنے ہی وقت پر نکل رہے ہیں ۔ بہت سے پھل ہیں جو کہ برسات کے ہیں۔ بہت سے ہیں جو سردیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ بہت سے ہیں جو گرمیوں میں پیدا ہوتے ہیں وہ اپنے اپنے وقت پر اگ رہے ہیں اور نکل رہے ہیں، لوگوں کو ان سے فائدہ پہنچ رہا ہے۔

تقسیم اوقات...... اسی طرح سے دن بنایا تا کہ ہمارے کاروبار چلیں، تو دن کی روشنی میں ہم اپنے کاروبار چلا رہے ہیں، تجارت کے زراعت کے کارخانے داری کے اور چونکہ انسان کی قوت محدود ہے وہ خرچ ہونے سے گھٹتی اور بڑھتی ہے۔ اس لیے تعب اور تکان بھی پیدا ہوتا ہے کہ دن بھر کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو رات کا وقت رکھا اور اس کو فرمایا: وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا ② ''رات کو ہم نے سکون کا ذریعہ بنایا''۔

کہ اس میں تھکے ماندے آرام کریں اور جو سو رہے ہیں وہ پھر اگلے دن کے لیے تازہ دم ہو کر کھڑے

① پارہ: ۲۳، سورۃ: یٰس، الآیۃ: ۴۰۔ ② پارہ: ۸، سورۃ الانعام، الآیۃ: ۹۶۔

ہو جائیں اور اپنے کاروبار میں لگیں۔

حکمت اوقات......تو رات کو سکون کے لیے رکھا، دن میں بھی پانچ چھ گھنٹے کام کر کے طبعاً آدمی تھک جاتا ہے تو وقت نہار دن کا بیچ کا حصہ قیلولہ کے لیے رکھا اور اسے سنت قرار دیا گیا۔

بلکہ بعض روایات میں فرمایا گیا ہے کہ دن کے بارہ بجے جب آدمی سوتا ہے تو اس کی عقل میں اضافہ ہوتا ہے۔ آج کے تمدن میں بارہ بجے کا قیلولہ ہی باقی نہیں آج ٹھیک بارہ اور ایک بجے کھانا کھاتے ہیں، ظہر کے وقت پھر قیلولہ کا وقت تو گزر جاتا ہے کھانے کے انتظار میں اور کھانے کا وقت آتا ہے تو اس کا اثر کام پر پڑتا ہے ظہر اور عصر کے درمیان میں جو کام کر سکتے ہیں اس میں فرق پڑے گا۔ تو غرض جو کھانے کا وقت تھا وہ انتظار میں گزرا، جو کام کا وقت تھا وہ کھانے میں گذرا اور اس کے بعد جو آگے کام کا وقت تھا یا بے کاری میں گذرا، یا تعب اور تکان میں گذرا اور اس واسطے روایت میں فرمادیا کہ بارہ بجے کا وقت ہے سکون کا، اور اس میں آدمی دس منٹ آدھ گھنٹہ بھی اگر قیلولہ کرلے تو نشاط پیدا ہو جاتا ہے طبیعت میں اور جو ایک پسماندگی سی پیدا ہو جاتی ہے تھکن و تعب، وہ نکل جاتا ہے، پھر آدمی بقیہ آدھے دن کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

تو گویا رات رکھی سکون کے لیے اور دن میں بارہ بجے کا وقت رکھا سکون کے لیے......پھر تین حصوں پر منقسم فرمایا کہ دو حصے دن کے ہیں، وہ کاروبار کے لیے بیچ کا حصہ سکون کے لیے اور رات پوری سکون کے لیے اس رات میں پھر واجب نہیں فرمایا۔

اوقات مقبولہ......مگر افضلیت اس کی بیان کی، استحباب بیان کیا کہ تہجد پڑھے آدمی کہ رات بھی دو حصوں میں منقسم ہو جائے، ایک حصہ سکون و آرام کا، ایک حصہ طاعت و عبادت کا، اور وہ طاعت و عبادت کا جو رات میں وقت رکھا گیا ہے وہ سب سے زیادہ مقبول وقت ہے۔

حدیث میں فرمادیا ہے کہ آخری تہائی رات میں حق تعالیٰ اترتے ہیں آسمان دنیا پر، جیسا اترنا ان کی شان کے لائق ہے۔

وقت تہجد نزول باری تعالیٰ......وہ اترنا اس طرح کا نہیں ہے کہ جیسے ہم اوپر کے محلّہ سے نیچے کے محلّہ میں آجائیں درجہ بدرجہ سیڑھی بہ سیڑھی اترتے ہیں۔ یہ اجسام کے متعلق ہے، حق تعالیٰ شانہٗ پاک ہیں جسم سے وہ بری و بالا ہیں اس لیے ان کا اترنا انہی کی شان کے مطابق ہے اترنے کا لفظ حقیقت پر محمول ہوگا۔ لیکن کیفیت ہم نہیں جانتے کہ کس کیفیت سے اترتے ہیں۔ جیسی ان کی جناب قدوس ہے اسی انداز کا ان کا اترنا بھی ثابت رہا ہے، ہم کیفیت نہیں بیان کر سکتے۔ اتنا ہم جانتے ہیں دنیا میں کہ بہت سی چیزوں کی طرف اترنے کی نسبت کی جاتی ہے۔

کیفیت نزول......مگر ہر ایک کا اترنا اپنی شان کے مطابق ہوتا ہے، اگر آپ یوں کہیں کہ میں پانچویں محلے سے اترا اور نچلے محلے پہ آیا تو اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ایک سیڑھی ہوتی ہے جس پر درجہ بدرجہ آپ اترتے ہیں، لیکن اگر آپ یوں کہیں کہ میرے دل میں ایک مضمون اتر آیا تو کیا وہاں مضمون کے لیے بھی سیڑھی لگائی گئی؟ مضمون

ایک لطیف چیز ہے، معنوی چیز ہے، اس معنوی چیز کے اترنے کا طریقہ بھی معنوی ہے، وہ جسمانی نہیں ہوسکتا کہ جسم اترتے ہیں جسمانی سیڑھیوں سے اور معنویات اترتی ہیں معنوی انداز سے۔

آپ کہا کرتے ہیں کہ فلاں کی محبت میرے دل میں گھر کرگئی، اتر آئی تو وہ کوئی سیڑھی سے نہیں اتری، وہ اپنی شان کے مطابق اتری ہے، جیسے محبت ایک معنوی چیز ہے، ویسے ہی اس کا زینہ بھی ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات وہ ہے کہ جسم سے بھی بری ہے اور پاک اور جس کو آپ روح کہتے ہیں اس سے بھی بری اور پاک روح بھی ان کی پیدا کی ہوئی ہے اور جسم بھی ان کا پیدا کیا ہوا ہے کہ روح اور جسم دونوں محدود چیزیں ہیں اور ہر محدود چیز کچھ نہ کچھ مرکب ہوتی ہے وہ حادث ہوتی ہے اور حق تعالیٰ شانہٗ ترکیب سے بری ہیں، مرکب ہونے سے بھی بری، مجرد، ہونے سے بھی بری، لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ وَّهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۔ ①

ان کی کوئی مثال نہیں کہ بیان کی جاسکے۔ اس لیے کہ مثال جو بھی دے گا ان کے سواء، وہ مخلوق ہوگی اور خالق اور مخلوق میں زمین اور آسمان سے بھی لاکھوں گنا زیادہ فرق ہے تو ان کا مثل تو کوئی نہیں ہوسکتا، مثال البتہ ہوسکتی ہے، لیکن اگر کچھ سمجھا جائے مگر وہ مثال بھی محض فہم کے قریب لانے کے لیے بولی جاتی ہے مثال پوری طرح ان پر منطبق نہیں ہوسکتی، وہ ہر مثل سے بری، مثال سے بری ہیں تو بہر حال حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات منزہ اور مقدس ہے، ان کا اترنا آسمان دنیا پر ان ہی کی شان کے مطابق ہے، جس کو ہم نہیں جانتے، نہ ہم اس کیفیت کو بیان کرسکتے ہیں، لیکن حاصل یہ کہ اترتے ہیں اور پھر یہی نہیں کہ اتر آتے ہیں آسمان دنیا پر بلکہ انتہائی رحمت اور شفقت سے۔

مقصد نزول...... حدیث میں ہے کہ دونوں ہاتھ پھیلاتے ہیں اور وہ ہاتھ پھیلانا بھی انہی کی شان کے لائق ہے جیسا کہ ان کی جناب کے مناسب ہے اور فرمایا کہ دونوں ہاتھ کھول کر پھیلا کر فرماتے ہیں کہ اَنَا الْمَلِكُ مَنْ ذَا الَّذِیْ يَطْلُبُ مِنْهُ میں بادشاہ ہوں، کوئی ہے مانگنے والا مجھ سے اَنَا الرَّزَّاقُ مَنْ ذَا الَّذِیْ يَسْتَرْزِقُ مِنْهُ ② میں رازق ہوں، رزق دینے والا ہوں، کوئی ہے رزق کا طلبگار اَنَا الْغَافِرُ مَنْ ذَا الَّذِیْ يَسْتَغْفِرُ مِنْهُ. میں بخشنے والا ہوں کوئی ہے بخشش مانگنے والا، پھر خود فرمایا کرتے ہیں کہ مانگو مجھ سے اور گویا جھنجھوڑتے ہیں سونے والوں کہ کوئی ہے مانگنے والا، کوئی ہے پکارنے والا، پھر ایک تو یہ کہ بادشاہ کی ڈیوڑھی پر آپ خود حاضر ہوں اور جاکر اطلاع کرائیں کہ حاضر ہونا چاہتے ہیں ممکن ہے اجازت ملے، ممکن ہے نہ ملے محروم واپس آنا پڑے۔ لیکن بادشاہ عالمین خود آتے ہیں اتر کر آپ کی طرف عرش عظیم سے اتر کر آسمان دنیا پر اور یہ آسمان دنیا آپ کی چھت ہے اس دنیا کی جس کے اوپر اور آسمان ہیں سب سے نیچے آسمان ہے یہ آسمان دنیا، آسمان ودنیا......

ہی اس لیے ہی کہلاتا ہے کہ دنیا کی چھت ہے تو گویا آپ کے مکان کی چھت پر آ کر آواز دیتے ہیں کہ سونے والو! کوئی ہے مانگنے والا۔

---

① پارہ: ۲۵، سورۃ: الشوریٰ، الآیۃ: ۱۱۔ ② مسند احمد، مسند ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ ج: ۲۱ ص: ۲۸۲۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں　　　راہ دکھلائیں کسے رہرو منزل ہی نہیں

تو ایک تو یہ کہ ہم سوال کریں تو کچھ عطا فرمائیں وہ خود سوال فرماتے ہیں کہ کوئی مانگنے والا ہوتو مانگے ،ہم دینے کے لیے آگئے ۔ظاہر ہے کہ اگر اس وقت کوئی مانگے گا تو وہ سوال اور دعا خالی نہیں جاسکتی ،رائیگاں نہیں جائے گی ۔کیوں کہ بادشاہ کہہ کر دعا منگوار ہے ہیں آپ سے سوال کرار ہے ہیں خود سوال کرائیں پھر محروم کردیں اسے عقل قبول نہیں کرتی اس واسطے یہ وقت خاص مقبولیت کا ہوتا ہے۔اس وقت جو مانگا جائے ملتا ہے۔

عطا کا وقت حکمت کے مطابق ہے ......باقی کوئی آدمی امتحان لینے کے لیے جائے اللہ میاں کا کہ اچھا میں مانگ رہا ہوں تو کل کو آٹھ بج کر پانچ منٹ پر مجھے مل جانا چاہیے تو وہ آپ کے پابند نہیں ہیں۔وہ جیسے دینے والے ہیں ویسے ہی حکیم بھی ہیں ،حکمت کے تحت دیتے ہیں ۔اگر حکمت کا تقاضا ہے کہ فوراً دے دیا جائے ،فوراً منہ مانگی مراد مل جائے گی اور اگر حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ کچھ وقفہ کیا جائے تو وقفہ لگتا ہے اس میں اور اگر حکمت کا یہ تقاضہ ہے کہ وہ چیز نہ دی جائے جو آپ مانگ رہے ہیں اس سے کوئی بڑی چیز دے دی جائے تو پھر وہ دے دیتے ہیں ۔اور بعد میں آپ کہتے ہیں کہ بڑا اچھا ہوا ،کیسی قبولیت کا وقت تھا میں تو یہی مانگ رہا تھا مجھے تو اس سے زیادہ مل گئی ۔میں تو پھول مانگنے گیا تھا مجھے پورا باغ ہی مل گیا ۔میں ایک ٹکڑا مانگتا تھا وہاں پوری روٹیوں کا دستر خوان ہی مل گیا ۔تو کبھی فوراً منہ مانگی مراد ملتی ہے کبھی دیر لگتی ہے اور دیر سے ملتی ہے کبھی وہ چیز نہیں ملتی جو مانگی گئی تھی اس سے بڑھ کر دی ہے۔ یہ حکمت کے تحت ہوتا ہے آپ اپنے نفع نقصان کو نہیں جانتے ،اللہ ہی جانتا ہے آپ کے نفع نقصان کو ،تو وہ دیتا ہے، مگر آپ کی مصلحت دیکھ کر۔

اب یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسے ایک باپ لکھ پتی ہو اور بیٹا اس سے یوں کہے کہ مجھے سو روپے روزانہ جیب خرچ کے لیے آپ دیا کرو تو کبھی تو ایسا ہے، کہ باپ نے محبت میں عنایت میں آکر فوراً مقرر کردیا ،روزانہ سو روپے ملنے لگے لڑکے کو کبھی ایسا ہے کہ وہ مانگ رہا ہے مانگتے مانگتے دو مہینے گزر گئے ،لڑکے کے دل میں یہ خیال آیا کہ بس جی باپ کے دل میں کوئی شفقت نہیں رہی میری طرف سے ،نہ وہ محبت باقی رہی ،مانگ رہا ہوں دو مہینے ہوگئے کچھ بھی نہیں ملتا ۔لیکن دو مہینے کے بعد اچانک باپ نے جاری کیا سو روپے ماہوار کا وظیفہ......تو بیٹے نے کہا کہ میں تو دو مہینے سے مانگ رہا تھا ،دیا اب آپ نے ؟......

باپ کہتا ہے کہ بے وقوف !تو جگر کی بیماری میں مبتلا تھا ،جگر بڑھا ہوا تھا ،معدہ خراب تھا اگر میں سو روپے روز دیتا تو تو کھانے اڑانے میں لگا تا اور بیماری بڑھ جاتی ،اس لیے میں نے روک لیا اور علاج کیا تیرا ،بجائے اس کے کہ سو روپے میں اعلیٰ اعلیٰ چیزیں لے کر کھاتا میں نے کڑوی دوائیں پلانا شروع کیں ۔اب دو مہینے میں تیری صحت قابل اعتماد ہوگئی ۔سو روپے چھوڑ کر تو دو سو روپے روز لے لیا کر ،تیرے ہی واسطے کما رہا ہوں میں ....تو بیٹا ممنون ہوگا کہ واقعی میں اپنی ناتجربہ کاری سے نہیں جانتا تھا کہ مجھے یہ نہ ملنا چاہیے مگر باپ جانتا تھا ،اگر اس وقت

دے دیتا تو ہلاکت کے قریب پہنچ جاتا اب جبکہ مجھے اس نے دیا تو اب میں بھی اطمینان سے سو روپے خرچ کروں گا اور باپ کی خوشی کا باعث بھی ہوگا۔

عطاء کا وقت خود متعین کرنا باعث نقصان ہے......اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بیٹا مانگ رہا ہے اور مانگتے مانگتے ایک دو مہینے نہیں چار پانچ ماہ نہیں، دس بیس برس گزر گئے اور بیٹے کے دل میں یقین ہو گیا کہ باپ کے دل میں کوئی شفقت باقی نہیں ہے۔ کروڑ پتی ہے، اگر دو سو روزانہ بھی دے تب بھی کوئی بڑی بات نہیں مگر نہیں دیتا۔ معلوم ہوا بخیل ہو گیا۔ لیکن دس برس کے بعد باپ نے پچاس ہزار روپے کی تھیلی بھر کر رکھ دی اور یہ کہا کہ تو جا کر جیب میں ڈال، اگر میں تجھے سو روپے دو سو روپے روز دیتا تو کھانے اڑانے میں خرچ کر دیتا، مال ضائع ہوتا اور تیری عادتیں بگڑ جاتیں، پھر فضول خرچی کا عادی ہو جاتا تو عمر بھر یہ لت نہ چھوٹتی۔ اب اس دس برس کے اندر تجھے تجربہ پیدا ہو گیا، نفع نقصان کی خبر ہو گئی۔ اس واسطے پچاس ہزار دیتا ہوں تجارت کر لو۔ سوچھوڑ تو تو پانچ سو روپے روز کما لے گا۔ تیرا اصل مال بھی باقی رہے گا اور نفع میں سینکڑوں روپیہ روزانہ تجھے ملے گا، یہ بہتر ہے یا وہ بہتر ہے کہ سو روپے دو سو روز دیتا اور تو ضائع کر دیتا، تو بیٹا ممنون ہوگا، کہ میں اپنی غلط فہمی سے سمجھ رہا تھا کہ باپ بخیل ہو گیا، مگر وہ تو انتہا سے زیادہ سخی ہے میں اس دس برس میں اگر سو روپے روز لیتا تو اتنے بیٹھتے اور اب مجھے ایک لاکھ روپیہ مل گیا جو سو روپے میں روز میں نہ پڑتا۔ یہ میرے نفع کے لیے ایسا کیا ہے۔

حق تعالیٰ شانہٗ بھی اسی ح دیکھتے ہیں کہ اگر بندہ میں بری عادتیں ہیں، گناہ گاریاں ہیں، بدکاری کی عادت پڑی ہوئی ہے تو بعض دفعہ دولت دینے کی بجائے جو دی ہوئی ہے وہ بھی سمیٹ لیتے ہیں۔ وہ عیاشی میں مبتلا ہے تو مفلس ہو گیا اور مانگتا ہے باپ سے باپ نہیں دیتا۔ لیکن دو چار برس میں دھکے کھا کر عیاشیوں کے برے نتیجے سامنے آنے کے بعد اب اس پر منکشف ہوا کہ میں بری زندگی گزار رہا تھا، اس نے توبہ تلافی راستہ درست ہو گیا، اب باپ نے دینا شروع کر دیا کہ اب تیرے ہی لیے ہے جو کچھ ہے مگر اس حالت میں تیرے لیے مضر تھا۔

سرمائے کے جمع اور ظہور کا وقت......تو میرا مطلب یہ ہے کہ مانگنے کے بعد کبھی وہ فوراً مل جاتا ہے، کبھی دیر لگتی ہے اور کبھی دیر کے باوجود وہ چیز نہیں ملتی اس سے بڑی مل جاتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عمر بھی نہ ملی، مانگتا رہے آدھی عمر گذر گئی۔ لیکن جب انتقال کرے گا تو حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن اجر و ثواب کے عظیم ڈھیر اس کے سامنے لگے ہوئے ہوں گے عرض کرے گا کہ: ''اے اللہ! میں نے تو کوئی عمل ایسا نہیں کیا جس کا یہ نتیجہ ہوتا۔''

فرمائیں گے کہ تو مانگتا تھا، تو دعائیں کرتا تھا، تیری دعائیں ہم نے ذخیرہ کر رکھی تھیں تاکہ ہم اس وقت دیں تاکہ ابدالآباد تک تیرے لیے نفع کا باعث بنے دنیا تو گزرنی تھی گزر گئی عیش سے گزارتا جب ختم ہو جاتی مصیبت سے گزاری جب ختم ہوئی، لیکن زندگی اصل یہ ہے کہ ہم نے تیرا سرمایہ اس زندگی کے لیے جمع رکھا۔ تو اس وقت یہ کہے گا کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے میری دعا اس وقت قبول نہ کی، اب جا کر کی، وہاں میں ضائع کر دیتا اپنی عمر کو

بھی، اپنی دولت کو بھی اور یہاں میری عمر بھی دوامی بن گئی اور میری دولت بھی دوامی بن گئی۔

بلکہ حدیث میں ہے کہ بعض اہل مصیبت حسرت میں ہوں گے اس دن اور کہیں گے جب ان کے سامنے اجر وثواب کے ڈھیر آئیں گے مصیبتوں کے ثمرہ میں تو وہ کہیں گے کہ: ''اے اللہ! اس سے بڑی بڑی مصیبتیں ہم پر کیوں نہ نازل کیں آپ نے؟ اور ایسا کیوں نہ ہوا کہ قینچیوں سے ہماری کھالیں کاٹی جاتی۔ جب تھوڑی مصیبتوں پر یہ اجر وثواب مل رہا ہے تو بڑی مصیبتوں پر معلوم نہیں کیا ملتا۔''

تو بعضوں کو حسرت ہوگی کہ مصیبت کم کیوں پڑی ہمارے اوپر، زیادہ کیوں نہ آئی، اس وقت قدر آئے گی کہ یہ مصائب بھی بڑی نعمتیں تھیں۔ یہ ذریعہ بنادی گئیں ہمارے لیے ترقی درجات کا، آخرت کے درست ہونے کا۔

تو غرض آدمی جب بھی مانگے، مانگنے میں کسر نہ چھوڑے، مگر امتحان نہ لے قدرت کا کہ دیکھو! مانگ رہا ہوں، ملتا ہے یا نہیں ملتا۔

دعا کے وقت قدرت کا امتحان نہ لے...... امتحان لینا گستاخی اور بے ادبی ہے، اس میں ایسا نہ ہو کہ سرے سے دعا ہی رائیگاں کردی جائے کہ ہم سنتے ہی نہیں ایسے لاابالی شخص کی دعا۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: اِنَّ اللّٰہَ لَایَقْبَلُ الدُّعَآءَ مِنْ قَلْبٍ لَاہٍ. ① ''جو لہو ولعب میں پڑے ہیں ان کی دعا اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوتی نہ سنی جاتی''۔ جو مانگ رہا ہے اللہ سے، تخلیات میں مبتلا ہے، نہ اخلاص ہے نہ صدق ہے، نہ تضرع اور زاری اور ابتہال ہے کہ متوجہ ہوں، اس کی دعا نہیں قبول کی جاتی۔

اسی طرح سے وہ دعا بھی قبول نہیں ہوتی جس میں قیدیں اور شرطیں لگائی جائیں کہ اسی وقت ملے، فلاں ہی دن ملے، فلاں موقعے پہ ملے۔ فلاں چیز ملے۔ سائل کو اس کا کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ بیٹھ بیٹھ کر متعین کرے کہ یہ چیز دیجئو، یہ نہ دیجئو۔ یہ دعا مانگنا نہیں، یہ تو مشورے دینا ہے اللہ میاں کو کہ جیسے جب آپ دیں تو فلاں چیز دیں، جیسے حدیث میں ہے کہ ایک اعرابی نے دعا مانگی کہ: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْقَصْرَ الْاَبْیَضَ فِی الْجَنَّۃِ یا اللہ! مجھے جنت میں سفید رنگ کا محل دیجئو، وائٹ ہال دیجئو جو بالکل سفید انڈہ سا ہو۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کیا دعا ہے کہ اپنی طرف سے قیدیں لگا رہے ہو، سفید اور سرخ اور سبز، تم بنانے والے ہو جنت کے؟ تم بنانے والے ہو درجات کے؟ تمہارا مشورہ چلے گا وہاں؟ وہاں تو ایک کوڑے کے برابر بھی جگہ مل جائے تو دنیا و مافیہا سے بہتر ہے، تم قیدیں لگا رہے ہو تو وقت کی قید لگانا یا کسی نوعیت کی قید لگانا یہ بے ادبی اور گستاخی ہوتی ہے۔ اپنی ضرورت مانگے آدمی اور خوب الحاح سے مانگے، نیچا بن کے مانگے۔

دعا کے وقت استغناء نہیں بلکہ تضرع چاہیے...... اس واسطے کہ اگر یوں مانگنے لگے کہ: اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ اِنْ شِئْتَ اَللّٰھُمَّ اَعْطِنِیْ اِنْ شِئْتَ . یا اللہ! مجھے دے دیجئے اگر آپ چاہیں، میری مغفرت کردیجئے اگر آپ

① السنن للترمذی، کتاب الدعوات، باب ماجاء فی جامع الدعوات عن النبی ﷺ ج: ۱۱ ص: ۳۸۳.

چاہیں۔ تو یہ دعا مانگنا نہیں یہ تو استغناء کا اظہار کرنا ہے۔ سائل تو محتاج ہوتا ہے نہ کہ غنی، آپ جب یوں کہہ رہے ہیں اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ اِنْ شِئْتَ بخش دیں اگر آپ چاہیں، اس کا مطلب ہے کہ آپ کا دل چاہے تو بخش دیں تو بخش دیں نہیں تو مجھے تو ضرورت ہی نہیں آپ کی مغفرت کی۔ اس میں استغناء نکلتا ہے کہ سائل بھی ہو آدمی اور مستغنیٰ بھی بنے۔ یہ تو اجتماع ضدین ہے۔ اس واسطے دعا مانگنے میں سوائے عجز وانکسار کے، سوائے بندگی کے ابتہال کے اور انتہائی زاری اور تضرع کے، نہ کوئی قید ہو نہ کوئی شرط ہو۔ بس مانگے آدمی۔ اور میں کہتا ہوں کچھ بھی نہ ملے دعا مانگنے کی توفیق ملی۔ دعا بھی تو عبادت ہے۔ یہ تھوڑی چیز ملی کہ دعا منگوادی گئی آدمی سے۔ اَلدُّعَآءُ مُخُّ الْعِبَادَۃِ: ''دعا مغز اور خلاصہ ہے عبادت کا''۔ ①

اوقات مقبولہ میں غفلت سے احتراز...... خیر بہر حال یہ بات دور جا پڑے گی۔ میں عرض کر رہا تھا کہ حق تعالیٰ شانہٗ آسمان دنیا پر اترتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کوئی ہے مانگنے والا! ہم دینے کے لیے تیار ہیں جو خوش قسمت ہیں اور اس وقت جاگتے ہوئے ہوتے ہیں وہ مانگتے ہیں اور منہ مانگی مراد ملتی ہے۔ اسی طرح حدیث میں فرمایا گیا۔

اے لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے وقتاً فوقتاً قبولیت کی ہوائیں چلتی ہیں تم سب ڈھونڈتے رہو، ایسا نہ ہو کہ وہ ہوا چلے اور تم غفلت میں پڑے ہوئے سوتے رہو، ان اوقات کو ضائع نہ کرو۔ اور ضائع نہ جانے دو، بلکہ ٹوہ میں لگے رہو کون سا وقت مقبولیت کا ہے۔''

تو کچھ ساعتیں ہوتی ہیں مقبولیت کی، کچھ اوقات ہوتے ہیں قبولیت کے اس میں جب آدمی مانگتا ہے تو مانگنا بھی خود عبادت، عظیم عبادت بنتا ہے اور منہ مانگی مراد بھی ملتی ہے۔ تو یہ کہہ کر وہاں آسمان دنیا پر اترتے ہیں کہ: اَنَا الْمَلِکُ۔ میں بادشاہ ہوں۔ یعنی آپ کسی رئیس سے مانگ لیں، دو چار روپے دے دے گا، کسی بڑے جاگیردار سے مانگ لیں۔ ممکن ہے سو پچاس ہزار روپے دے دے، لیکن بادشاہ وقت جو پورے ملک کا حاکم ہے اس سے اگر مانگیں اور وہ خود یوں کہے کہ بھلا مانگو مجھ سے تو اندازہ کیجئے، کیا کچھ نہیں دے گا، بادشاہ، اور بادشاہ بھی وہ جو عالموں کا بادشاہ ہو، بادشاہوں کا بادشاہ جس کے ہاتھ میں بادشاہی کی کنجیاں ہوں وہ اگر یوں کہے کہ مانگو مجھ سے میں دوں گا تو پھر کیا کچھ نہیں ملے گا۔

ماہ رمضان کا امتیازی بدلہ...... یہی وجہ ہے کہ یہ روزہ جو ہے اس کے جہاں اور ہزاروں فضائل اور برکات ہیں۔ من جملہ ان کے بڑی عظیم برکت اور روزے کی فضیلت یہ بھی ہے کہ روزے کے بارے میں فرماتے ہیں حق تعالیٰ کہ: اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ۔ ② ''روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا'' یعنی اور طاعتوں اور عبادتوں کا بدلہ تو ضابطہ کا ہے کہ ملائکہ کو حکم دیں گے کہ ضابطہ کی اجرت تقسیم کر دو، ایک عمل کے دس عمل

① السنن للترمذی، کتاب الدعوات، باب ماجاء فی فضل الدعاء، باب منه ج: ۱۱ ص: ۲۲۱ رقم: ۳۲۹۴.

② الصحیح لمسلم، کتاب الصیام، باب فضل الصیام ج: ۲ ص: ۸۰۷ رقم: ۱۱۵۱.

ہوں تو دس گنا دے دی۔ لیکن روزے کے بارے میں فرماتے ہیں کہ روزہ میرا ہے اور میں ہی خود اس کا بدلہ دوں گا۔ یعنی ملائکہ بیچ میں نہیں خود عطا کروں گا روزہ دار کو اس کا اجر اور اس کا ثواب۔ تو روزہ فرمایا کہ میرا ہے۔

یہ اس واسطے فرمایا کہ اور عبادتوں میں امکان ہوتا ہے کہ آدمی دکھلاوے کے لیے کرے، نماز پڑھے یہ دکھلانے کو بڑا عابد زاہد آدمی ہے۔ زکوٰۃ دے یہ دکھلانے کے لیے کہ بڑا سخی داتا ہے، لیکن روزے کی کوئی شکل ہی نہیں کہ دکھلائے، وہ تو اللہ ہی کے لیے ہوسکتا ہے اور اگر روزہ رکھ کر آدمی کہتا پھرے کہ جناب میں روزہ دار ہوں تو بجائے عزت کے اور تذلیل ہوگی۔ لوگ کہیں گے کہ بھئی کسی پر احسان کیا ہے جو روزہ رکھا ہے جو ڈھول پیٹتا پھر رہا ہے کہ میں نے روزہ رکھا ہے تو جب تک آدمی زبان سے نہ کہے روزے کا روزہ ہونا معلوم نہیں ہوتا، زبان سے نہ کہے تو کسی کو پتہ نہیں چلتا۔ اور کہے گا تو اور رسوائی ہوگی، اس لیے خواہ مخواہ دم بخود رہے گا، لیکن یہ ہے کہ روزہ کسی کے سامنے ظاہر نہیں ہوتا اور جب روزہ کسی کے آگے ظاہر نہیں ہوسکتا۔ تو اس میں نہ ریا کاری کا دخل ہے، نہ سناوے کا نہ دکھلاوے کا، نہ شہرت کا۔ یہ تو خاص اللہ ہی کے لیے ہوسکتا ہے، تو چونکہ یہ عبادت خالص اللہ کے لیے ہے اس واسطے فرماتے ہیں کہ جب اس میں ریا کا دخل نہیں، دکھلاوے کا دخل نہیں۔ خالص میرے لیے ہے تو میں ہی اس کا اجر بھی دوں گا یہ ضابطہ کا اجر نہیں ہوگا۔ بادشاہ جب خود بانٹنے کے لیے بیٹھے وہ تو اپنی شان کے مطابق بانٹیں گے آپ کی حیثیت کے مطابق نہیں۔ اور اللہ کی جو شان ہے وہ لامحدود ہے تو پھر دے گا بھی اتنا کہ اس کی کوئی حد نہایت نہیں ہوگی..... تو بانٹنا جب خود چاہیں اور فرمائیں کہ میری چیز ہے، میں بانٹوں گا تو وہ تو اپنی شان کے مطابق بانٹیں گے، تو جب یہاں اخیر رات میں یہ فرمایا کہ اتر کر کہ اَنَا الْمَلِکُ میں بادشاہ ہوں۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَدْعُنِیْ ؟. ہے کوئی مانگنے والا؟ تو مانگنے والا جب مانگے گا تو اپنی شان کے مطابق اسے دیں گے، آپ کی شان کے مطابق نہیں۔ آپ کتنا ہی مانگیں وہ محدود چیزیں ہوں گی وہ جو دیں گے وہ اپنی شان کے مطابق دیں گے وہ لامحدود ہوں گی، تو برکات کی کوئی انتہا نہیں رہے گی۔ بہرحال بادشاہت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر سائل کو دیں، ہر فریادی کی فریاد سنیں اور جب خود کہیں کہ میں سننے کے لیے موجود ہوں۔ کہو، تو پھر ظاہر بات ہے کہ کیا کچھ نہیں ملے گا۔

مظلومیت کے وقت کی بدعاء..... لیکن مظلوم کے بارے میں فرمادیا کہ: **اِتَّقُوْا دَعْوَۃَ الْمَظْلُوْمِ فَاِنَّھَا تَحْمِلُ عَلَى الغمام یقول الله وعزتی وجلالی** . ''مظلوم کی بددعاء سے بچو اس لیے کہ اس کی دعا سیدھی جا کر عرش سے ٹکراتی ہے اور پھر اس کے بارے میں خود فرماتے ہیں جب مظلوم جس پر ظلم ہو رہا ہے وہ ہاتھ اٹھا کر فریاد کرتا ہے تو فوراً جواب دیتے ہیں کہ میری عزت اور جلال کی قسم :اَنْصُرَنَّکَ وَلَوْ بَعْدَ حِیْنٍ ۔ میں تیری مدد کروں گا۔ گھبرانا مت، خواہ تھوڑا سا وقت لگ جائے حکمت کے تحت۔ (1) مایوس مت ہوجانا کہ دیر لگ گئی

(1) السنن للترمذی، کتاب صفة الجنة، باب ماجاء فی صفة الجنة ونعیمها ج: ۹ ص: ۶۸.

تھوڑی سی مظلومیت چلے گی مگر پریشان مت ہونا، میں تیری مدد کے لیے پہنچا۔

ضرورت خلافت ......تو بہر حال حق تعالیٰ شانہٗ ملک ہیں ۔اور ملوکیت کے بہت سے لوازم ہیں ۔اس سورۂ مبارکہ میں اللہ کی شہنشاہی بیان فرمائی گئی ہے، اس شہنشاہی کے لوازم اور اس کے آثار اور طریقے، یہ اس پوری سورت میں ظاہر فرمائے گئے ہیں تا کہ دنیا میں جب ہم نظام قائم کریں کوئی تو اللہ کے نظام کو سامنے رکھ کر اس کے مطابق اس نظام کو چلائیں، اس لیے کہ حقیقی معنیٰ میں حکمرانی اور بادشاہت صرف اللہ کا حق ہے انسان کو بادشاہت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

اسی واسطے اسلام میں ملوکیت نہیں رکھی گئی، خلافت رکھی گئی ہے۔خلافت کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ اللہ تعالیٰ ہیں، ان کے نائب بن کر ان کے قانون کو ہم چلا رہے ہیں۔خود بادشاہ نہیں ہیں ۔اقتدار ان کا ہے۔ان کے اقتدار کے زیر سایہ ہم چل رہے ہیں۔ نظام ان کا ہے، ان کے نظام کو......ہم چلا رہے ہیں، بادشاہی ان کی ہے، ہم ان کی ڈھنڈوری پیٹ رہے ہیں، دنیا میں راج کر رہے ہیں تو ہم خود بادشاہ نہیں ہیں، ہم خود صاحب اقتدار نہیں ہیں، اقتدار اللہ کا ہے۔اس کو چلانے کے لیے دنیا میں انسان خلیفہ بنا کر بھیجا گیا ہے، اس لیے ایسے ظاہری اسماء جن سے کسی اور کے لیے اقتدار مطلق کی بو آتی ہو یا ایہام ہی ہوتا ہو اس کو ناپسند سمجھا گیا اسی لیے سب سے زیادہ بغض اور عداوت اللہ کو جس نام سے ہے وہ مَلِکُ الْاَمْلَاک یعنی شہنشاہ کا کوئی لقب اپنے لیے رکھے، کنگ رکھے اور کہے کہ وہ شہنشاہ ہے ۔یہ سب سے زیادہ اللہ کو مبغوض ہے، اس لیے کہ یہ لقب تو اس کا ہے۔وہ ہے شہنشاہ، وہ ہے دونوں جہانوں کا بادشاہ ۔تو انسان کے لیے شہنشاہی اور بادشاہت نہیں رکھی گئی، عبادت اور بندگی رکھی گئی ہے اور بندگی یہ ہے کہ اس کے نظام کو اس کا آلۂ کار بن کر، اس کا خادم بن کر چلائے، اسے خلیفہ کہیں گے، اسے نائب کہیں گے۔

نظام عالم چلانے کے لیے اوصاف شاہی ......تو اس سورت میں اللہ تعالیٰ شانہٗ نے اللہ کی بادشاہی کے اصول بیان فرمائے ہیں، اللہ کی شاہی کا نظام ارشاد فرمایا تو نظام بادشاہت میں سب سے پہلی چیز ہے بادشاہ کے اوصاف کہ بادشاہ کیسا ہونا چاہیے اور حق تعالیٰ شانہٗ بادشاہ ہیں تو شان کیا ہے، ان کی بادشاہی کی۔تو بادشاہی کے مناسب کون سی شان ہے حق تعالیٰ کی کہ جس سے بادشاہت انہیں کے لیے سزاوار ہے، دوسرے کے لیے نہیں، تو پہلی چیز ہے بادشاہ کے اوصاف اور کمالات کہ بادشاہ کس کمال کا ہونا چاہیے۔وہ جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔

دوسرے یہ کہ وہ جب بادشاہ ہے تو اس کی بادشاہت کے لوازم کیا کیا ہیں، کون کون سی چیزیں بادشاہت کے لیے لازم ہیں۔اس کے بغیر بادشاہت عالم اسباب میں نہیں چلتی۔

تیسرے یہ ہوگا کہ بادشاہت کہ ان لوازم کے آثار کیا ہیں، جس ملک میں بادشاہ، بادشاہی کر رہا ہے تو اس کی بادشاہی کے آثار کیا پڑ رہے ہیں، اچھے پڑ رہے ہیں یا برے پڑ رہے ہیں مخلوق سکون واطمینان سے ہے یا پریشانیوں اور الجھنوں میں مبتلا ہے، کیا آثار پڑ رہے ہیں؟ ان آثار کو دیکھ کر کہا جاتا ہے کہ بادشاہت بہت اونچی

ہے اس لیے سکون اور اطمینان ملک کے اندر ہے یا معاذ اللہ! بادشاہ بہت خراب ہے اس لیے کہ ملک میں تو بدنظمی پھیلی ہوئی ہے۔

تو حق تعالیٰ شانہٗ کی بادشاہت کے نظام میں ایک نظام تو ہے تکیسلی کہ جس میں انسانوں کا دخل نہیں۔ وہ ایسا منظم ہے کہ تل برابر اس میں کسی وقت، کسی آن فرق نہیں، اپنے وقت پہ کھیتیاں اپنے طریق پر اگ رہی ہیں، پیدا ہونے والے پیدا ہو رہے ہیں۔ مرنے والے مر رہے ہیں۔ ہر ایک کا وقت مقرر ہے۔ ذرہ برابر فرق نہیں۔ موسم اپنے وقت پہ آ رہے ہیں، سورج اپنے وقت پہ نکل رہا ہے، چاند اپنے وقت پہ نکل رہا ہے۔

لیکن ایک بادشاہت کا نظام ہے تکوینی یعنی انسان کو خود اختیار دے کر انسان سے کہا گیا ہے کہ تو چلا اس نظام کو اس میں انسان خرابی پیدا کرتا ہے اس میں اپنی بدکرداری سے اور اپنی برائیوں سے اس نظام کو چلاتا ہے بلکہ اپنے ذاتی اقتدار کا نظام بنانا چاہتا ہے۔ اپنی بادشاہت جتانا چاہتا ہے، دوسروں پر اللہ کی بادشاہی کو نہیں چلاتا، اور جب کسی کے اندر جاہ پسندی آئے گی، تو فطرت انسانی اسے برداشت نہیں کرے گی، جب ایک شخص یوں چاہے گا کہ میں بڑا بنوں اور دوسرے چھوٹے رہیں تو دباؤ میں آ کے، قہر میں آ کے ممکن ہے چھوٹے بن جائیں، لیکن دلوں میں نفرت ہوگی کہ اسے حق کیا ہے ہمارے اوپر حکمرانی کرنے کا؟ جیسے ہم ویسا یہ ہمارے برابر کا ہے۔ اگر کوئی یوں کہے کہ مجھے بادشاہ مانو، تو گوارہ نہیں کرے گی مخلوق، مخلوق کرے گی تو دباؤ میں، اور اگر یوں کہے کہ بھئی نہ میں بادشاہ نہ تو بادشاہ ہم سب کا بادشاہ اللہ ہے۔ قانون اس کا ہے میں تو چلانے والا ہوں، سب کے دلوں میں عظمت بیٹھ جائے گی، تو اپنی جاہ پسندی اپنے اقتدار دوسری مخلوق پر لاد نہیں سکتے، لیکن زور دباؤ میں آ کے اپنا اقتدار چلاتے ہیں۔

تو مخلوق فکر میں رہتی ہے کہ کوئی موقع پڑے تو اس کے اقتدار کو ختم کر دو، پلٹ دو، اس نے پارٹیاں بنالیں، اس نے ایجی ٹیشن شروع کیا، اس نے پبلک کو ابھارا کیا، بغاوت پھیلائی تو یہ جو بدنظمی ملک میں ہوتی ہے، اس کا سبب ہم ہیں، اللہ کی حکومت سبب نہیں۔ جہاں بلاواسطہ اس کی حکومت ہے اس میں تل برابر فرق نہیں ہاں! حکومت تمارے واسطے سے کرنا چاہتے ہیں تاکہ تمہاری عزت قائم ہو اور وہاں ہم اپنی ذاتی عزت سمجھ کر اس نظام کو بگاڑتے ہیں۔ وہیں سے بدنظمی پیدا ہوتی ہے تو بدنظمی کا ذمہ دار دنیا میں انسان ہے جہاں حق تعالیٰ شانہٗ نہیں، ان کی بلاواسطہ بادشاہت میں ذرہ برابر فرق نہیں۔

جہاں تمہیں واسطہ بنایا وہیں تم نے اپنی کدورتوں کو داخل کر دیا۔ تو نظام بگڑ جاتا ہے اس لیے اس سورت میں اصول بیان فرمائے گئے ہیں کہ نظام عالم کن اصول پر چلنا چاہیے۔ وہی اصول ہیں جو اللہ کے بنائے ہوئے اصول ہیں۔ انہی پر چلو گے، تو تمہارا نظام درست رہے گا۔ ان سے ہٹو گے درست نہیں ہوگا۔

وصف اول...... اس لیے پہلی چیز تو بادشاہ کے اوصاف۔ بادشاہ کے اندر سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ قابلیت اور لیاقت ہونی چاہیے۔ کسی جاہل کو آپ بادشاہ بنا کر بٹھا دیں۔ تو جاہل کی بادشاہت جاہلانہ ہی ہوگی اور ان جاہلانہ

چیزوں کا اثر بُرا پڑے گا تو نظم کی بجائے بدنظمی پھیل جائے گی، تو بادشاہت کے اندر خود قابلیت اور کوئی کمال ہونا چاہیے کہ جس کی وجہ سے لوگ بھی اس کے آگے جھکیں اور اس کا کام بھی چلے۔ اور وہ یہ کہ ''خیر'' جو چیز ہے وہ بادشاہ کے اندر ہونی چاہیے، اگر معاذ اللہ وہ شرور کا مجموعہ ہوا برائیوں کا، وہ برائی پھیلے گی اس واسطے کہ مثل مشہور ہے کہ: اَلنَّاسُ عَلٰى دِيْنِ مُلُوْكِهِمْ ۔ جیسا راجہ ویسی پرجہ، جیسا بادشاہ ویسی رعایا۔ اگر بادشاہ نا ہنجاز ہے تو رعایا میں بھی نا ہنجاری پیدا ہوگی۔ اگر بادشاہ کے اندر بھلائیاں ہیں تو رعایا میں بھی بھلائیاں پیدا ہوں گی رعایا تو کوشش کرتی ہے کہ بادشاہ کے قریب تر چلے۔

اوصافِ شاہی کے قوم میں آثار...... جب جنگ عظیم جاری تھی تو قیصر جرمنی نے تقریر کی اور اس نے تقریر میں چند جملے کہے تھے اس میں کہا تھا کہ اگر دنیا سے ترک مٹ جائیں تو شجاعت اور بہادری کا خاتمہ ہو جائے گا۔ جہاں بھی بہادری پھیلی ہوئی ہے وہ ترکوں کی بہادری کا اثر ہے۔ تو اگر ترک مٹ جائیں تو بہادری کا خاتمہ، اور اگر جرمنی مٹ جائیں تو سائنس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ (اس زمانے میں اول نمبر پر سائنسی ایجادات میں جرمنی کا ملک تھا۔ امریکہ اب بعد میں بنا ہے۔)

تو اس نے کہا کہ اگر ترک مٹ جائیں تو بہادری کا خاتمہ... اور اگر جرمنی مٹ جائے تو سائنس کا خاتمہ) اور اگر فرانس مٹ جائے تو عیاشی اور بے حیائی کا خاتمہ ہو جائے گا .... اور اگر انگریز دنیا سے مٹ جائیں تو ڈپلومیسی، مکاری، فریب، دغابازی ان چیزوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ تو ہر قوم کی، ہر حکمران قوم کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں۔ اور جب وہ قوم حکومت کرتی ہے تو پبلک میں وہ خصوصیت پھیلتی ہیں۔ اگر مکار بادشاہ ہے تو پوری قوم کے اندر مکروفریب اور چالاکی اور بے ایمانی اور دغل فسل؟ یہ چیزیں پھیل جائیں گی، اور اگر بادشاہ دیانتدار ہے، متدین ہے تو پوری رعایا کے اندر دیانتداری کا اثر ہوگا۔

رعیت بادشاہ وقت کا ذوق اپناتی ہے...... خلفاء بنی امیہ میں سلیمان بن عبدالملک یہ بہت بڑا اونچے درجے کا خلیفہ ہے اسے نکاح کرنے کا بہت شوق تھا، بہت جوان اور بڑا مضبوط تھا، تو شرعی حدود میں نہ رہتا اگر چار سے زیادہ بیک وقت کرتا لہٰذا) چار سے زیادہ بیویاں تو کرتا نہیں تھا، مگر چھ مہینے میں طلاق دی، مہر ادا کیا، ایک اور سے نکاح کر لیا، پھر پانچ مہینے اسے رکھا، طلاق دی، پھر تیسری سے تو سینکڑوں نکاح کیے۔

گویا جائز عیاشی کہنا چاہیے، قانون کے دائرے سے باہر نہیں ہوا، مگر سینکڑوں نکاح کر ڈالے، تو اس زمانے میں امراء جب جمع ہوتے تھے کسی مجلس میں تو پوچھا جاتا تھا کہ آپ کتنے نکاح کر چکے ہیں؟ تو اس نے کہا بیس۔ آپ نے کتنے کیے؟ میں پچاس کر چکا ہوں، تیسرے کہتے ہیں۔ میں جناب ساٹھ نکاح کر چکا ہوں ایک صاحب کہتے ہیں میں نے سو نکاح کیے ہیں اب تک، تو اس زمانے میں مابہ الفخر یہی چیز بن گئی تھی کہ کتنے نکاح کیے، اس لیے کہ بادشاہ کا طریقہ یہی تھا کہ دے نکاح پہ نکاح، دے نکاح پہ نکاح۔

تو رعیت کے اندر بھی یہی جذبہ پھیل گیا کہ یہ ہی کوئی بڑی شان وشوکت کی چیز ہے ...حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ وہ خلیفہ عادل ہیں اور تین سو نفل رات میں روزانہ ان کی ثابت ہیں ۔باقی ان حضرات کے اوقات میں اللہ برکت دیتا ہے، دن بھر تو پبلک کی خدمت میں، مقدمات فیصل کرنے میں، ملک کے تحفظ میں، بقاء میں اور رات کو تین سو نفلیں بھی ......تو کس وقت سوتے ہوں گے ،معلوم ہوتا ہے چوبیس گھنٹے عبادت میں ہی گذارتے ہیں ،تو تین سو نفلیں رات میں ثابت ہیں.......اس زمانے میں امراء میں فخر کی بات کیا تھی؟ جب کسی مجلس میں جمع ہوئے ،آپ رات میں کتنی نفلیں پڑھتے ہیں ،انہوں نے کہا بیس ،آپ کے پڑھتے ہیں ، میں تو چالیس پڑھتا ہوں، تیسرا کہتا ہے کہ میں پچاس نفلیں پڑھتا ہوں، میں سو نفلیں پڑھتا ہوں تو فخر کی بات یہ ہوگئی تھی کہ نفلیں زیادہ پڑھی جائیں تو ایک اصول ہے۔جیسا راجہ ویسی پرجا۔جیسا بادشاہ ویسی رعیت۔

خیر وبرکت والی شاہی......ظاہر بات ہے کہ جب حق تعالیٰ شانہٗ بادشاہ ہوں تو وہاں تو شر اور برائی کا نشان بھی نہیں۔اَلْخَیْرُ کُلُّهٗ مِنْکَ وَاِلَیْکَ وَالشَّرُّ لَیْسَ اِلَیْکَ. ''ساری خیر وبرکت تو اس کی ہے جہاں بھی خیر ہے وہ اس کی ہے، شر اس کے پاس نہیں پھٹک سکتی''۔نہ اس کی ذات میں ہے نہ باہر کی شر وہاں تک جاسکتی ہے۔وہ بری ہے ہر شر سے تو جب خیر مطلق بادشاہ ہوگا تو ظاہر ہے کہ عالم میں خیر پھیلے گی۔تو پہلی چیز یہ ہے کہ بادشاہ کے اندر خیر کا غلبہ ہونا چاہیے اور جب اللہ بادشاہ ہے تو وہاں خیر ہی خیر ہے، وہاں شر کا کوئی نشان ہی نہیں، پھر وہ خیر ایسی ہونی چاہیے کہ اپنی ذات ہی تک محدود نہ رہے، بلکہ وہ نکل کر دوسروں تک بھی پہنچے ،اگر اپنی ذات سے ایک شخص بہت باخیر ہے مگر دوسروں کو اس کی خیر سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا تو دوسروں کے حق میں خیر ہونا نہ ہونا برابر ہوا،لیکن حق تعالیٰ شانہٗ کی خیر یہ ہے کہ:

پورے عالم میں پھیلی ہوئی ہے ذرے ذرے کے اندر پھیلی ہوئی ہے۔اس لیے کہ بنانے والے تو وہ ہیں وجود انہوں نے دیا اور وجود ہی سرچشمہ ہے ساری خیر وبرکت کا تو جس کو وجود دیا اس میں خیر پھیلی ہوئی ہے......تو اللہ کی خیر وہ ہے جو اس کی ذات بھرپور ہے خیر سے ،اور ذرے ذرے پر خیر اس کی پھیل رہی ہے،اسی کا نام ہے شریعت کی اصطلاح میں ''برکت''

برکت کا مفہوم......برکت کہتے ہیں کہ کسی چیز کی خاصیت، بھلائی تو اس میں ہو اور وہ پھیل کر دوسروں تک پہنچے تو کہیں گے وہ شی مبارک ہے۔اگر اس میں خیر نہ ہو یا اس میں کوئی اچھا خاصہ نہ ہو اور دوسروں تک نہ جائے تو کہیں گے خیر وبرکت کی بات نہیں۔پانی ہے مثلاً اس کی خاصیت ہے،ٹھنڈک اس لیے کہ ٹھنڈا خود بھی ہے دوسروں کے دلوں میں بھی ٹھنڈک پیدا کرتا ہے اگر پانی پئیں اور ٹھنڈک نہ پہنچے تو کہیں گے کہ منحوس پانی ہے۔برکت والا پانی وہ ہے جو خود بھی ٹھنڈک ہے اور دوسروں کو بھی پہنچ رہی ہے ہوا کے اندر خیر یہ ہے کہ اس کے میں رطوبت ہے اور خیر یہ ہے کہ جہاں جہاں ہوا پہنچتی ہے رطوبت پہنچتی ہے،اگر ہوا چلے اور رطوبت کے بجائے خشکی پھیل جائے،خشک سالی

کہیں گے بڑی منحوس ہوا چلی اور اپنی خاصیت نہ دکھلائی اس نے۔

تو جس شے میں خیر چھپی ہوئی ہو اور وہ خیر دوسروں تک پہنچ رہی ہو اور اس میں روز بروز اضافہ ہی ہو اس کو کہتے ہیں ''برکت'' اس کو ظاہر فرمایا گیا کہ تَبَارَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ. برکت والی ذات ہے اللہ کی۔

یعنی وہ، وہ ذات ہے کہ ہر خیر اس میں ہے اور اس کی ہر خیر اس کی مخلوق کو پہنچ رہی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ برکت والی ذات ہے۔ اگر ساری خیر اس میں ہوتی اور مخلوق کو نہ ملتی، تو نہیں کہا جا سکتا تھا برکت والی ذات خود بھی خیر سے بھرپور اور دوسروں کو خیر پہنچ رہی ہو، وہ مبارک ذات ہے۔

خیر میں مثلاً علم بہت بڑا کمال ہے تو حق تعالیٰ شانہٗ سرچشمہ ہیں علوم کا اور اس نے ذرے ذرے کے اندر علم دے دیا ہے۔ اپنی اپنی بساط کے مطابق، تو برکت والی ذات ہے جو خود بھی علم سے بھرپور اور عالم کے ذرے ذرے میں اس کی شان کے مطابق علم بھیج دیا۔ عمل ہے تو خود بھی اس کی صناعی بے غبار اور بے داغ۔

صُنْعَ اللّٰہِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ کُلَّ شَیْءٍ. ① اللہ کی صنعت اتنی مضبوط ہے کہ اس میں انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں ہے کہ کوئی عیب نکال دے آسمان کو جو جیسا بنایا بس ویسا ہی بننا چاہیے، نہ کمی ہے نہ زیادتی، زمین کو جیسا بنایا ویسی ہی بنی چاہیے تھی، نہ کمی نہ زیادتی، زمین وآسمان کے اندر جتنا فصل ہے اتنا ہی رہنا چاہیے تھا، اس سے کم ہو تب بھی مضر تھا، زیادہ ہو تو بھی مضر تھا تو ہر چیز اپنے اپنے موقع پر فٹ اور اپنی اپنی مقدار پر ہے جس فرماتے ہیں: وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُہٗ وَمَا نُنَزِّلُہٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ : ② ''ہر چیز کے خزانے ہمارے ہاں بے انتہاء ہیں مگر ہم اتارتے ہیں عالم میں ایک مقدار اور اندازے کے مطابق''۔

جس کا تحمل کر سکے کائنات اتنا ہی دیتے ہیں، تو روشنی لامحدود ہے مگر سورج کو اتنی دی جتنا وہ برداشت کر سکے، اس کے ذریعے سے ہم تک اتنی پہنچائی کہ ہم تحمل کر سکیں۔ اگر اتنی تیز روشنی دیتے کہ ہر وقت لوگ چندھیائے رہتے اور بینائیاں زائل ہو جاتیں۔ تو کہتے کہ سورج برکت والا نہیں ...... یہ تو نحوست ہے، بینائیاں چھن گئیں تو اتنی روشنی دی کہ جس کو وہ تحمل کرے اور جس کو ہم برداشت کریں۔

چاند میں اتنی ٹھنڈک دی کہ جتنی اس کے مناسب تھی اور اتنی ہم تک پہنچائی کہ جس کو ہم برداشت کریں۔ تو خیر بھی ہے اور خیر پھیل بھی رہی ہے اور اس خیر میں اضافہ بھی ہے، مخلوق آ رہی ہے اور جا رہی ہے مگر خیر میں کمی نہیں ہے ایک سے دوسرے کو، دوسرے سے تیسرے۔ کو، تو علم کی خیر، صنعت کی خیر، عمل کی خیر، اخلاق کی خیر، یہ ساری چیزیں پھیل رہی ہیں تو ظاہر ہے کہ وہی ذات بادشاہت کے لیے مناسب اور موزوں ہو سکتی ہے جو ہر خیر سے بھرپور ہو، علم ہے تو لامحدود، صفت ہے تو لامحدود اخلاقی کمالات ہیں تو لامحدود، برکات ہیں تو لامحدود تو مبارک حقیقت میں اللہ کی ذات ہے، جس میں کچھ اثر آ جائے گا اسے کہیں گے برکت والا ہو گیا، مبارک ہو گیا دن میں ایک چیز اچھی

① پارہ: ۲۰، سورۃ: النمل، الآیۃ: ۸۸. ② پارہ: ۱۴، سورۃ: الحجر، الآیۃ: ۲۱.

ڈال دی تو کہا جاتا ہے کہ بڑا مبارک دن ہے آج ،اس میں تو بڑی بھلائیاں پہنچیں مخلوق کو۔ رات میں جو کوئی بھلائی نکل آئے ،کوئی اچھا واقعہ پیش آئے تو کہا کرتے ہیں بھئی بڑی مبارک رات تھی آج کی ، دیکھو کیسا واقعہ پیش آیا،تو مبارک وہ چیز ہوتی ہے کہ اس کے اندر خود بھی خیر ہو اور وہ خیر دوسروں کو پہنچے اور اس میں گھٹنا نہ ہو بلکہ بڑھنا ہو،اضافہ ہی اضافہ ہو اس کو''برکت'' کہتے ہیں۔

بادشاہت کی پہلی شرط...... تو جب اللہ کی ذات برکتوں سے بھر پور ہے تو بادشاہت کے لائق بھی وہی ہے،اور کوئی بادشاہی کے لائق نہیں۔اگر ہو سکتا ہے تو اس کا نائب بننے کے لائق جیسے انبیاء علیہم السلام کو مبارک بنایا،ان کے علم میں برکت،ان کے عمل میں برکت،ان کے اخلاق میں برکت،ان کے افعال میں برکت،وہ کھانا سامنے رکھ دیں،اس میں برکت کہ ایک کا دو کو،دو کا دس کو کافی ہو جائے ،برکت ہی برکت ہے ...... تو وہ نائب بننے کے لائق ہیں،بادشاہ انہیں بھی نہیں بنایا۔یوں فرمایا کہ بادشاہت ہماری ہے ہماری نیابت میں یہ حکمرانی کریں گے ......تو بادشاہ کے لیے سب سے پہلے اس کی ضرورت ہے کہ کہ وہ خیر سے بھر پور ہو،ارادے بھی اس کے نیک ہوں ،بدنیت نہ ہو،علم بھی اس کا صحیح ہو غلط نہ ہو،اخلاق بھی اس کے اونچے ہوں گھٹیا نہ ہوں،افعال بھی اس کے صحیح ہوں بے قاعدہ اور بدنظمی لیے ہوئے نہ ہوں اس واسطے کہا جائے گا کہ وہ بابرکت ہے تو فرماتے ہیں تبارک مبارک ہے اللہ کی ذات ..... کیوں کہ ساری اس میں ہے،ساری خیر اس میں ہے،ساری خیر پہنچ رہی ہے اور خیر میں اضافہ ہے،کوئی کمی نہیں ہے،تو پہلی چیز تو آ گئی کہ بادشاہ کے لیے شرط تھی کہ اس کی ذات خیر سے بھر پور ہو،اس میں برائی کا نشان نہ ہو تو تَبَارَکَ کے لفظ سے تو اپنی ذات کی نوعیت بیان فرمائی کہ برکت والی ہے اور برکت کہتے اسے ہیں کہ ہر خیر جمع ہو اور دوسروں تک پہنچے۔

بادشاہت کی دوسری شرط...... دوسری چیز بادشاہ کے لیے ضروری ہے کہ جس ملک میں حکمرانی کرے وہ قبضہ میں ہو۔اور جو قبضہ ہی سے باہر نکلا ہوا ہو یعنی حکام ہاتھ میں نہیں بدنظمی پھیل رہی ہے، بھاؤ غلط ہو رہے ہیں دَغَل فَسَل ہو رہا ہے تجارت میں،رشوتیں لی جا رہی ہیں اور حکومت کو قابو حاصل نہیں ہے تو کہا جائے گا کہ ملک اس کے قبضہ میں نہیں ہے زبردستی لیا قبضہ میں مگر حکومت اپنے قبضے کو چلا نہیں سکتی ، ہاتھ پلے کچھ نہیں پڑا،نہ پبلک کے ہاتھ پلے پڑا،نہ بادشاہ کے ہاتھ پلے پڑا اور یوں ڈگر اپنا چل رہا ہے تو چلتا رہا لیکن حقیقتاً جسے قابو میں آنا کہتے ہیں وہ وہ ہے کہ حکام کی اس پر گرفت ہو۔

ذرا ادھر ادھر نہ ہٹ سکے اور تھوڑا اٹھے تو بادشاہ کا علم وسیع ہے،تو وہ فوراً دار و گیر کرتا ہے اور سب سنبھل جاتے ہیں۔تو بادشاہ کے لیے علم کی وسعت اور قبضے اور اقتدار کی وسعت ہونی چاہیے ،اگر ملک قابو میں نہ آئے تو ظاہر بات ہے کہ حکومت نہیں چل سکتی اور چلے گی تو ظلم اور جور کی حکومت ہوگی ، بدنظمی کی حکومت،تو پہلی شرط یہ ہے کہ بادشاہ باخبر ہو۔دوسری شرط یہ ہے کہ اس کا قبضہ صحیح ہو،قابو سے نکلی ہوئی بات نہ ہو۔

شاہجہان کے ولی عہد مقرر کرنے کا قصہ...... کہتے ہیں کہ جب شاہ جہاں بادشاہ نے ولی عہد بنانا چاہا تو دو بیٹے ہیں ایک اورنگ زیب اور ایک داراشکوہ، تو داراشکوہ کے لیے شاہ جہان کا خیال تھا کہ وہ اورنگ زیب سے بھی بڑا تھا اور باوجاہت بھی، اور ملکہ بھی یہی چاہتی تھی کہ داراشکوہ ہندوستان کا بادشاہ بنے، اور عام پبلک کے لوگ بھی یہی چاہتے تھے۔

لیکن وزیراعظم کی رائے یہ تھی کہ اورنگ زیب بادشاہت کے لائق ہے، داراشکوہ بادشاہت کے لائق نہیں، ملک کو سنبھال نہیں سکے گا، اس کے قلب میں اتنی جان نہیں۔ بہر حال یہ قصہ چل رہا تھا تو وزیراعظم نے خیال کیا کہ دونوں کا امتحان کراؤں اور ساتھ میں ایک پارٹی کو لیا تا کہ جو امتحان ہو سب کے سامنے آجائے، تو اس نے سب سے پہلے داراشکوہ کے یہاں اطلاع کرائی کہ میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔

داراشکوہ نے استقبال کا سامان کیا، ملک کا وزیراعظم آرہا ہے۔ تو بڑے حشم خدم اور بڑی آؤ بھگت کے ساتھ وزیراعظم کو لایا اور اس کی شایان شان اس کا استقبال کیا اور مسند بچھائی اور اپنے برابر اس کو بٹھایا، تقریب کیا، خیر وزیر اعظم بیٹھ گیا۔ اب وزیراعظم نے کچھ سوالات کرنے شروع کیے کہ دکن میں چاولوں کا کیا بھاؤ ہے تو داراشکوہ جواب نہ دے سکا، بنگال میں کیا بھاؤ ہے؟ پتہ نہیں سونے کا کیا بھاؤ ہے؟ کچھ پتہ نہیں.......... مگر تعظیم وتکریم بہت کی، خیر وزیراعظم وہاں سے واپس آئے اس کے بعد اطلاع کرائی اورنگ زیب کے یہاں کہ میں آنا چاہتا ہوں، اس نے کہا آجاؤ۔ اورنگ زیب نے نہ کوئی استقبال کا سامان کیا جیسا اس کا مکان تھا ویسے ہی بیٹھے رہے بلکہ اور ذرا لاابالی پن میں سر ور پھیلا کر بیٹھ گئے۔ وزیراعظم آئے تو بہت استغناء تھا، کوئی تعظیم وتکریم خاص نہیں۔ اس واسطے کہ جانتے تھے اورنگ زیب کہ امتحان لینے آرہا ہے تو ممتحن کی آؤ بھگت کے معنی تملق اور خوشامد کے ہوتے کہ میں ہوں تو نہیں اس قابل مگر پاس کر دینا نمبر دے دینا۔

اورنگ زیب چونکہ خود ملک کی تمام اطراف وجوانب کا علم رکھتا تھا، اس لیے اس میں استغناء تھا اور استغناء کے ہوتے ہوئے ضرورت نہیں کہ تملق اور خوشامد کرے، تو بہت استغناء سے بیٹھا۔ وزیراعظم آئے تو خاص تکریم نہیں کی کہا:

السلام علیکم ....وعلیکم السلام !......بیٹھ جاؤ!.....اب اس نے پوچھنا شروع کیا، تو اس نے چار ہی سوال کیے اورنگ زیب نے پورے ملک کی حقیقت بتلا دی کہ فلاں جگہ یہ بھاؤ ہے، فلاں جگہ حکام بدنظمی میں مبتلا ہیں اور فلاں جگہ عدل وانصاف ہو رہا ہے۔ فلاں حاکم صاحب ہیں، اس کی ذہنیت ایسی اور اس کی ذہنیت ایسی ....اور اس کی ذہنیت ایسی۔ الغرض پورے ملک کا ایک نقشہ کھینچ دیا، اب یہ بے چارہ چپ! اسے تو خود اتنی معلومات نہیں تھیں۔ حالانکہ وزیراعظم تھے، جتنی اس شہزادہ کو معلوم تھیں۔

شاہ جہاں کے پاس آئے، شاہ جہاں نے پوچھا کیا اثر لے کر آئے، اس نے کہا جہاں پناہ تو یہ چاہتے ہیں کہ

بادشاہ داراشکوہ ہو۔اور اللہ یہ چاہتا ہے کہ اورنگ زیب بادشاہ ہو اور اللہ ہی کا چاہا پورا ہوگا۔اس کے بعد حالات سنائے،تو بات وہی تھی کہ جو قابو پاسکے ملک پر وہی بادشاہ بنانے کے لائق ہے اور قابو وہ پائے گا جس کا علم صحیح ہو،علم کے وسائل صحیح ہوں کہ کہاں کیا چیز گزر رہی ہے؟ رعایا میں بے چینی ہے، بدنظمی ہے،سکون ہے،امن ہے، بدامنی ہے، حکام ظلم تو نہیں کر رہے،تاجروں کو دیکھا جائے کہ بلیک میں تو مبتلا نہیں ہیں، نفع خوری میں تو مبتلا نہیں ہیں، حکام رشوت ستانی میں تو مبتلا نہیں تمام چیزوں کی اطلاع ہو۔

اور علم ہونے کے بعد قدرت اور قوت بھی حاصل ہو کہ طاقت سے ان کو برائی سے ہٹایا جاسکے،اگر قبضے میں ہی نہیں ملک تو حکومت نہیں چل سکتی،اس لیے حق تعالیٰ نے پہلی تو اپنی ذات کی شان فرمائی۔

تَبَارَکَ... مبارک ذات ہے جس میں ہر خیر جمع ہے۔

ہر خیر کا سرچشمہ ہے اور اس سے خیر پھیل رہی ہے......اور دوسری شان یہ ہے کہ اَلَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْکُ۔ اس کے ہاتھ میں ملک ہے۔ذرا برابر ادھر ادھر نہیں چل سکتا۔ممکن نہیں ہے کہ اس کی منشاء کے خلاف کوئی چل جائے،ٹھیک ٹھیک اس کی منشاء پر چلے گا،جو قضاء وقدر اس نے کر دی دنیا اس کی پابند ہے،کائنات پابند ہے سارے جہان مل کر اسی کے اردگرد گھومیں تو بِیَدِهِ الْمُلْکُ

بادشاہت کی تیسری شرط......اور تیسری چیز فرمائی کہ: وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ . ہر چیز پر وہ قادر ہے۔

اور جب قدرت اسے ہر چیز پر حاصل ہے،اقتدار ہر چیز پر حاصل ہے تو با اقتدار کوئی چوں نہیں کرسکتا،اسے تو ڈر ہوگا کہ کہیں مجھے معزول نہ کر دے تو تین وصف بیان فرمائے،ایک برکت اور ایک قدرت (قبضہ) اور ایک چیز اپنا اقتدار،تو تین چیزیں انتہائی ضروری ہوتی ہیں حکومت کے لیے۔یہ لامحدود طریق پر اسی کی ذات میں موجود ہیں تو بادشاہت کے لائق بھی اس کی ذات ہے۔

سورۃ ملک کے دیگر نام......یہ سورۂ ملک ہے جس کی تفسیر شروع کی گئی ہے۔اس سورۃ کا نام ''سورۂ مَانِعَۃ'' ہے اور سورۂ مُنْجِیَہ بھی ہے۔مانعہ اس لیے کہتے ہیں کہ یہ عذاب قبر کو منع کرتی ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ قبر بیتِ ظلمت ہے،اندھیریوں کا گھرانہ ہے، یہاں تاریکی کے سوا کسی اور چیز کا نشان نہیں۔اور سورت تَبَارَکَ الَّذِیْ یہ قبر کی روشنی ہے، یا اس کا پڑھنے والا قبر کی روشنی مہیا کرتا ہے۔

اسی واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ روزانہ سوتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم تَبَارَکَ الَّذِیْ اور الٓمّٓ سَجْدَۃ یہ دونوں سورتیں آپ پابندی کے ساتھ تلاوت فرماتے تھے اور یہ بھی فرمایا کہ یہ دونوں سورتیں قبر کی روشنی ہیں۔اس لیے اس سورۃ کا نام رکھا گیا ''مَانِعَۃ ''یعنی مانعت ظلمت،تاریکیوں کو دفع کرنے والی اور قبر میں اندھیری کوٹھڑی کو ایک روشن میدان بنا دینے والی ہے۔اس وجہ سے بھی کہ اس کی تلاوت کا خاصہ طبع نورانی ہے تو گویا تاریک قبر اس کی تاثیر سے روشن ہو جائے گی۔

کمال مملکت......اس کا نام سورۂ ملک بھی ہے جس میں اللہ کی حکومت کے اصول بیان فرمائے گئے ہیں اور اللہ کی حکومت لامحدود ہے، سارے جہانوں میں اسی کی حکومت ہے تو ملک کی اندر وسعت داخل ہے۔ ملک کہتے ہی اس کو ہیں کہ پھیلا ہوا ہو، پھیلا ہوا نہیں ہوگا تو اسے ہم صوبے کی حکمرانی اور ریاست کہیں گے، اور تنگ ہو جائے گی تو اسے ضلع کی حکومت کہیں گے، اور تنگ ہو جائے گی تو اسے قصبے کی حکومت کہیں گے...اور تنگ ہو جائے گی تو اسے قبیلے کی حکومت کہیں گے، اور زیادہ تنگ ہو جائے گی تو اسے گھر کی حکومت کہیں گے تو حکمرانیوں میں ملک کی حکومت سب سے زیادہ وسیع ہے۔ اور اللہ کا ملک ہی ساری کائنات میں پھیلا ہوا ہے، جہاں غیر اللہ کی حکمرانی ہے وہ (بھی) سب اسی کا ملک ہے اسی لیے اس کی وسعت کی کوئی حد و نہایت نہیں، اس ملک میں عالم دنیا بھی داخل ہے اور دنیا کہتے ہیں دنی کو یعنی خسیس اور ذلیل کو، تو سب سے زیادہ ذلیل عالم یہ ہے اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ اِنَّ الدُّنْیَا لَا تَزِنُ عِنْدَاللّٰہِ جَنَاحَ بَعُوْضَۃٍ. ① کہ پوری دنیا مل کر اللہ کے یہاں اتنی بھی وقعت نہیں رکھتی جیسے مچھر کی ایک ٹانگ ہوتی ہے:۔ تو یہ بے وقعت عالم ہے۔

کمال قدرت......یہ اس کی قدرت کا کمال ہے کہ اس بے وقعت عالم میں ایسے افراد پیدا کیے کہ وہ سارے جہانوں پر اپنے کمالات کے سبب سے بڑھ جائیں....تو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اس سے اس دنیا کو اظہار قدرت کے لیے بنایا۔ اگر انسان کو پیدا کرتے اور وہ فرشتوں میں رہتا تو وہاں اگر نورانیت ہوتی تو زیادہ عزیز بات نہ سمجھی جاتی اس لیے کہ فرشتے بھی نورانی ہیں، ان کا ملک بھی نورانی، وہ خود بھی ایمانی ملک ہے، وہاں کفر کی کھپت ہی نہیں۔

وہاں غلاظت نہیں، نجاست نہیں، صاف ستھرا ملک ہے، پاک وصاف، تو اس میں رہ کر انسان ترقی کرتا تو قدرت کا پوری طرح سے نمونہ ظاہر نہ ہوتا۔ لیکن لا کر رکھا انسان کو اس جہان میں کہ یہ گندگیوں کا عالم ہے، ہر طرف نجاست حتیٰ کہ انسان کی پیدائش بھی نجاست سے، ایک گندے قطرے سے ہے۔

پھر اس گندے قطرے کو پرورش دیتے ہیں، نو مہینے تک ایک گندے عالم میں جسے رحم مادر کہتے ہیں جو ماسوائے حیض اور گندے پانی کے اور کچھ نہیں، غذا انسان کی وہ گندی، حیض کا خون بند ہو جاتا ہے وہ غذا بنتا ہے۔ اسی سے اجزاء بنی آدم کے بنتے ہیں...نہایت ہی ظلمانی عالم ہے، نہ اس میں روشنی ہے، نہ چمک، سوائے اندھیریوں کے اور پھر اندھیریوں میں بھی تین اندھیریاں فرمائی گئیں۔ یَخْلُقُکُمْ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّھٰتِکُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِیْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ② "تمہیں ہم نے پیدا کیا ہے ماں کے پیٹ میں دور بہ دور یعنی تمہاری خلقت میں مختلف دور آئے ہیں"۔

کبھی انسان نطفہ ہے، بنص حدیث چالیس دن گذرنے کے بعد خون کی بوند بن گیا، پھر چالیس دن گذرے تو ایک مضغۂ گوشت بن گیا......پھر چالیس دن گذرے تو اس میں ہڈیاں پہنا دی گئیں، پھر چالیس

---

① الحدیث اخرجه الامام الترمذی فی سننه ولفظه: لو کانت الدنیا تعدل عندالله جناح بعوضة ماسقی کافراً منها شربة ماءٍ ج:۸ ص: ۲۹۹. ② پارہ: ۲۳، سورۃ: الزمر، الآیة: ۶.

دن گزرے تو کھال بنادی گئی، اس کے بعد روح ڈالی جاتی ہے.....تو پیدائش بھی گندے قطرے سے، غذا بھی گندی، مکان گندا اور وہ مکان بھی اندھیرا اور اندھیریاں بھی تین، ایک اندھیری کوٹھڑی کہ ماں کا پیٹ ہے اس میں کوئی چمک نہیں، کوئی نورانیت نہیں اس اندھیری کوٹھڑی میں ایک اور اندھیری کوٹھڑی ہے جس کو رحم مادر کہتے ہیں۔ یہ اس سے بھی زیادہ تنگ اور تاریک ہے، اور اس میں پھر ایک اور اندھیری کوٹھڑی ہے وہ ہے مشیمہ وہ جھلی جس میں لپٹا ہوا بچہ پیدا ہوتا ہے اور دایہ اس کو کاٹ کر بچے کو نکالتی ہے۔ تو ماں کا پیٹ، اس میں رحم مادر، رحم مادر میں وہ مشیمہ یعنی وہ جھلی، تو تین اندھیری کوٹھڑیوں میں انسان کو بنایا اور گندے قطرے سے بنایا اور گندی غذا سے بنایا اس گندے انسان کو جب پاک بنایا تو اتنا پاک بنایا کہ فرشتوں سے بھی بازی لے گیا، تو اس میں اللہ کی قدرت کا نمونہ ظاہر ہوتا ہے۔ اگر انسان کو جنت ہی میں رکھتے اور وہیں ترقی دیتے تو کوئی زیادہ کمال نہ سمجھا جاتا۔

ایک پاک عالم، نورانی عالم اس میں اگر نورانی مخلوق بن گئی تو یہ بننا کوئی تعجب انگیز نہیں، عجیب چیز یہ ہے کہ ظلمتوں میں سے، گندگیوں میں سے پاک باز انسان نکالا، تو اس سے خدا کی قدرت کا نمونہ ظاہر ہوتا ہے، پھر اس کو لاکر رکھا دنیا میں کہ دنیا میں خود گندگی، کھانا پینا، بول و براز، نجاست اور گندگی اس سب کے اندر رہ کر پھر انسان پاکباز بنتا ہے۔ تو اللہ کی قدرت کا نمونہ ظاہر ہوتا ہے۔

سورۃ ملک میں وسعت قبر اور مانع عذاب قبر ہونے کی تاثیر کیوں ہے؟......تو ملک حق تعالیٰ کا یہ ساری کائنات ہے، اس میں کم تر عالم یہ دنیا ہے اس سے بڑے بڑے عالم ہیں:

تاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

ایک ایک ستارے کو دیکھو، سورج کو دیکھو، آج کل کی تحقیقات کے مطابق چار کروڑ گنا بڑا ہے زمین سے، یعنی چار کروڑ زمینیں بن سکتی ہیں اس میں اور یہ چھوٹا ستارہ ہے اور بڑے بڑے ستارے ان گنت ہیں، ان کی بڑائیوں کی کوئی انتہا نہیں، پھر ان کے اوپر آسمان ہیں سات، ان کے اوپر جنتیں ہیں سو (۱۰۰) اور ان کے اوپر پھر عظیم الشان دریا ہے کہ جس کی ایک ایک موج پورے آسمانوں اور زمینوں کے برابر ہوتی ہے اس کے اوپر عرش عظیم ہے اور کرسی ہے۔

تو حق تعالیٰ بادشاہ ہیں اور شہنشاہ ہیں، فقط ایک ملک کے نہیں ہفت اقلیم کے نہیں۔ صرف دنیا جہان کے نہیں بلکہ کروڑوں جہانوں کے بادشاہ ہیں اور اتنی بڑی بادشاہت میں کوئی ذرہ بھی بغیر ان کی مشیت کے، اور ان کے حکم کے اور اذن کے حرکت نہیں کر سکتا۔ تو ملک کے اندر وسعت داخل ہے اللہ کے ملک میں تو کوئی حد وسعت کی نہیں۔ اس سورۂ ملک میں کیونکہ اللہ کے ملک کی وسعت بیان کی گئی ہے۔ اس واسطے کہ اس میں خاصیت یہ ہے کہ یہ وسیع کر دیتی ہے قبر کو یہ قبر کو اتنا وسیع بنا دیتی ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے: مؤمن جب سوال و جواب میں پورا اترتا ہے تو اس کی قبر وسیع کی جاتی ہے... اتنی وسیع کہ تا حد نظر وہ میدان ہی میدان باغ و بہار نظر آتا ہے۔

تو تنگ جگہ کو اتنا وسیع بنا دیا کہ حد نظر تک وہ وسعت محفوظ ہوتی ہے اور حد نظر حسی تو یہ ہے کہ آدمی جب لیٹتا ہے

تو ایک دم اس کی نگاہ آسمان تک پہنچ جاتی ہے...

بہر حال وسعت نظر اتنی ہے کہ وہاں تک پہنچتی ہے یہ حسی نظر ہے اور وہاں کی نظر روحانی ہوتی ہے وہ اس سے بھی زیادہ دور تک پہنچتی ہوگی۔ تو قبر کو اتنا بڑا عالم بنادیتے ہیں کہ وہ دنیا سے بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے تو گویا اس سورۃ کو ''مانعہ'' کہا گیا ہے کہ وہ ظلمت کو روکتی ہے اور اتنی نورانیت پیدا کرتی ہے کہ تا حد نظر نور ہی نور نظر آتا ہے، تو ''مانعہ'' اس بناء پر فرمایا گیا ہے۔

اس سورۃ کے منجیہ نام رکھے جانے کی وجہ...... اور اس سورۃ کا دوسرا منجیہ نام ہے، یعنی نجات دینے والی تو عذاب قبر سے بھی نجات دیتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ بائیں طرف سے عذاب آتا ہے تو روکتی ہے، دائیں طرف سے آتا ہے تو روکتی ہے اور اوپر سے، نیچے سے، غرض چہار طرف سے روکتی ہے تو بندے کو عذاب قبر سے نجات دے دیتی ہے۔ تنگی سے نجات دیتی ہے ظلمت سے نجات دیتی ہے، عذاب سے نجات دیتی ہے، اس واسطے اس کا نام منجیہ بھی ہے۔

برکات در برکات ...... اور ملک اس واسطے اس کا نام ہے کہ اللہ کی شہنشاہی کے اصول اس میں بیان فرمائے گئے ہیں تا کہ دنیا میں اسی انداز سے ہم نظام قائم کریں اور خلیفۃ اللہ بن کر اللہ کی حکومت کو دنیا میں پھیلائیں۔ اس واسطے اس کا نام ملک ہے۔ میں نے جو عرض کیا تھا کہ ملک میں سب سے پہلے چیز جو آتی ہے وہ ہے بادشاہ کی ذات، اس کے بعد بادشاہ کی صفات آتی ہیں۔ اس کے بعد بادشاہ کے افعال آتے ہیں۔ اور اس کے بعد افعال کے آثار کہ اس سے ملک میں اس کی حکومت کے کیا اثرات پھیلے۔

اس میں سب سے پہلے تو اللہ کی ذات کو بیان کیا گیا ہے ''تبارک'' کے لفظ سے کہ بڑی مبارک ذات ہے، برکت والی ذات ہے تو برکت کے معنی میں نے یہ عرض کیے تھے کہ ساری خیر کا مجموعہ اور پھیلنے والی خیر تو خود ذات بادشاہ خیر کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ اور اس سے خیر پھیلتی ہے تو جہانوں میں پھیل رہی ہے، ولادتیں ہو رہی ہیں، حیات ہو رہی ہے، زندگی ہو رہی ہے۔ زندوں میں سے زندہ پیدا ہو رہے ہیں۔ پھر ان میں سے اور پیدا ہو رہے ہیں انسان میں سے انسان، پھر انسان کی ضرورت کے لیے جانور بنائے۔ تو جانور میں سے ایک جانور اس میں سے دوسرا، اس میں سے تیسرا، کروڑوں جانور پیدا ہو رہے ہیں۔ پھر انسان کی ضرورت کے لیے مثلاً درخت اور نباتات ہیں تو درختوں میں یہ برکت کہ ایک درخت میں قلم لگایا تو دوسرا، دوسرے سے تیسرا، تیسرے سے چوتھا، لاکھوں کروڑوں، اربوں، کھربوں درخت بنتے چلے جا رہے ہیں۔ جمادات کو دیکھو کہ پہاڑ ہیں، پہاڑوں میں پتھر ہیں، پتھر بڑھ بڑھ کر پہاڑ بن گئے ہیں۔ ریت جمع ہوا وہ پہاڑ ہوگیا، پہاڑوں میں سے پہاڑ نکلتے چلے جا رہے ہیں تو برکت والے ہونے کا یہ مطلب ہے کہ بادشاہ عالمین کی ذات بھی بابرکت کہ ہر خیر کا مجموعہ اور سرچشمہ اور اس برکت کے آثار اتنے کہ برکت در برکت پھیلتی چلی آ رہی ہے، ملک بھر میں برکات کا ظہور ہے۔ تو اللہ کی ذات یعنی بادشاہ بحیثیت ملک اور بادشاہ ہونے کے اس کی شان یہ ہے کہ وہ خیر کا سرچشمہ اور پھیلنے والی خیر ہے۔ اسی کو کہتے ہیں ''برکت

''کہ خود ذات میں بھی خیر اور اور وہ پھیلے اتنی کہ کوئی انتہا نہ ہو، تو اللہ سے مبارک کس کی ذات ہے؟ برکت والی کس کی ذات ہے؟ تو فرمایا: ''تبارک'' بڑی برکت والی ذات ہے جدھر دیکھو برکت پھیل رہی ہے۔ پھر فرمایا کہ اَلَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ اس کی ذات وہ ہے، جس کے قبضے میں ہے ملک۔ اور ملک چھوٹا موٹا نہیں۔ کروڑوں، اربوں، کھربوں جہان ہیں۔ اور ان کی یہ شاخ در شاخ برکات سب اس کے قبضے میں ہیں کوئی ذرہ بھی نہیں ہل سکتا کہ جب تک کہ اس کی مشیت نہ ہو، تو قبضے کا یہ عالم ہے ملک کے اوپر۔

پھر نظام حکومت بھی ہے کہ جو چیز جس طرح بنادی وہ اسی محور پر گھوم رہی ہے۔ سورج چاند ہے، زمین ہے، اپنے ایک مرکز کے ارد گرد سارے اس کے افعال چکر کھا رہے ہیں۔ حرکت کر رہے ہیں۔ تو بِیَدِہِ الْمُلْکُ ساری چیزیں اس کے قبضے میں ہیں۔ نظام اس کے قبضے میں ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب نظام پر بادشاہ کا قابو ہے تو ذرہ نہیں ہل سکتا۔ تو اس کی مملکت کتنی پر امن ہوگی، کتنی بابرکت ہوگی۔

عالمی بے برکتی کے عوامل...... اب جو بے برکتی پیدا ہوتی ہے (تو اس کی وجہ یہ ہے) کہ جہاں انسان کا دخل آ گیا ہے (اسے حکم تو دیا گیا تھا) کہ تو ہمارے نمونہ پر چل، وہ اپنی حرص وہوا سے اپنا ذاتی اقتدار چاہتا ہے اور اللہ کے اقتدار کو بھول کر اپنا ذاتی اقتدار قائم کرتا ہے۔ اس کی طاقت کو فراموش کر کے اپنی طاقت پر غرہ کرتا ہے۔ جب وہ اپنی طاقت پر غرہ کرے گا، دعویٰ کرے گا۔ دوسرے اس کے مخالف بنیں گے تو ملک میں بدنظمی پھیلے گی، اگر وہ اپنی جاہ چاہے گا تو ہر انسان جاہ پرست ہے، وہ بھی جاہ کی طرف چلے گا اگر دو نگاہیں جمع ہوں گی تو ٹکرائیں گی، ایک دوسرے کو گرانا چاہے گا، وہیں سے فتنہ وفساد پھیلے گا۔ تو جہاں پر حق تعالیٰ کی تکوینی حکومت ہے اس میں کوئی بدنظمی نہیں، ہر چیز اپنے محور پر چل رہی ہے اور جہاں تکمیلی چیز آئی جس میں انسان کو واسطہ بنایا تو اگر انسان درست، پاکیزہ ہیں، تب تو اللہ کے نظام کو چلائیں گے، جیسے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں کہ ذرہ برابر ان کے دلوں میں اپنی ذات کا اقتدار نہیں ہوتا۔ حالانکہ اللہ نے انہیں سب سے زیادہ بااقتدار بنایا ہے، اپنی ذات کے بارے میں انبیاء علیہ اسلام کو جاہ پسندی کا خطرہ بھی لاحق نہیں ہوتا اسی طرح سے جو انبیاء کے بلاواسطہ متبعین ہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین وہ بھی اسی انداز پر اللہ کی حکومت کو چلاتے ہیں کہ ان میں نہ جاہ پسندی ہے۔ نہ مال پسندی ہے نہ مال کی محبت، نہ جاہ کی محبت۔ فقط جاہ ہے تو اللہ کے سامنے ہے، ملک ہے تو اللہ کے سامنے ہے، اپنے کو خادم کی حیثیت سے رکھتے ہیں ان کے دل میں قطعاً نفسانیت کے وسوسے نہیں ہوتے کہ ہم کوئی چیز ہیں۔

نظام حکومت میں تزکیہ کے آثار...... حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے کہ تنہائی میں ایک دفعہ بیٹھے ہوئے تھے یہ بھی نہیں کہ کوئی سامنے ہو کہ دکھلانے کو کہہ رہے ہوں، تنہائی میں بیٹھے ہوئے ہیں حیرت سے بیٹھے ہوئے ہیں، اپنے کو خطاب کر کے: بَخٍ بَخٍ یَاابْنَ الْخَطَّابِ اَصْبَحْتَ اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ . ① حیرت ہے اے

① كتاب الزهد لابن ابی عاصم، زهد عمر بن الخطاب رضی الله عنه ج: ۱ ص: ۱۱۵.

عمر تو امیر المؤمنین؟ تیری بھی یہ قابلیت ہے کہ تو خلیفہ بنایا جائے (امیر المؤمنین بنایا جائے) اس درجہ بے نفسی کہ تنہائی میں بیٹھ کر حیرت میں ہیں کہ مجھے کس طرح خلیفہ بنادیا۔ مجھ میں تو یہ لیاقت نہیں تھی۔

تو ان لوگوں کے قلوب اتنے پاک اور صاف ہیں کہ سلطنت اتنی بڑی کہ سلاطین عالم کانپتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام لے کر......اور خود حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کو دیکھو تو ان کے دل میں خیال بھی نہیں کہ میں کوئی چیز ہوں۔ حیرت سے خود ہی کہہ رہے ہیں کہ تو امیر المؤمنین........؟

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ امیر المؤمنین ہیں اور بلا واسطہ خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، لیکن قلب کی صفائی اور تزکیہ کا یہ عالم ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ تنہائی میں بیٹھ کر اپنی زبان باہر نکال کر ایک ہاتھ سے پکڑا، دوسرے ہاتھ سے اسے لکڑیاں مارتے ہیں اور یہ کہتے ہیں: هٰذِهٖ اَوْرَدَنِیْ الْمَوَارِدَ. ① یہ زبان ہے جس نے مجھے مصیبتوں میں مبتلا کیا ہے، مصائب میں پھینکا اور ہلاکتوں میں ڈالا۔ خدا جانے میری زبان کیا بکواس کرتی ہو، کیا چیزیں کہتی ہو، میرے عمل کہیں ضائع نہ ہو جائیں، اس درجہ بے نفسی کا عالم ہے کہ زبان پر اعتماد نہیں کہ کوئی کلمہ خلافِ شرع نہ نکل جائے، کوئی جھوٹ نہ نکل جائے، تو زبان کو لکڑیاں مار رہے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک دن مجلس مبارک میں بیٹھے ہوئے تھے اور اس دن کچھ ذرا سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے، کپڑا کوئی کم خواب کا نہیں تھا، کوئی اعلیٰ نہیں تھا، یہی معمولی زمینداروں کے کپڑے، بیٹھے بیٹھے ایک دم گھبرا کر فرمایا کہ قینچی لے آؤ۔ قینچی لائی گئی۔ تو ایک آستین یہاں سے کاٹ دی اور ایک یہاں سے کاٹ دی، بدہیئت بنا دیا کرتے کو، لوگوں کو حیرت ہوئی۔ عرض کیا کہ:

امیر المؤمنین! ایک اچھے خاصے کرتے کو آپ نے خراب کر دیا، بدہیئت بنا دیا، اگر آستین برابر کاٹ دیتے تو چلو نیم آستین ہی کا کرتا ہو جاتا۔ ایک ہیئت تو رہتی، ایک کو تو مونڈھے سے کاٹ دیا، ایک کو آدھے سے کاٹ دیا۔ فائدہ کیا ہوا؟۔

فرمایا: کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب آدمی کپڑا پہن کر اترانے لگتا ہے تو غضب خداوندی اس پر اترتا ہے اور منڈلانے لگتا ہے۔ اگر توبہ نہ کی تو غضب آپڑتا ہے، توبہ کی تو غضب واپس ہو جاتا ہے۔

تو یہ کپڑا پہن کر میرے دل میں اتراہٹ کا وسوسہ گزرا کہ میں بھی کوئی چیز ہوں۔ میں نے دیکھا کہ غضب الٰہی اوپر آرہا ہے اس لیے میں نے گھبرا کر قینچی منگوائی، بدہیئت بنایا، جس سے میرے قلب کا وسوسہ دور ہو گیا اور غضب خداوندی اوپر واپس ہو گیا۔ تو جن لوگوں کی یہ کیفیت ہو کہ اپنے نفس کے بارے میں انہیں خطرہ بھی نہ گزرے کہ ہم کوئی چیز ہیں۔ وہ تو اللہ ہی کی حکومت چلائیں گے، اپنی حکومت نہیں چلائیں گے، نہ جاہ کے خطرات ہوں نہ مال کی محبت ہو۔

حکومت کی اہلیت...... حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک دن خزانے میں تشریف لے گئے تو سونے اور چاندی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، خراج کی رقمیں اور فیئے کی رقمیں اور جزیہ کی رقمیں بھری ہوئی تھیں تو دیکھ کر فرمایا: **یا دنیا غری**

① مؤطا مالک، باب ماجاء فیما یخاف من اللسان ج:۲ ص:۹۸۸ رقم:۱۷۸۸۔

غیری اے دنیا! دھوکہ میں کسی اور کو ڈالنا، ہم تیرے دھوکے میں آنے والے نہیں ہم رکھنے والے نہیں ہیں۔ اور یہ کہہ کر حکم دیا کہ تقسیم غربا میں شروع کرو، صبح سے شام تک پورا خزانہ خالی ہوگیا اور یہ کہہ کر واپس ہو گئے یَا دُنْیَا غَرِّیْ غَیْرِیْ دھوکا کسی اور کو دینا اے دنیا! ہم تیرے دھوکہ میں آنے والے نہیں نہ ہم اتراہٹ میں آنے والے ہیں نہ کبر و رعونت میں۔ تو جن لوگوں کے قلوب اتنے صاف تھے کہ نہ محبت مال کا نشان، نہ محبت جاہ کا نشان، وہی اہل اور احق تھے کہ اللہ کے نائب بنیں اور اس کی حکومت چلائیں۔ تو جہاں تکمیلی حکومت ہے یعنی انسانوں کے واسطے سے حکومت ہے، اگر ایسے انسان ہوں تو وہ حکومت پاکباز ہے، اس حکومت میں امن ہے، امان ہے، برکات ہیں، خیر ہے، ساری چیزیں ہیں، لیکن اگر دوسری قسم کے انسان آجائیں جو اللہ کے اقتدار کو چھوڑ کر اپنا ذاتی اقتدار چاہیں، بجائے بندگی کرنے کے خدائی شروع کریں مال کی محبت میں غرق ہوں ....اور خود غرضی کی وجہ سے مال بٹورنے کی فکر میں ہوں تو رعایا کا ناس ہوگا۔ ظاہر ہے ملک کے اندر بدنظمی پیدا ہوگی، تو یہ بدنظمی، اللہ کی حکومت میں نہیں ہے۔ اس نے اپنی حکومت میں جب انسان کو واسطہ بنایا تو اس انسان نے بدنظمی پھیلائی۔

جب تک وہ انسان رہے جو غیر محبِّ جاہ اور غیر محبِّ مال تھے جنہوں نے خالص اللہ کی حکومت دنیا میں کی، اور جب ایسے آگئے جن کے قلوب صاف نہیں تھے نہ مال کی محبت سے بری تھے، نہ جاہ کی محبت سے، وہیں آکر خرابی واقع ہوئی۔ تو اللہ نے بتلا دیا کہ حکومت تو ہماری ہے، مگر کوئی اس کو ڈھنگ سے چلاتا ہے اور کوئی بے ڈھنگے پن سے چلاتا ہے، مگر چلوائیں گے تمہارے ہاتھ سے تاکہ نظام تمہارے ہاتھوں قائم ہو، اگر ہمارے ہاتھ سے نظام رہے، تمہارا واسطہ نہ ہوتو انسان مجبور محض ظاہر ہوگا۔ کل کو وہ کہہ سکتا ہے کہ آپ اگر مجھے اپنی خلافت و نیابت دیتے تو میں یوں چلا کے دکھاتا، مگر اب نہیں کہہ سکتا۔ ہم بتلائیں گے کہ جنہوں نے چلا کے دکھلا یا وہ یہ ہیں اور جنہوں نے نہیں چلا کے دکھلا یا وہ یہ ہیں۔ یہ مستحق ہیں ہماری رحمت کے اور یہ مستحق ہیں ہمارے عذاب کے، تو ایک بلا واسطہ حکومت الٰہی ہے۔ وہ اعلیٰ ترین نظم رکھتی ہے۔ ایک بالواسطہ ہے تو واسطے جیسے ہوں گے ویسے حکومت بنے گی مگر اصول انہیں وہی اختیار کرنے پڑیں گے جو اللہ کی حکومت کے ہیں۔ اس لیے اس سورۂ مبارکہ میں حق تعالیٰ نے اپنی حکومت اور اپنے اقتدار کے اصول بیان فرمائیں ہیں کہ شہنشاہی کس طرح چلتی ہے۔

عناصر بادشاہت ......تو ذات کو بیان کیا کہ بادشاہ وہ ہونا چاہیے کہ جو 1 خیر کا سرچشمہ ہو، 2 نیت بھی پاک ہو، 2 علم بھی اعلیٰ ہو، 4 عمل بھی صاف ہو، 5 اخلاق بھی بلند ہوں، اس کے اندر سخاوت بھی ہو اور عدل بھی ہو، سخاوت میں آکر فضول خرچی میں نہ آئے، عدل اس کی روک تھام کرے اور عدل میں آکر اسراف نہ داخل ہو۔ ہر چیز اپنے محل پر ہوتو بادشاہ کے اوصاف میں یہ ہے کہ بخیل نہ ہو، اگر بخیل ہوگا تو رعایا تنگ ہو جائے گی، تنگی ہوگا تو رعایا کے اندر رَقَّتُ الْحَالِی پیدا ہوگی، مگر اس کے ساتھ عدل ہو، کیوں کہ اگر ظلم کے ساتھ سخاوت ہوتو بادشاہ جانب داری کرے گا، ایک طبقے کو دے گا اور ایک کو محروم کرے گا، ملک میں بدنظمی پیدا ہوگی، لیکن اگر سخاوت کے

ساتھ عدل کرے گا تو سب کو برابر برابر ملے گا، کسی کو کسی سے شکایت نہ ہوگی۔

اسی واسطے حدیث میں فرمایا گیا ہے ماں باپ کے لیے کہ اولاد کے اندر سخاوت کرو، مگر عدل کے ساتھ، سب کو برابر برابر دو، ایک نظر سے دیکھو بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ محبت تو ساری اولاد سے انسان کو طبعاً ہوتی ہے مگر ایک سے کچھ زیادہ دوسرے سے نہیں ہوئی، ....غیر اختیاری طور پر لیکن معاملہ کرلے میں چاہے تو مساوات کہ جتنا ایک کو دے اتنا ہی دوسرے کو، اگر برابری نہ رکھی تو ان میں باہم لڑائی اور منافقت پیدا ہوجائے گی۔ اور پھر دونوں مل کر باپ کے مدمقابل آئیں گے تو گھر کی حکومت میں بدامنی پیدا ہوجائے گی۔ بدنظمی پیدا ہوگی، اس لیے بادشاہ کو چاہیے کہ سخی بھی اعلیٰ درجے کا ہو اور ساتھ ہی عادل بھی اعلیٰ درجہ کا ہو۔

سخاوت میں اسراف سے عدل روکتا ہے، اور عدل کی برکت سے سخاوت اپنے اصل محور پر چلتی ہے، اسی کے ساتھ بادشاہ میں دو چیزیں اور ضروری ہیں ایک مدبر اور شجاعت، بہادر بھی ہو، قلب کا جری بھی ہو، اگر بادشاہ بزدل ہوگیا تو پھر وہ کسی پر غالب نہیں آسکتا، اس میں وہ عناصر ابھر جائیں گے کہ جو ظالم ہیں اور فسادی ہیں انہیں کا غلبہ ہوگا اور تدبر کے بے بیچارے پیچھے رہ جائیں گے۔

لیکن اگر بادشاہ کے اندر تدبر ہے تو وہ اپنی تدبیر سے سب کو یکساں، اپنی جگہ قائم رکھے گا، ساتھ میں شجاعت اور بہادری بھی ہو، بزدل نہ ہو، اگر بزدل ہوگا تو دشمن ملک کا راستہ دیکھ لے گا اور مدافعت کی قوت نہیں ہوگی تو ملک تباہ و برباد ہوجائے گا۔ تو چار چیزیں لازمی ہیں بادشاہ کے لیے، ایک سخاوت اور ایک عدل اور ایک شجاعت اور ایک تدبر، یہ چار چیزیں جمع ہوں گی تب بادشاہی اصول پر چلے گی تو ان چاروں کے مجموعہ کو کہا گیا ہے برکت اور خیر، تو تَبَارَكَ الَّذِیْ برکت والی ذات خیر ہے کہ ہر چیز حد کمال پر ہے اور نہ صرف حد کمال پر بلکہ وہی سرچشمہ تمام خیر و برکت کا ہے، دوسروں کو خیر ملتی ہے تو اسی سے ملتی ہے۔ اور بِیَدِهِ الْمُلْکُ ملک اس کے قبضے میں ہے، اس کے ہاتھ کے نیچے ہے کہ ایک ذرہ بھی ادھر ادھر نہیں ہل سکتا، اس کے ساتھ ساتھ قدرت بھی ہے کہ وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اس کی قدرت بھی بڑی وسیع ہے، قابو ہی میں نہیں بلکہ قادر بھی ہے ہر چیز پر۔ اور قدرت عام بادشاہوں میں تو یہ ہوتی ہے کہ جب جیل بھیجنے کو لایا تو جیل بھیج دیا، کسی کو سزا دے دی، کسی کو انعام دے دیا۔ قدرت ہے۔

بلندیٔ قدرت...... لیکن اس کی قدرت کا یہ عالم ہے کہ اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ موت اور زندگی کی باگیں بھی اس کے ہاتھ میں ہیں، کسی انسان یا کسی بھی مخلوق کے ہاتھ میں موت اور زندگی کی باگ ڈور نہیں ہے کہ جس کو چاہے زندہ کردے جس کو چاہے موت دے دے۔

اور زندگی اور موت دینے کے یہ معنی نہیں جو نمرود نے سمجھے کہ یہ مر گیا، ابراہیم علیہ السلام نے اس کے سامنے اس کے دربار میں آکر کہا کہ خدائی کا دعویٰ مت کر، وہ بھی خدائی کا مدعی تھا، خدائی کا دعویٰ مت کر، خدا کو مان اور اپنے مالک کو پہچان، کہتا ہے کہ کون مالک ہے میرے سوا؟ فرمایا: اَلَّذِیْ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ ''وہ مالک ہے جو زندگی

بھی دیتا ہے اور موت بھی دیتا ہے‘‘۔

اس نے کہا کہ یہ کام تو میں بھی کرسکتا ہوں، اسی وقت دو قیدی نکلوائے جیل سے ایک کے قتل کا حکم دیا اور ایک کو چھوڑ دیا، کہنے لگا، دیکھو ایک کو مار دیا، ایک کو زندہ کر دیا، اس کوڑھ مغز نے یہ نہ سمجھا کہ وہ جو زندگی تھی جس کو تو نے قتل کیا وہ تیری دی ہوئی تھی؟ پھر قتل ہی تو کیا، قتل سبب بنتا ہے موت کا، لیکن موت نہیں دے سکتا کوئی

موت کہتے ہیں جان نکالنا، اپنے قبضے سے اور قدرت سے رگ رگ سے اندر سے حیٰوۃ کو نکال دینا، یہ تھوڑا ہی کرسکتا تھا، اس نے قتل کر دیا، قتل پر موت مرتب ہوئی مگر دینے والے موت کے حق تعالیٰ ہی تھے۔ اگر یہ قتل کر دیتا، گردن کاٹ دیتا اور وہ یہ چاہے کہ زندگی نہ نکلے نہیں نکل سکتی۔ واقعات ہیں ایسے شہداء کے بہت سے کہ ہاتھ کٹ گیا تو جھنڈا انہوں نے دوسرے ہاتھ میں لے لیا۔ دوسرا ہاتھ کٹ گیا جھنڈا انہوں نے منہ میں لے لیا اور اس کے بعد جھنڈا منہ سے گر گیا تو انہوں نے لیٹے ہی لیٹے لڑھک کر کئی ایک کو مار ڈالا، اس کے بعد کہیں جا کر جان نکلی۔ تو محض قتل ہونے سے جان نکلنا ضروری نہیں ہے۔ اللہ جب چاہے تو جان جاتی ہے، ورنہ مقتول کے اندر بھی جان رہتی ہے، تو بہر حال اس کی قدرت کا یہ عالم ہے کہ: خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ (القرآن) موت بھی اسی کی پیدا کی ہوئی ہے، حیات بھی اسی کی پیدا کی ہوئی ہے۔ جس کو چاہے زندگی دے جس کو چاہے موت دے۔

زندگی کی حقیقت ...... زندگی دینے کے معنی ہیں ’’عطائے وجود‘‘ وجود دے دینا دوسرے کو تو ظاہر بات ہے کہ انسان میں قدرت نہیں ہے کہ دوسرے کو وجود دے دے، اس لیے کہ خود اس کا وجود ہی اس کے قبضے میں نہیں۔ اگر بالفرض اس نے اس کو اولاد دی تو وجود دینے والا باپ یا ماں نہیں، وہ زندگی دینے کا اور وجود دینے کا سبب بنا ہے۔ لیکن دینے والا دوسرا ہے، اگر اس کے ہاتھ میں، قبضے میں وجود ہوتا تو یہ خود کبھی نہ مرتا، کون موت کو پسند کرتا ہے، اگر حیات قبضے میں ہو تو آدمی موت کو روک لیا کرتا۔

اگر زندگی دینا قبضہ میں ہو۔ تو جن کے اولاد نہیں ہوتی وہ ضرور اولاد کو پیدا کر لیا کرتے، اولاد پیدا ہونے کے اسباب سارے مہیا کرتے ہیں اور برس گزر جاتے ہیں اولاد نہیں ہوتی، کوئی دعائیں کراتے ہیں، کوئی تعویذ کراتے ہیں کوئی طبیبوں کے پاس جاتے ہیں۔ اگر قبضے میں زندگی تھی تو کیوں نہ دے دی اور بچے کو پیدا کر لیا، پھر اگر کوئی مر رہا ہو تو کسی کے قبضے میں نہیں کہ پل بھر کے لیے روک لے زندگی کو۔ ساری دنیا کے خزانے جمع کرلو اور یہ چاہو کہ ایک منٹ کے لیے اس میت کو روک لو، جان نہ نکلے تو یہ قبضۂ قدرت میں نہیں، سب عاجز بنے ہوئے دیکھتے ہیں۔

نزع ہو رہا ہے، سانس چل رہا ہے، ماں باپ بھی بیٹھے ہوئے ہیں، لیکن کچھ نہیں کرسکتے، معلوم ہوتا ہے کہ زندگی اور حیات ان کے قبضے میں نہیں ہے، اسباب زندگی کسی حد تک قبضے میں دیئے گئے ہیں، اسباب موت کسی حد تک قبضے میں دیئے گئے ہیں، لیکن خود موت وحیات ان کے ہاتھ میں نہیں۔

تو اللہ کی قدرت کا یہ عالم ہے کہ موت اور حیات اس کے قبضے میں ہے جسے چاہے وجود دے دے جس سے

چاہے وجود چھین لے، تو جو ایسا قادر مطلق ہوگا حکومت اس کے سزاوار ہے، حکمرانی اسی کا حصہ ہے، اسی واسطے اسلام میں حکومت اس کی ہوگی، چلانے والے تم ہوگے تاکہ تمہیں اجر ملے، ثواب ملے۔ تم خود حاکم نہیں اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ صرف اللہ کا کام ہے اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِلّٰهِ ملک صرف اسی کا ہے، تو ملک کا مالک کوئی نہیں، قدرت کا مالک کوئی نہیں، زندگی اور موت کا مالک کوئی نہیں یہ صرف اللہ رب العزت ہے کہ وجود اور عدم موت اور حیات دونوں اس کے قبضے میں ہیں۔ تو فرمایا کہ اس سے زیادہ اقتدار والا بادشاہ کون ہے کہ موت وحیات بھی قبضہ میں ہے۔ تو خود ذات مبارک تَبَارَكَ اور اَلَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ قبضہ پورے ملک کے اوپر ہے اور وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ . ہر چیز پر قادر ہے حتی کہ موت اور حیات پر قادر۔

مقصد موت وحیات...... اور یہ موت وحیات کیوں دی، کیا ضرورت تھی اس سلسلے کی کہ کوئی مر رہا ہے، کوئی جی رہا ہے، کوئی آ رہا ہے، کوئی جا رہا ہے، کسی کو غم ہے، کسی کو خوشی ہے، یہ کیوں کیا: لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا تاکہ اللہ جانچ لے کہ تم میں کس کا عمل اچھا ہے، کس کا برا ہے، اس واسطے کہ انسان سب سے پہلے میت ہی تھا، کوئی تھا ہی نہیں وجود اس کا، اس کے بعد حق تعالیٰ نے اس کو وجود بخشا وجود دیا تو وہ عدم سے وجود میں آیا، اس کے بعد پھر موت دی تو قبر میں چلا گیا۔ اس کے بعد پھر حیات دیں گے تو حشر میں پہنچ جائے گا۔ تو دو دو موتیں اور دو دو حیاتیں واقع ہوتی ہیں۔

موت وحیات کے تدریجی نظام کی حکمت...... اب کوئی شخص یہ کہہ سکتا تھا کہ صاحب! حیات بھی مسلم اور موت بھی مسلم، مگر یہ سارے انسان ایک دم پیدا ہو جاتے ہیں، ایک دم ایک دن میں سب کا انتقال ہو جاتا ہے، روز روز کی جھک جھک نہ رہتی، کوئی مر رہا ہے کوئی جی رہا ہے، تو ایک ہی دفعہ موت دے دیتے، ایک ہی دفعہ زندگی۔ (آخر ایسا کیوں نہیں کیا؟) اس میں حکمت یہ ہے کہ اگر ایک دن سب مرتے، عبرت پکڑنے والا کوئی نہ رہتا، تو موت کو جہاں ذریعہ بنایا ثمرات ظاہر ہونے کا، وہاں عبرت کا بھی تو ذریعہ ہے، کہ دوسرے کی موت دیکھ کر آدمی عبرت پکڑے کہ مجھے بھی اس راستے جانا ہے تو میں کوئی اچھا عمل کرلوں۔ تو عمل پر ابھارنے کے لیے ضرورت تھی کہ موت اور حیات کا سلسلہ مسلسل رہے (ایسا نہ ہو کہ) ایک ہی دن میں سب پیدا ہوں اور ایک دن میں سب مریں (بلکہ) کوئی مرے کوئی جیئے، کوئی آ رہا ہے کوئی جا رہا ہے تو آنے پر خوشی، جانے پر رنج آنے پر توقع کہ اچھے اعمال کا ظہور ہوگا۔ جانے پر عبرت کہ جب یہ جا رہا ہے اور اب یہ بھگتے گا تو ایسا نہ ہو کہ ہم جانے لگیں اور کوئی ایسی بری حرکت کر کے جائیں کہ ہمیں بھگتنا پڑے تو عبرت کا مقام نہ ہوتا، اگر موت وحیات کا مسلسل سلسلہ نہ رہتا، تو موت پر قادر، حیات بھی قادر اور موت اور حیات کا ایک سلسلہ قائم کر دیا۔ بیک دم نہ موت نہ بیک دم حیات رکھی، تاکہ عبرت موعظت، ترقی درجات مدارج، یہ انسانوں کو حاصل ہوں اور یہ جب ہی ہوں گے کہ میت کو دیکھے اور عبرت پکڑے کہ کل کو ہمارے لیے بھی یہ دن آنے والا ہے۔ تو اَلَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا .

محبوب القلوب بادشاہ......اور فرمایا کہ یہ ہم کیوں قادر ہیں؟ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ ۔ اس لیے کہ ہم عزت والے ہیں، عزت کی ہمارے یہاں کوئی انتہا نہیں، تو جس کی عزت اور جس کا اقتدار ہو وہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ تو جو بے عزت ہو اس کی وقعت ہی نہیں ہوگی تو وہ حکمرانی کیا کرے گا......

عزت والا ہی تو حکمرانی کرتا ہے۔ اگر بادشاہ کی نسبت تو ہین بیٹھ جائے کہ یہ تو بڑا ذلیل آدمی ہے، اس کے تو بڑے بڑے افعال ہیں تو وقعت ہی نہیں ہوگی، تو حکم ماننے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوگا۔ چنانچہ جو سلاطین بداخلاق گزرے ہیں یا سیہ کار گزرے ہیں، مخلوق لعنتیں بھیجتی تھی اور چاہتی تھی کہ کسی طرح سے یہ ختم ہو جائے۔ تو ظاہر بات ہے کہ ایسے کا حکم ماننا زبان سے تو ممکن ہے، مگر سورغبت سے کوئی ماننے والا نہیں۔ اور حق تعالیٰ کا منشاء یہ ہے کہ انسان جب ہمارا نائب بن کر حکومت کرے تو وہ اتنا محبوب القلوب ہو کہ رعایا اس کے لیے دعا مانگے، اس کے لیے یوں کہے کہ اس بادشاہ کی عمر دراز ہو، برکتوں کے سرچشمے پھوٹ رہے ہیں، پورے ملک کے اندر برکات پھیل رہی ہیں۔

تو بادشاہ کے لیے محبوب القلوب ہونا ضروری ہے، جب بادشاہ کی محبت نہیں ہوگی، کام نہیں چلے گا، اور محبت جب ہوگی جب سرچشمۂ خیر و برکت ہوگا، تب محبت ہوگی ورنہ عداوت ہوگی......تو محبت ہونی چاہیے، محبت جب ہوگی، جب عزت والا ہو، اور عزت والا وہی ہے جو خیر و برکت کا حامل ہے، خیر نہ ہوئی شر ہوا، تو عزت کے بجائے ذلت پیدا ہو جائے گی۔ اس لیے فرمایا کہ وَهُوَ الْعَزِيزُ وہ عزت والا بھی ہے اور اقتدار اور جلال والا بھی ہے کہ سب ہیئت زدہ بھی ہیں، محبت والے بھی ہیں، مگر اس کے بعد فرمایا کہ جلال محض نہیں۔ بخشنے والا بھی بہت ہے، سخی بھی بہت ہے، داتا بھی بہت ہے (چاہے) اس کا نام لینے کو برا کہیں، اس کے مقابلے پر لوگ آگئے ہیں، لیکن نہ سورج نکلنا بند ہوتا ہے، نہ سبزیاں اگنی بند ہوتی ہیں، نہ بارشیں برسنی بند ہوتی ہیں۔

ادیم زمین سفرۂ عام اوست　　　چہ دشمن بریں خوان یغما چہ دوست

اس کا دسترخوان پھیلا ہوا ہے، دوست اور دشمن سب کھا رہے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ سورج نکلے تو دوستوں کے گھر پر تو دھوپ ڈالے اور جو اللہ کے دشمن ہیں ان کے گھر میں اندھیرا ہے وہاں بھی سورج پہنچ رہا ہے۔ بارش میں یہ نہیں رکھا گیا کہ دوستوں کے گھر پر اور ان کے کھیتوں پر تو بارش ہو اور دشمن کے کھیت خشک ہو جائیں۔ جب بارش آتی ہے تو سب کے کھیتوں پر جاتی ہے تو ایسا عام دسترخوان ہے کہ دوست دشمن سب پل رہے ہیں۔ تو مغفرت والا بھی ہے، رحم و کرم والا بھی ہے۔ اپنی مخلوق کے اوپر بے انتہا شفیق بھی ہے۔

جلال و جمال کی جامع بادشاہت...... جیسے حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مثال سے بیان فرمایا: ایک شخص نے ایک چڑیا کے بچے پکڑ لیا، وہ بچوں کو لے کر آیا تو اس کی ماں چڑیا وہ اس کے سر پر منڈلا رہی ہے اور وہ پھڑ پھڑاتی ہوئی پھر رہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا اسے بچوں کی محبت ہے؟ عرض کیا یا رسول اللہ! اتنی بڑی محبت ہے اس کے دل میں اس لیے پھڑ پھڑا رہی ہے اور اپنی جان دینا گوارا کرے گی مگر بچوں

پر آنچ آنے کو گوارا نہیں کرے گی۔ فرمایا بے حد محبت میں یہ پھڑ پھڑا رہی ہے اس کو سامنے رکھ کر فرمایا: سمجھ لو کہ جب ایک جانور اور ماں بنا جانور اور یہ محبت ہے تو اللہ جو سرچشمہ ہے سب کے وجود کا جس نے بنایا اسے کیسے محبت نہ ہو گی اپنی مخلوق سے اسے کہیں زیادہ محبت ہے اپنی مخلوق سے جتنا کہ جانور کو اپنے بچوں سے محبت ہوتی ہے۔ تو ظاہر بات ہے کہ جب وہ محبت والا ہے، جبھی تو بخشش عام ہے، مسلم ہو یا کافر ہو، مطیع ہو یا فاسق، دھوپ، بارش، غلہ، کھانا، پینا، اور پھل سب کے لیے عام ہے، ورنہ دوستوں کے لیے کرتے، دشمنوں کے لیے نہ رکھتے، وہ بحیثیت مخلوق کے ان پر بے حد شفیق ہے۔ تو: اَلْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ (القرآن) عزت والا بھی ہے اور چشم پوشی کرنے والا بھی ہے۔

اخیر میں جب کوئی نہیں مانے گا تو فطرت کے مطابق سزا دیں گے، لیکن عین گناہ کی حالت میں فوراً سزا نہیں دیتے کہ شاید اب بھی سنبھل جائے، اب بھی سنبھل جائے، بخشش کا دروازہ عام ہے، تو یہاں چار وصف ہو گئے، ایک تو یہ کہ ذات بادشاہ یعنی اللہ کی ذات مبارک ہے، برکت والی ہے۔ دوسرے یہ کہ قادر ہے۔ بِیَدِهِ الْمُلْکُ. اس کے قبضے میں ہے۔ تیسرے یہ کہ: عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ. قدرت اور اقتدار اس کا انتہائی ہے۔

اور ساتھ میں یہ کہ عزیز بھی ہے عزت والا بھی ہے، جس کی وجہ سے سب مغلوب ہیں اور ساتھ میں غفور بھی ہے کہ محبت بھی کرتے ہیں، تو محسن بھی ہے، صاحب جلال بھی ہے، جیسا کہ دوسری جگہ قرآن کریم میں فرمایا ہے کہ: نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ٥ وَاَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ. ① اے پیغمبر! مطلع فرما دیجئے مخلوق کو اور اپنی امت کو، میں کون ہوں؟ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ ...... (میں بہت ہی بخشش کرنے والا ہوں)

تو جمال متوجہ ہوتا ہے، تو بادشاہ اگر محض جابر و قاہر ہی ہو کہ جبر و قہر ہی کرے، تو رعایا کا ناس مارا جائے، اگر محض جمیل ہی جمیل ہو کہ رحم و کرم کرتا رہے، غصہ نہ کرے، تب بھی ناس مارا جائے۔ اس لیے کہ بہت سی حرکات غصہ اور قہر سے رکتی ہیں، محض انعام و اکرام سے نہیں رکیں، دونوں شانیں ہونی چاہی ہیں، بادشاہ میں کہ جلال بھی ہو اور اکرام بھی ہو، جلال بھی ہو اور جمال بھی ہو، عزت و اقتدار اور قہر بھی ہو اور مغفرت و بخشش اور تدبر بھی ہو۔ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ. یہ پانچ اوصاف بیان کیے گئے، یہ ذات بادشاہ کے اوصاف تھے۔

لوازم بادشاہت ...... اور یہ کہ اس کے افعال کیا ہیں وہ اس سے اگلی آیت میں ہیں وہ انشاء اللہ پھر کل بیان ہوں گے۔ میں نے کل عرض کیا تھا کہ یہ سورت شہنشاہی خداوندی کے اصول پر مشتمل ہے اور حکمرانی کے اصول اور لوازم ارشاد فرمائے گئے ہیں، سب سے اول بادشاہ عالمین کی ذات کا تذکرہ کیا گیا کہ وہ مبارک ہے، پھر اس کی صفات کمال کا تذکرہ کیا گیا جو حکومت کے لیے ضروری ہیں، ان کی کل تفصیل عرض کی جا چکی ہے۔ آج کی آیتوں کی تفسیر کا حاصل لوازم بادشاہت ہو گا۔

یہ فطرت انسانی میں داخل ہے کہ جب کوئی حکومت قائم کی جاتی ہے تو سب سے اول دار الحکومت کی بنیاد

① پارہ: ۱۴ سورۃ: الحجر، الآیۃ: ۴۹، ۵۰.

ڈالتے ہیں، دار السلطنت یا دار الخلافہ کہ جس کو باب عالی یا باب حکومت کہا جاتا ہے وہ قائم کرتے ہیں، اور اس کو نہایت مستحکم اور مضبوط بناتے ہیں۔ دشمنوں کا حملہ سب سے پہلے دار السلطنت پر ہوتا ہے اگر وہ قبضہ میں آ جاتا ہے تو پورا ملک فتح مند سمجھا جاتا ہے، اس لیے دار الحکومت کو بہت ہی زیادہ مضبوط اور مستحکم بنایا جاتا ہے، بڑے بڑے قلعے تعمیر کئے جاتے ہیں اور اگر کوئی بڑی سلطنت ہے تو ساتھ ساتھ شہر پناہیں قائم کی جاتی ہیں اور ہر شہر پناہ کے اندر بڑی بڑی فوجیں رکھی جاتی ہیں۔ جن کے ساتھ میں سامان جنگ ہوتا ہے، جس زمانے کے مناسب جو کچھ سامان ہو یا جس ملک کے مناسب جو سامان ہو وہ فراہم کیا جاتا ہے۔ گولہ اور بارود اور آج کے دور میں مثلاً بم اور بڑی بڑی دور مار توپیں اور مشین گنیں جیٹ طیارے یہ زیادہ سے زیادہ دار السلطنت کے لیے مہیّا کیے جاتے ہیں۔ اور ضرورت کے مطابق اطراف ملک میں بھی یہ قوتیں قائم کی جاتی ہیں مختلف چھاؤنیاں بناتے ہیں ..... مگر دار السلطنت کو مضبوط رکھتے ہیں۔

حق تعالیٰ شانہٗ غنی ہیں کہ ان کی حفاظت کے لیے کوئی دار السلطنت بنے یا ان کے لیے قلعے بنائے جائیں وہ تو خود حافظ و حفیظ ہیں وہ خود جہانوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، ان کی حفاظت کے کوئی معنی ہی نہیں۔

لوازم سلطنت...... لیکن چونکہ ان کی صفت ہے "مَلِک" اور بادشاہ ہونا ہے۔ اس صفت کے اظہار کے لیے تمام لوازم سلطنت قائم کئے جاتے ہیں۔ تو سب سے پہلے شاہی قلعہ تعمیر کیا گیا۔ اور وہ بھی سات پناہوں کا جن کو سات آسمان کہتے ہیں۔ تو آسمان زمین سے زیادہ مضبوط ہے، زمین کمزور ہے لیکن آسمان مضبوط ہے۔ زمین میں روزانہ آپ تصرف کرتے ہیں، کہیں کھود کر کنویں بنا رہے ہیں کہیں سڑکیں نکالی جا رہی ہیں، روزانہ تغیر و تبدل زمین میں ہوتا ہے، لیکن آسمان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں، جب سے آسمان بنائے گئے ہیں، ہزاروں برس سے اس وقت تک یکساں حالت پر قائم ہیں۔

بادشاہ کی سات شہر پناہیں اور انسان کی وہاں تک رسائی؟...... اب یہ کہ وہ آسمان کہاں ہیں؟ تو ہوسکتا ہے کہ یہ جو نیلگوں اور چھت سے نظر آتی ہے یہی آسمان ہو، لیکن بعض لوگ اس کا انکار کرتے ہیں کہ یہ آسمان نہیں، تو ہمیں بھی کوئی اصرار نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ نیلگوں چھت جو ہے اس کے اوپر آسمان ہو اور یہ نیلگوں چھت ایسی ہو جیسے ایک بڑی چھت کے نیچے شہتیری لگا دیتے ہیں اور شامیانہ تان دیتے ہیں۔ تو ہوسکتا ہے کہ یہ نیلگوں آسمان نہ ہو، آسمان اس سے بالاتر ہو۔

اس لیے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ زمین سے لے کر آسمان تک پانچ سو برس کی مسافت ہے اور چونکہ مبالغہ اور استحسان ظاہر کرنا مقصود ہے۔ اس واسطے وہ پانچ سو برس کی مسافت تیز سواری پر طے ہونی چاہیے، زیادہ سے زیادہ تیز سواری ہو وہ پانچ سو برس میں وہاں تک۔ آج بڑی سے بڑی تیز رفتار سواری اگر ہوسکتی ہے تو راکٹ ہوسکتا ہے کہ جو ایک گھنٹے میں، پچیس سو میل یا پچیس ہزار میل جانے والی سواری ہے اور ممکن ہے کل کو اس سے بھی زیادہ تیز رفتار

سواری بن جائے تو وہ ایک گھنٹے میں پانچ سو کے بجائے پانچ ہزار یا پچیس ہزار کے بجائے پچاس ہزار میل طے کرلے، ایک لاکھ میل طے کرلے، پل بھر میں پہنچ جائے تو زیادہ سے زیادہ تیز رفتار سواری پر اگر سوار ہو کر جایا کرے تو پانچ سو برس میں آدمی آسمان پر پہنچ سکتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی کی نہ اتنی عمر ہے کہ وہ اس سواری پر سوار ہو کر اور پانچ سو برس طے کرے، آج بڑی سے بڑی عمر ہے تو وہ ساٹھ ستر برس کی ہے، سو برس کی ہو جائے گی تو اس عمر پر انسان طے نہیں کر سکتا جب تک کہ مدد خداوندی شامل حال نہ ہو۔ اسی واسطے ایک موقعہ پر قرآن کریم میں فرمایا گیا۔

یٰمَعۡشَرَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ اِنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ اَنۡ تَنۡفُذُوۡا مِنۡ اَقۡطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ فَانۡفُذُوۡا لَا تَنۡفُذُوۡنَ اِلَّا بِسُلۡطٰنٍ ۔ (1) اے جنوں! اور انسانو! اگر تم یہ کوشش کرنا چاہتے ہو کہ زمین اور آسمانوں کے فاصلے طے کرلو اور ان کی اقطار سے گزر جاؤ۔ قطر کہتے ہیں اس خط کو جو دائرے کے بیچ میں ہوتا ہے، اس سے پار ہو جاؤ تو ہو سکتے ہو، محال نہیں، لیکن ہو نہیں سکتے، اِلَّا بِسُلۡطٰنٍ ۔ جب تک کہ اللہ کی طرف سے کوئی مدد نہ دی جائے تمہیں۔ کوئی حجت تمہارے ہاتھ میں نہ ہو، اس وقت تم آسمانوں تک نہیں جا سکتے، آسمان سے نیچے نیچے جہاں تک تمہارا جی چاہے چلے جاؤ، جہاں تک طاقت ہو۔

بادشاہ کا نظام کواکب...... آج اگر کوئی چاند پر پہنچنا چاہے تو وہ پہنچ سکتا ہے۔ شریعت کے اصول سے کوئی بعید بات نہیں ہے، اس لیے کہ یہ نظام کواکب، ستاروں کا نظام سب آسمانوں سے نیچے ہے...... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی صریح روایت میں موجود ہے اس میں ہے کہ یہ تمام ستارے یہ آسمان کے نیچے لٹکے ہوئے ہیں اور ان میں سونے اور چاندی کی زنجیریں پڑی ہوئی ہیں اور ملائکہ کے ہاتھ میں ہیں جو انہیں تھامے ہوئے ہیں۔ قیامت کے دن جب آسمان ٹوٹیں گے اور ملائکہ علیہم السلام کو بھی وفات دے دی جائے گی، زنجیریں چھوٹ جائیں گی، وہ سارے ستارے ٹکڑے ہو کر نیچے آپڑیں گے قیامت قائم ہو جائے گی۔

آج کی دنیا میں کہا جاتا ہے کہ ستارے باہمی کشش سے قائم ہیں، ایک دوسرے ستارے کو کھینچ رہا ہے اس لیے وہ معلق ہیں۔ تو انہوں نے اسے کشش سے تعبیر کر دیا شریعت نے اس کشش کی حقیقت بتلا دی کہ وہ ملائکہ ہیں جنہوں نے اپنی طاقت سے ستاروں تھام رکھا ہے۔ تو ہمیں کشش سے انکار کی بھی ضرورت نہیں ہے لیکن وہ پھر حسیات پر پہنچے ہے حسی چیزوں میں کشش ہوتی ہے، شریعت اس کا انکار کیے بغیر اس کی حقیقت بتلاتی ہے کہ اس پر کشش کو تھام رکھا ہے فی الحقیقت ملائکہ علیہم السلام نے ان کی معنوی قوت نے ستاروں کو لٹکا دیا۔ تو یہ سارا نظام کواکب آسمانوں سے نیچے نیچے ہے آسمان اس سے بالاتر ہے تو سات آسمان تعمیر کئے گئے، گویا سات شہر پناہیں بنائی گئیں۔

عظیم بادشاہ کا عظیم دارالسلطنت اور اس کے حفاظتی انتظامات...... اس لیے کہ جب بڑی حکومت ہوتی ہے تو چھوٹا موٹا قلعہ کام نہیں دیتا، جب تک کہ ساتھ ساتھ شہر پناہیں نہ ہوں۔ تو سات شہر پناہ کا ایک

(1) پارہ: ۲۷، سورۃ: الرحمٰن، الآیۃ: ۳۳.

دارالسلطنت بنایا گیا ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ آخری حصہ میں تخت شاہی رکھا جاتا ہے تو ساتوں آسمانوں کے اوپر جا کر عرش عظیم قائم کیا گیا۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بڑے بڑے قلعے جب تعمیر ہوتے ہیں تو دشمنوں سے حفاظت کے لیے ان کے اردگرد خندقیں کھودی جاتی ہیں، پانی بھرا جاتا ہے ان میں اگر کوئی قریب بھی پہنچے تو دیوار تک نہ پہنچ سکے قلعے کی۔ سب سے زیادہ گہری خندق ڈالتے ہیں اور اس میں بہت گہرا پانی ہوتا ہے۔ اب اس میں کوئی کشتیاں بنائے اتنے بنائے گا قلعے والے اوپر سے گولیاں برسا کر اس کا استیصال بھی کر دیں گے۔ تو دشمنوں سے حفاظت کے لیے اول تو سات قلعے بنائے گئے اور پھر اس کے باہر جا کر ایک بڑی خندق بناتے ہیں جس میں پانی بھرتے ہیں تو پانی کے اوپر نرم مخلوق ہے۔ اس پر چلنا آسان نہیں ہے اس واسطے پانی پر آ کر دشمن رک جاتا ہے۔ تو حق تعالیٰ شانہٗ نے سات آسمان بنائے گویا سات قلعے تعمیر کیے اور اس کے بعد ایک عظیم الشان سمندر بنایا۔

تخت شاہی کا مقام...... اس سمندر کی بڑائی حدیث میں آتی ہے کہ ''آسمانوں اور زمینوں کے برابر اس دریا کی ایک ایک موج ہے'' اس سے اوپر عرش عظیم قائم کیا، تو سات قلعے ہیں اس کے، اس کے بعد خندق بنائی گئی اور وہ خندق بھی جیسا قلعہ ہے ویسی خندق، جیسا بادشاہ ہے ویسا ہی اس کے لیے سامان۔ تو خندق ایک عظیم سمندر ہے اور اس سمندر کی ایک ایک موج آسمانوں اور زمینوں کے برابر ہے۔

اس کے اوپر عرش عظیم قائم کیا گیا، تو گویا دارالسلطنت قائم کرنے میں پہلے قلعے بناتے ہیں، قلعے کے بعد خندق بناتے ہیں اور ساتویں قلعے میں پھر تخت شاہی رکھا جاتا ہے جو بادشاہ کی علامت ہوتی ہے۔ اسی تخت سے احکام جاری ہوتے ہیں، تو وہ تخت شاہی عرش عظیم ہے، ساتویں آسمان کے اوپر سمندر ہے، ان پر عرش عظیم قائم کیا گیا ہے۔

تو عرش کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جیسے یہ سات آسمان قبوں (گیند) کی طرح سے ہیں، ایک دوسرے کے اوپر، اور عرش نے سب کو گھیر رکھا ہے، سارے آسمان، ساری زمینیں، سارے سیارات اس عرش کے نیچے ہیں تو ترتیب معین ہوگئی کہ نیچے زمین، اوپر آسمان، اوپر سمندر، اس سے اوپر پھر عرش عظیم ہے، تو ایک شاہی قلعہ بنا اور تخت شاہی رکھا گیا۔

سرکاری مہمانوں کے لیے گیسٹ ہاؤس...... تو یہ بھی قاعدہ ہے کہ بہر حال حکومت کے مہمان بھی آتے ہیں تو ان کے لیے ایک ایک گیسٹ ہاؤس بنایا جاتا ہے، ایک بہت بڑا مہمان خانہ، اتنا بڑا کہ جو سارے مہمانوں کے لیے مناسب ہو۔ اس لیے کہ بادشاہ کے پاس چھوٹے موٹے قسم کے لوگ تو پہنچتے نہیں، وہاں والیان ملک اور بڑے بڑے نواب، راجہ ہی پہنچ سکتے ہیں کہ جو بادشاہ کے مہمان ہوتے ہیں تو ان کے مناسب حال ضرورت تھی کہ گیسٹ ہاؤس بنے، سرکاری مہمان خانہ بنے۔ تو وہ سرکاری مہمان خانہ اسی کا نام جنت ہے یہ جنت جو ہے یہ عرش عظیم کے نیچے ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ سات آسمان ہیں۔ ساتویں آسمان سے جنتوں کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے، اس لیے کہ صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کا مقام سدرۃ المنتھیٰ ہے اور یہ ساتویں آسمان

پر ہے۔ اور قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے۔ ﴿عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ○ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوٰى﴾ ① سدرۃ المنتہیٰ کے پاس سے جنت الماویٰ شروع ہوتا ہے، تو حدیث اور آیت کے ملانے سے یہ نتیجہ نکل آیا کہ ساتویں آسمان سے جنتوں کا علاقہ شروع ہوتا ہے اور جنتیں ایک دوسرے کے اوپر سو (۱۰۰) ہیں ایک ایک جنت آسمانوں اور زمینوں سے زیادہ بڑی ہے، تو اندازہ کیجئے کہ سو جنتیں ہیں اور ہر جنت آسمانوں اور زمینوں سے بڑی ہے تو لاکھوں آسمانوں کے برابر ایک جنت ہی ہوگی۔ یہ ہے سرکاری مہمان خانہ کہ جس میں سرکاری مہمان رکھے جائیں گے۔

آمد مہمانان ...... اور سرکاری مہمان کب پہنچیں گے؟ جب آسمان بیچ سے نکال دیئے جائیں گے جب ہی تو پہنچیں گے، اس لیے کہ اصل مہمان ملائکہ تو ہیں نہیں، یہ تو خدام ہیں جو کام کر رہے ہیں۔ مہمان تو وہ جو اللہ کے بتلائے ہوئے طریق پر اور راستے پر چل کر اس تک پہنچیں گے۔ وہ راستہ شریعت ہے اس پر چلنے والے انسان ہیں، تو حقیقت میں سرکاری مہمان یہ انسان ہوں گے جو ٹھیک اس راستہ پر پہنچ کر جو جنت کو جا رہے ہیں وہیں پہنچ جائیں۔ تو حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن حساب کتاب کے بعد جتنے اہل جنت ہیں وہ جنت میں بطور مہمان کے داخل کئے جائیں گے۔

خصوصی مہمانی ...... اور خوب ان کی مہمانی ہوگی کہ ان کے لیے زمین کی روٹی اور مچھلی کے جگر کا سالن بنایا جائے گا اور تین دن کی مہمانی اس انداز سے ہوگی کہ ان کو روٹی تو دی جائے گی اس زمین کی یعنی یہ پوری زمین اس کی ایک روٹی بنادی جائے گی اور زمین جس پر قائم ہے وہ ایک عظیم الشان مچھلی ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے اس کے جگر کے کباب ہوں گے، تو زمین کی روٹی اور مچھلی کے کباب اور وہ بھی اس کے جگر کے جو سب سے زیادہ لذیذ گوشت ہوتا ہے، وہ غذا دی جائے گی۔

مہمانی کے لیے زمین کی روٹی کا انتخاب ...... آپ سوال کریں گے کہ یہ زمین تو مٹی ہے اور اس کی روٹی تو بڑی چڑ چڑی ہوگی تو کھائی کس طرح سے جائے گی؟ اللہ میاں کے یہاں مہمانی ہو اور چڑ چڑی روٹی ملے؟

میں عرض کرتا ہوں کہ آج جو آپ غذا کھا رہے ہیں وہ بھی تو زمین ہی کھا رہے ہیں اس لیے کہ زمین ہی میں غلہ بھی دانے بھی، چنے بھی، گیہوں بھی، پھل پھول فروٹ سب زمین سے نکلتے ہیں تو یہ زمین کے ٹکڑے ہیں جو آپ کھاتے ہیں۔ لیکن اللہ نے کچھ ایسی مشینیں لگا رکھی ہیں قدرتی کہ ان کے ذریعے چڑ چڑا مادہ صاف کر کے خالص مزے کی چیز بنادی جاتی ہے۔

سیب کے کھانے میں کبھی چڑ چڑا پن محسوس نہیں ہوتا، انگور کھانے میں کبھی چڑ چڑا پن نہیں، حالانکہ یہ وہی مٹی ہے۔ اسی کا اللہ نے جوہر بنا کر چڑ چڑا پن، باطنی مشینوں سے نکال دیا اور صاف ستھرا مادہ خوشبودار رسیلا بنا کے آپ کو دیا۔ تو جب آج بھی آپ مٹی کھا رہے ہیں۔ اور چڑ چڑا مادہ نہیں آتا تو کیا تعجب ہے کہ حق تعالیٰ اس دن ساری زمین

① پارہ: ۲۷، سورۃ النجم: آیت: ۱۴، ۱۵۔

کا چڑ چڑا مادہ نکال کر اس کا اصل جوہر بنا دیں۔ اس لیے کہ سارے مزے اس زمین ہی میں تو چھپے ہوئے ہیں، یہ سیب، انگور، انار، امرود جو ہے زمینی ہے، تو زمین ہی میں یہ سارے ذائقے چھپے ہوئے ہیں، مشینوں کے ذریعے ان ذائقوں کو الگ الگ کر کے چڑ چڑا مادہ نکال دیتے ہیں تو سارے ذائقوں کا مجموعہ یہ زمین ہے۔ ہوسکتا ہے کہ حق تعالیٰ اس دن اپنی قدرت کاملہ سے اس زمین کے سارے مزے ایک جگہ جمع کر کے چڑ چڑا مادہ الگ کر دیں۔ اور ان سارے مزوں کی ایک روٹی بنا دیں، تو دنیا کے جتنے پھل اور فروٹ ہیں سب کے ذائقے اس روٹی کے اندر ہوں گے، کوئی ذائقہ نہیں چھوٹا ہوا ہوگا، سارے ذائقے آجائیں گے۔

زمینی روٹی اور مچھلی کے سالن کی حکمت ...... اور یہ اس لیے کریں گے کہ اول تو دنیا میں ہر انسان نے دنیا کا ہر پھل نہیں چکھا ہر ملک کے الگ الگ پھل ہوتے ہیں، جو ترکی میں ہے وہ ہندوستان میں نہیں جو ہندوستان میں ہے وہ ایران میں نہیں، جو ایران میں ہے وہ افغانستان میں نہیں۔ تو لاکھوں کروڑوں انسان وہ ہیں جو اپنے اپنے خطے کے پھل تو کھائے ہوئے ہیں لیکن ساری زمین کے سارے ذائقوں سے واقف نہیں، ہوسکتا ہے کہ شکایت کرے بنی آدم کہ ہمیں آدھے تہائی پھل دیئے، وہ انہیں دیئے۔

کچھ ہمیں دیئے، ہم تو واقف نہیں زمین کے سارے ذائقوں سے، اس لیے سارے ذائقے جمع کر کے بنی آدم کو جو روٹی ہے وہ کھلا دیں گے تاکہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے۔

اور سالن بنائیں گے مچھلی کے جگر سے، اس لیے کہ غذائیں دو ہی ہیں دنیا میں یا بری یا بحری، تو بحری غذاؤں میں سے سب سے اعلیٰ ترین غذا مچھلی اور بری غذاؤں میں سب سے اعلیٰ ترین غذا یہ فروٹ اور پھل اور دانے، تو زمین کا جوہر نکال کے تو سارے فروٹ اور دانے جمع کر دیئے اور ان کا مزہ ایک جگہ ہوگیا۔ اور بحری چیزوں میں وہ مچھلی کہ ساری مچھلیوں کی ماں ہے، وہ اور اس میں سے ساری مچھلیاں نکلی ہیں اور مچھلیوں کی اقسام ہیں۔ کسی مچھلی کا کچھ ذائقہ ہے، کسی کا کچھ ہے۔ اقسام ہیں وہ ساری قسمیں جمع ہو جاتی ہیں اس مچھلی میں جا کے جس پر زمین قائم ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دریائی غذاؤں کے جتنے ذائقے ہیں وہ بھی ایک جگہ جمع کر دیں گے اور بَرّ اور خشکی کے جتنے ذائقے ہیں وہ بھی ایک جگہ جمع کر دیں گے اس کی روٹی بنا دی اور اس کا سالن بنا دیں گے، تو بحر و بر کی ساری غذائیں سارے بنی آدم نے چکھ لیں۔ اور یہ کیوں چکھائیں گے؟ ابتدا ہی میں جنت کی غذائیں کیوں نہ دے دیں؟ بتلانا یہ ہوگا ساری زمین کے ذائقے کھلا کر بس یہ ہیں وہ ذائقے جن پر تم رات دن لڑتے مرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ بس سب کچھ یہی ہے۔ اب یہ کھا کر اب ہمارے بنائے ہوئے ذائقے کا مزہ چکھو جو ہم نے تیار کیے ہوئے ہیں، جنت میں مقیمین کے لیے تاکہ توازن اور تقابل کر سکو۔ وہ موت کی تلخی نے سارے ذائقے بھلا دیئے، کوئی چیز ذہن میں نہیں کہ کیا کھائے کیا نہیں کھایا۔ اس واسطے ان سارے ذائقوں کو عین جنت میں کھلا کر تازہ کر دیں گے کہ بس یہ تھے وہ ذائقے جن پر آپ جی جی کر سر پھٹول کیے رہے، اور مارا ماری کیے رہے۔ اور ایک افراتفری کی یہ تھے وہ ذائقے اسی

کے لیے تو لڑائی ہوتی تھی۔ یہ کل ذائقے چکھ لیے یہ کل تمہاری لڑائی کی کائنات تھی۔

دنیوی لذتیں چھڑانے کی حکمت ...... اور جس کائنات کا اور جن نعمتوں اور لذتوں کا ہم نے وعدہ کر رکھا ہے اب وہ چکھو تو اس وقت مخلوق کو حیرانی ہوگی۔ جب مٹی ملا ہوا گھونٹ اس قدر ذائقہ دیتا ہے، تو جب مٹی بالکل صاف ہو کر خالص ذائقہ دیں گے تو اس میں کیا کیفیت ہوگی اور کیا سرور ہوگا؟ لیکن اس سرور کو سمجھانے کے لیے پہلے یہاں کے مزے چکھادیں گے کہ اب تقابل کرو کیا چیز ہم نے چھڑوائی تم سے اور کیا ہمیں دینا ہے؟

ہم اگر چھڑوا رہے تھے دنیا کی لذتیں تو معاذ اللہ! تمہارے ساتھ عداوت نہیں تھی بلکہ یہ تھا کہ ادنیٰ کو چھوڑ کر اعلیٰ کی طرف جاؤ۔ جنہوں نے چھوڑا انہوں نے تو اسے پایا، اور جنہوں نے نہیں چھوڑا تو بیچ میں دھکے کھائے اس چیز کے تئیں۔ مگر بہر حال جب وہ بھول بھال چکے اب ہم وہ اپنے ذائقے چکھاتے ہیں، مگر یاد دلانے کے لیے پہلے ان ذائقوں کو سامنے کیے دیتے ہیں تا کہ تمہیں جنت کی قدر محسوس ہو، تو بہر حال اہل جنت کو جنت میں تین دن مہمان رکھا جائے گا اور اس میں غذا وہ دی جائے گی جس سے وہ مانوس تھے اور برس ہا برس کھائے ہوئے آرہے تھے۔

ابدی قیام کی بشارت ...... تین دن کے بعد جب مہمانی پوری ہوجائے گی، تو قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ ارشاد فرمادیتے کہ اب نکلو جنت سے کہ بس تین دن کی مہمانی، تین دن سے زیادہ کوئی ذمہ داری نہیں، لیکن کریم کی شان سے یہ بعید ہے کہ کوئی نعمت دے کر پھر اسے واپس لے۔ اس لیے فرمائیں گے کہ جس نے جس محل پر قبضہ کیا، آج سے ابدالآباد تک وہ محل اسی کا ہے، وہ سارا رقبہ اسی کا ہے، اب ہم واپس نہیں لیں گے .... یہ کریم کی شان سے بعید ہے کہ گھر میں رکھ کر اور پھر کہے نکلو گھر سے، بس جس گھر میں آگئے وہ آج سے تمہارا گھر ہے اور وہ محل کوئی چھوٹا موٹا نہیں ہوگا۔

جنت کی ادنیٰ بادشاہت کا عالم ...... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ جنتی کو جو رقبہ اور حصہ دیا جائے گا وہ دس دنیا کے برابر ہوگا، گویا دس دنیائیں بن جائیں اس کے اندر سے مع زمین اور بحر اور بر اور پہاڑوں سے تو دس گنا ہوگا، اس لیے کہ اللہ نے دس گنا کا اجر بھی رکھا ہے دنیا میں۔ اَلْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا۔ ایک نیکی کرو گے تو دس نیکیاں ملیں گی، یہ ضابطہ کا اجر ہے اور دس سے بڑھادیں تو یہ ان کے فضل سے بعید نہیں۔ چاہے سات سو گنا کر دیں۔ چاہے ستر ہزار گنا کر دیں، مگر دس گنا وہاں قاعدے میں ہے داخل، ضابطہ میں اسی قاعدے کے مطابق کم سے کم حصہ دنیا کا دس گنا ہوگا۔ یہاں ہفت اقلیم پوری دنیا کی بادشاہت اور اسے دس جگہ جمع کرو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ستر اقلیم کا بادشاہ ہوگا آدمی وہاں اور وہ اقلیم بھی وہ کہ جہاں کوئی کدورت نہیں، کوئی غبار نہیں، کوئی طمع نہیں، کوئی پرانا پن نہیں۔ بلکہ بالکل صاف ستھری ابدی نعمت ہوگی اور دس دنیا کے برابر۔ تو یہ حق تعالیٰ کی کریمی ہے کہ مہمان بنا کر داخل کریں گے اور جو جہاں پہنچ گیا پھر اس سے واپس نہیں لیں گے کہ اب یہیں رہو اور ابدالآباد تک رہو، کوئی تمہیں نکالنے والا نہیں، یہ ہے سرکاری مہمان خانہ۔ اور سرکاری مہمان خانہ ظاہر ہے کہ شاہی محلات کے قریب ہی ہوتا ہے تا کہ مہمانوں کو بادشاہ کے پاس آنے جانے میں دشواری نہ ہو، دوری نہ ہو۔

سرکاری جیل خانہ اور زیارۃ خداوندی سے محرومی......جیل خانہ میں البتہ دور رکھتے ہیں، اس لیے کہ قیدیوں سے ملنے کے کوئی معنی نہیں، قیدی تو دور ہی رہے تاکہ اس کو حسرت ہو کہ میں نعمت کے گھر کے قریب بھی نہیں۔ تو جیسے سرکاری مہمان خانہ ضروری ہے، ایسے ہی سرکاری جیل خانہ بھی ضروری ہے اس کا نام شریعت کی اصطلاح میں ''جہنم'' ہے۔ اس میں وہ رہیں گے جو مجرم اور قیدی ہیں۔ اس کو ساتویں زمین کے نیچے رکھا گیا ہے جنت رکھی گئی ساتویں آسمان کے اوپر اور جہنم رکھا گیا ساتویں زمین کی تہہ میں۔ تاکہ وہ اللہ کی رحمت سے بعید سے بعید ہو جائے اور اس کے قرب کی لذت کا تصور اس کے قلب میں نہ آسکے اور قید کو اور عذاب کو اچھی طرح سے چکھے، تو بعد بھی ہوگا اور عذاب بھی ہوگا۔ اول تو اللہ سے بعید ہونا یہی ایک مستقل عذاب ہے اور بعید ہو کر بھی حسی عذابات بھی ہوں اور یہ عذاب در عذاب اور وہ عذاب ابدی اور دائمی ہوں۔ تو یہ عذاب در عذاب ہے تو بعد بھی ہوگا، عذاب کی نوعیت بھی شدید ہوگی۔ اور ابدالآباد کا عذاب ہوگا۔

مہمان خانہ میں زیارۃ خداوندی کے درجات......اس کے بالمقابل سرکاری مہمان خانوں کے لیے قرب بھی انتہائی، کہ ہر وقت بادشاہ کی زیارت کرسکیں، حدیث میں ہے کہ بعض تو وہ ہوں گے جن کو چوبیس گھنٹے حق تعالیٰ کا مشاہدہ رہے گا۔ جیسے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کہ ایک لمحہ کے لیے بھی تجلیات خداوندی ان کی نگاہوں سے غائب نہیں ہوں گی۔ ہر وقت اللہ کو دیکھتے رہیں گے اور بعض وہ ہوں گے کہ ہفتے میں دو تین بار زیارت ہوگی جیسے اکمل اولیاء اللہ، اور عامۂ مؤمنین وہ ہوں گے کہ ہفتے میں ایک بار ان کو زیارت کرائی جائے گی، دربار منعقد کیا جائے گا، انہی سو جنتوں کے اوپر دریا ہے اور دریا پر عرش عظیم ہے اور عرش عظیم کے بازو میں ایک میدان ہے جس کا نام میدان مزید ہے۔

میدان مزید کی وسعت......اس میدان کی بڑائی کا یہ عالم ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام جو سید الملائکہ ہیں اور چھ سو بازو کے فرشتہ ہیں، چھ سو بازو ہیں اور جثہ ان کا وہ ہے کہ اصلی حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دو دفعہ جو دیکھا۔ ایک دفعہ شب معراج میں اور ایک دفعہ وحی کی آمد کے وقت، وہ اس شان سے دیکھا کہ زمین سے آسمان تک جتنی فضا ہے سب بھری ہوئی ہے جبرئیلؑ کے بدن سے۔ مشرق میں مونڈھا ہے اور مغرب میں دوسرا مونڈھا ہے اور سر آسمان کے قریب ہے اور پیر زمین کے قریب اور ایک نورانی چہرہ ہے جو سورج سے زیادہ روشن ہے اور تاج ان کے سر اوپر ہے اور سبزہ رداء (چادر) ان کے بدن کے اوپر۔ اس شان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ دیکھا تو اتنے ڈیل ڈول کا فرشتہ، حضرت جبرئیل علیہ السلام وہ یہ فرماتے ہیں کہ جب سے میں پیدا ہوا ہوں اس میدان میں گھومتا ہوں، مگر اب تک مجھے اس کے کناروں کا پتہ نہیں کہ یہ میدان کہاں تک ہے۔ وہ میدان دربار خداوندی کا میدان ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اس کے وسط میں بچھائی جائے گی کرسی حق تعالیٰ کی، جس کا ذکر ہے قرآن کریم میں: وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۔ ① وہ کرسی آسمانوں اور زمینوں سے زیادہ بڑی ہے۔

① پارہ: ۳، سورۃ: البقرۃ، الآیۃ: ۲۵۵.

حدیث میں ہے کہ کرسی جو سات زمین اور ساتوں آسمانوں سے زیادہ بڑی ہے۔ وہ ایسی ہوگی جیسے ایک بڑے میدان میں ایک چھلا ڈال دیا جائے تو میدان کی بڑائی اور عظمت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ وہ کرسی بچھائی جائے گی میدان کے وسط میں۔ اس کے چاروں طرف منبر ہوں گے نور کے، وہ انبیاء علیہم السلام کے منبر ہوں گے اور گول دائرہ بنایا جائے گا، ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام ان پر بیٹھیں گے اور ہر نبی کے منبر کے پیچھے اس کی امت کی کرسیاں ہوں گی، درجہ بدرجہ، جو دنیا میں جتنا زیادہ اطاعت گزار تھا اتنا ہی قریب ہوگا پیغمبر علیہ السلام کے۔ تو ہفتہ میں ایک دن جو جمعہ کا دن ہوگا، دربار خداوندی کا ہوگا۔

سرکاری سواریاں...... اس دن میں تمام اہل جنت اپنی اپنی سواریوں پر اس میدان میں آنے کے لیے چلیں گے اور کوئی نیچے کی جنت میں ہے، کوئی بیچ کی جنت میں ہے اور کوئی اوپر کی جنت میں ہے اور زمینوں اور آسمانوں سے بڑی سو جنتیں ہیں۔ اس لیے ان کو سواریاں دی جائیں گی اور وہ سواریاں براق ہوں گی۔ رفرف ہوں گے، تخت رواں ہوں گے کہ بڑی بڑی مسندیں بچھی ہوئی ہیں اور قوت خیال سے وہ اڑیں گے۔ کوئی مشین نہیں ہوگی کہ کل گھمانی پڑے اور پٹرول دینا پڑے۔ اس کا سارا پٹرول مشینری ہماری قوت خیال ہوگی۔ وہ اتنی مضبوط بنادی جائے گی کہ خیال یہ کیا کہ وہاں پہنچیں، پل بھر میں وہاں پہنچ گئے، پل بھر میں نیچے آگئے، تو پلوں میں یہ مسافتیں طے ہوں گی، سب اس میدان کے اندر جمع ہوں گے۔

نشست گاہیں اور مقامات قلبیہ سے ان کا تعین...... اور فرمایا گیا ہے حدیث میں کہ ہر ایک کی سیٹیں متعین ہوں گی جیسے درباروں میں سیٹیں بچھائی جاتی ہیں، تو کارڈ چھپے ہوئے لگے ہوئے ہوتے ہیں جن پر نمبر تک پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ بٹھلانے والے اسی نمبر پر بیٹھنے والے کو بٹھاتے ہیں، یہ نہیں کہ کسی دوسری پر کوئی جا بیٹھے۔ اپنی سیٹ پر، وہاں بٹھانے والا کوئی نہیں ہوگا۔

حدیث میں ہے کہ ہر ایک شخص اپنے مقام کو اپنی طبعی اور قلبی کشش سے پہچانے گا اور وہیں جا کر رکے گا جو اس کی سیٹ ہے اور اس کی کرسی۔ یہ نہیں ہے کہ غلطی کر جائے اس لیے کہ وہ مقامات متمثل ہوں گے جو اپنے قلب کے مقامات ہیں۔ مقامات قرب حق تعالیٰ کے نزدیک کتنے ہیں قوت ایمانی کے مقامات، ہر شخص اپنے مقام کو خوب پہچانتا ہے کہ میرا ایمان کس درجہ کا ہے، میرے اخلاق کس مرتبہ کے ہیں، وہی اخلاق، وہی مقامات، وہ متمثل کیے جائیں گے سیٹوں کی صورت میں ہر شخص اپنے اپنے مقام پر بیٹھے گا۔ انبیاء اپنے مقامات پر ہوں گے۔ اب یہ دربار پر ہوگیا، بھر گیا، کرسیاں ہوں گی اور ان کرسیوں کے پیچھے اس میدان کے کناروں پر بڑے بڑے قالین ہوں گے۔ چبوتروں پر اور چبوترے ہوں گے۔ مشک اور زعفران کے اور ان پر وہ غالیچے ہوں گے۔ عوام جو کم درجہ کا ایمان رکھتے تھے ان کے پاس کرسیاں نہیں ہوں گی، بلکہ وہ ان قالینوں پر بیٹھیں گے۔

میدان مزید میں کرسی حق پر تجلیات کا ظہور...... اب گویا پورا میدان بھر گیا۔ سیٹیں پر ہیں۔ انبیاء علیہ السلام

اپنی جگہ اور کرسی حق تعالیٰ کی خالی۔ جب دربار پر ہوگا اس کے بعد تجلیات کا ظہور کرسی کے اوپر شروع ہوگا، اور یہی طریقہ بھی ہے کہ درباری جب ایک جگہ جم جاتے ہیں تب بادشاہ برآمد ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہ بادشاہ پہلے بیٹھے ہوئے ہیں، کوئی ہو نہ ہو، لوگ آئیں تو بیٹھیں، جب سب جم جاتے ہیں، تب بادشاہ نکلتے ہیں اور سراپردہ کھولا جاتا ہے اور نقیب اور چوبدار آوازیں دیتے ہیں اور بادشاہ آتے ہیں تو سب تعظیم کے لیے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اس وقت بادشاہ کے حکم سے کچھ تحائف تقسیم ہوتے ہیں، کچھ کھانے پینے کو دیا جاتا ہے یہی صورت یہاں بھی ہوگی کہ تجلیات ربانی کا ظہور شروع ہوگا۔

احادیث میں ہے کہ وہ کرسی باوجود اس عظمت کے اس طرح سے چڑ چڑائے گی کہ جیسے ٹوٹ کر گرنے والی ہے۔ وہ عظمت کا بوجھ ہوگا کوئی جسمانی بوجھ نہیں ہے، بلکہ حق تعالیٰ کی عظمت اور ہیبت کی وجہ سے کرسی چڑ چڑائے گی۔ تجلیات کا ظہور ہوگا اور بندے اپنے قلوب کی بصیرت سے پہچان لیں گے کہ ہم اللہ کے سامنے ہیں

دربارِ خداوندی میں مشروب تواضع...... حق تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے ملائکہ کو کہ جس شراب طہور اور پاک شربت کا ہم نے وعدہ کیا تھا وہ پلاؤ، تو ملائکہ وہ نورانی صراحیاں لے کر شراب طہور تقسیم کریں گے۔ شراب کے معنی مطلق پینے کی چیز کے ہیں۔ اسے شراب نہیں کہتے جو نشے والی ہو۔ اسے خمر کہتے ہیں عربی زبان میں۔ شراب ہر پینے کی چیز کو شربت کو بھی شراب کہیں گے، دودھ کو بھی شراب کہیں گے کہ پینے کی چیز ہے۔ خیر پینے کی کوئی چیز دی جائے گی۔ اس میں سرور کی یہ کیفیت ہوگی کہ پینے کے بعد یہ محسوس ہوگا کہ غم والم کا تو نشان ہی نہیں ہے۔ رگ رگ میں فرحت اور سرور بڑھ رہی ہے اور ہر ایک میں ایک عجیب امنگ ہوگی اور معرفت بڑھ جائے گی اور حق تعالیٰ کی پہچان بڑھ جائے گی۔

سُکرِ معرفت میں ازدیاد...... اور اسی میں یہ بھی فرمائیں گے، داؤد علیہ السلام کو یہ بھی فرمائیں گے کہ ان کو معجزہ دیا گیا تھا آواز۔ اتنی پاکیزہ آواز تھی حضرت داؤد علیہ السلام کی کہ جب وہ مناجاتیں پڑھتے تھے تو چرند پرندان کے اردگرد جمع ہوجاتے تھے، محو اور مست ہوجاتے تھے یہ معجزہ تھا۔ ان کو فرمایا جائے گا کہ اہل جنت کو وہ مناجاتیں سناؤ جو اللہ کی مدح اور ثناء میں تمہیں دی گئی تھیں اور حضرت داؤد علیہ السلام پیغمبر اور آواز بھی بڑی معجزانہ اور قرب خداوندی، ملائکہ کا قرب، اللہ کا قرب اور اللہ کی حمد وثناء۔ وہ جو پڑھیں گے اپنی لے میں تو کیفیت یہ ہوگی کہ تمام اہل جنت گویا گم ہوں گے۔ انہیں کچھ پتہ نہیں ہوگا کہ کہاں ہیں، وہ محو ہوں گے حق تعالیٰ شانہٗ میں، ایک اور عجیب کیفیت یہ طاری ہوگی مشابہ اس کیفیت کے کہ جو اہل اللہ پر معرفت کے نشے میں کیفیت طاری ہوتی ہے۔ سکر کی اور نشے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ کیفیت طاری ہوگی جس سے روحانیت ہزار گنا بڑھ جائے گی۔ اس وقت حق تعالیٰ فرمائیں گے۔ سَلُوْنِیْ مَا شِئْتُمْ۔ ''جس کا جو جی چاہے مانگے''۔

اہل علم کی احتیاج...... اب سب حیران ہوں گے کہ کیا چیز مانگیں؟ عرض کریں گے کہ اے اللہ! کونسی نعمت ایسی ہے جو جنت میں آپ نے عطا نہیں فرمادی، باقی کیا ہے کہ جس کو ہم مانگیں۔ فرمائیں گے نہیں مانگو جس کی جو مرضی

ہو مانگے، تو اب سمجھ میں نہیں آئے گا کہ کیا مانگیں، ہر نعمت کھانے پینے کی مل چکی، محلات، شہر، حکومت، جاہ، عزت ساری مل گئیں۔ کیا چیز مانگیں اور قرب خداوندی اس سے بڑھ کر نعمت نہیں اور کیا مانگیں۔ جب سمجھ میں نہیں آئے گا تو سب لوگ علماء کی طرف متوجہ ہوں گے کہ اہل علم سے مشورہ کریں، وہ اپنے علم کی طاقت سے کچھ بتلائیں گے کہ کیا چیز رہ گئی ہے، کہ مانگیں؟

گویا مولویوں کی محتاجگی وہاں بھی جا کر رہے گی، لوگ یہاں اپنا پیچھا چھڑانا چاہیں، یہ وہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑیں گے، وہاں بھی محتاجگی رہے گی۔ یہ محتاجگی علم کی ہوگی، کسی ذات کی نہیں ہوگی۔ آج بھی اگر ہم علماء کے محتاج ہیں تو گوشت پوست کے محتاج نہیں ہیں، وہ تو ہمارے اندر بھی موجود ہے۔ ان کے علم کے محتاج ہیں، وہ راہنما ہے، راہ دکھلانے والا ہے کہ علم سے کسی جہان میں بھی آدمی مستغنی نہیں ہوسکتا۔ جتنے بڑے جہاں میں پہنچے گا اتنے ہی بڑے علم کی ضرورت ہوگی، وہاں کی راہیں طے کرنے کے لیے ضرورت ہوگی۔ تو سب علماء کی طرف متوجہ ہوں گے کہ کیا چیز مانگیں؟ ادھر سے تو حکم ہے کہ مانگو اور ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چیز باقی نہیں جو ہمیں نہیں مل گئی۔

جمال خداوندی کے دیدار کا سوال ...... وہ کہیں گے کہ ایک چیز رہ گئی ہے، وہ مانگو اور وہ ہے دیدار خداوندی۔ اس کا سوال کرو کہ اپنا جمال مبارک دکھلا دیجئے۔ جس کی طمع میں ہم رات دن عبادت کرتے تھے اور عبادت میں یہ جوش ہوتا تھا کہ کس طرح اللہ کو دیکھ لیں، تو پہلے ہم دیکھتے تھے عقل کی آنکھ سے، اس کے بعد ہم دیکھتے تھے ایمان اور عقیدہ کی آنکھ سے، اس کے بعد دیکھتے تھے خواب میں، اس کے بعد ہم دیکھتے تھے کشف کے ساتھ، اب یہ سارے مراتب طے ہوگئے، اب یہ چاہتے ہیں کہ ان آنکھوں سے عیاناً اپنے پروردگار کو دیکھیں، یہ مانیں گے، جب سوال سمجھ میں آجائے گا ایک زبان ہو کر عرض کریں گے کہ: "اے اللہ! سب کچھ آپ نے دے دیا، سب کچھ مل گیا، اب جمال خداوندی دکھلا دیجئے، پس ہم اس کو مانگتے ہیں۔"

کیفیت جمال ...... یہ دعاء و درخواست قبول کی جائے گی۔ اور حدیث میں ہے کہ پہلے حق تعالی فرمائیں گے: اَنْ كَمَآ اَنْتُمْ. "ہر چیز اپنی جگہ ٹھہری رہے" اس لیے کہ اگر یہ نہ فرمائیں تو: لَاَحْرَقَتْ سُبُحَاتُ وَجْهِهٖ مَابَيْنَ يَدَيْهِ. ① اس کے چہرے کی پاکیزگیاں ہر چیز کو جلا کر خاکستر کردیں۔

چوں سلطان عزت علم برکشد   جہاں سر بزیب علم درکشد

جب سلطان عزت نمایاں ہوگا پھر کس کا وجود باقی رہ سکتا ہے۔ ایک آفتاب جو اس کی مخلوق ہے، اگر ٹکٹکی باندھ کر ایک منٹ دیکھ لو تو غیر آفتاب سب نگاہ سے غائب ہو جاتا ہے۔ تو آدمی جدھر نگاہ کرتا ہے آفتاب ہی کی ٹکیہ نظر آتی ہے، سرخ یا سبز یا زرد۔ غیر آفتاب محو ہو جاتا ہے، آنکھوں میں کسک نہیں رہتی کہ دیکھے۔ اپنے اندر بھی نگاہ ڈالے گا وہاں بھی آفتاب نظر آئے گا، ادھر دیکھے گا وہاں بھی آفتاب، تو آفتاب ایک مخلوق ہے۔ اس کی نورانیت کا یہ عالم ہے

① الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، باب فی قوله علیه السلام ان الله لاینام ج: ۱ ص: ۴۱۹ رقم: ۲۶۳.

کہ اگر پل بھر دیکھ لے تو ہر ماسوا غائب ہو جاتا ہے۔ تو اللہ رب العزت کا جمال منکشف ہو اور تجلی کھلے اور پھر غیر کا کہیں وجود رہ جائے؟ ممکن نہیں وجود ہی باقی نہ رہ سکتا۔ یہاں یہ ہوتا ہے کہ آفتاب کو دیکھنے کے بعد اشیاء کا وجود تو ختم نہیں ہوتا ہماری نگاہ میں ختم ہو جاتا ہے، ہم نہیں دیکھ سکتے، لیکن وہاں وجود نہیں رہ سکتا۔ اس لیے وجود کا سرچشمہ حق تعالیٰ ہے جب اصل وجود آئے گا تو ضمنی وجود کا پتہ بھی باقی نہیں رہے گا۔ اس لیے پہلے ہی فرما دیں گے۔ اَنْ کَمَآ اَنْتُمْ ۔ ہر چیز اپنی جگہ ٹھہری رہے۔ اور اس کے بعد حجابات اٹھنے شروع ہو جائیں گے۔ بس صرف ایک حجاب کبریائی و عظمت کا رہ جائے گا۔ باقی سب حجابات اٹھ جائیں گے اس وقت بندے عیاناً اپنے پروردگار کو دیکھیں گے۔

کیفِ جمال...... اور اتنے گم ہوں گے کہ نہ جنت یاد رہے گی نہ اور کوئی نعمت یاد رہے گی بلکہ یوں محسوس ہوگا کہ اب تک کوئی نعمت ملی ہی نہیں تھی۔ سب چیزیں ردی تھیں جو ہمیں ملی تھیں۔ اب نعمت ہمیں ملی ہے۔ اس دیدار کا اثر یہ ہوگا کہ قلب کے اندر قوت و اطمینان پورے انشراح کے ساتھ رک وپے میں اور زیادہ پھیل جائے گی چہروں کا نور اور جمال اتنا بڑھ جائے گا کہ لوگ سو فیصد خوبصورت اور حسین بن جائیں گے۔ اس طرح سے یہ دربار ہفتے میں ایک دن ہوگا۔

اور اس کے بعد فرمائیں گے کہ اہل جنت! اب اپنے اپنے محلات کو جاؤ۔ اور ہفتہ بھر بعد پھر دربار منعقد ہوگا۔ تو انبیاء علیہم السلام ہر وقت گویا حاضر باشانِ دربار رہیں گے، اکمل اولیاء اللہ ہفتے میں تین بار حاضر باش ہوں گے۔ عامہ مؤمنین کو ہفتے میں ایک دن دیا جائے گا، تو سرکاری مہمان خانہ اتنا قریب ہونا چاہیے کہ بادشاہ کے پاس آمد و رفت پائی جائے۔ اس لیے جنتوں کو عرشِ عظیم کے نیچے رکھا گیا۔

جنت کی لائٹ کا نظام...... حتی کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جنتوں میں جو چاندنا ہوگا، آفتاب اور ماہتاب نہیں ہوں گے۔ آفتاب بے چارہ کی کیا حقیقت؟ عرشِ عظیم کی روشنی سے جنت روشن رہے گی اور یکساں روشنی رہے گی وہاں رات نہیں آئے گی یکساں روشنی رہے گی۔

اور اس کی مثال احادیث میں دی گئی ہے کہ صبح صادق کے بعد جو چاندنا ہوتا ہے سورج نکلنے سے پہلے ٹھنڈا چاندنا، تو اس کے اندر آنکھیں خیرہ بھی نہیں ہوتی آنکھوں میں چبھن نہیں ہوتی، بلکہ فرحت کا اثر پیدا ہوتا ہے، وہ نوعیت ہوگی جنت کے چاندنے کی اور بارہ مہینے ایک سا چاندنا رہے گا۔

وہاں دن اور رات کا ہیر پھیر نہیں، تو جنت میں روشنی عرش کی ہوگی اس سے گویا قرب دکھلایا گیا ہے کہ سرکاری مہمانان خانہ ہے تو مہمان خداوندی قریب میں رہیں گے، تو بعید نہیں ان کو رکھا جائے گا۔ بعید تو مجرم رہا کرتے ہیں۔ تو مجرمین البتہ ساتویں زمین کی تہ میں جہنم میں رکھے جائیں گے، تو میں نے عرض کیا کہ جب دار السلطنت بنتا ہے تو سب چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ قلعہ بناتے ہیں، قلعہ کے اندر تخت رکھتے ہیں، اس کی حفاظت کے سامان رکھتے ہیں اور سرکاری مہمان خانہ بنتا ہے، تو قلعہ شاہی کے بارے میں تو فرمایا گیا کہ: اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا. ''وہ ذات ہے بادشاہ۔ اللہ کی ذات شاہانہ وہ ہے کہ اس نے سبع سات آسمانوں کے تہہ بہ تہہ قلعے بنائے''۔ اور فرماتے ہیں مضبوطاً اتنا

کہ مَاتَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ''تم اگر غور سے دیکھو تو اس کے اندر کوئی فرق نہیں''، کوئی دراڑ نظر آرہا ہے، کوئی اونچ نیچ نظر آرہی ہے، کچھ بھی نظر آرہا ہے یکساں ہے ہزاروں برس سے یکساں ہے، نہ اس کی کوئی مٹی جھڑتی ہے، نہ پلستر گرتا ہے نہ کوئی اینٹ گرتی ہے۔ جس حالت میں ہے اسی حالت میں ہے۔

شاہی قلعوں کی مضبوطی اور ان کا میٹریل...... اس لیے کہ وہ دھاتوں سے بنائے گئے ہیں، حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ۔ پہلا آسمان چاندی کا ہے، دوسرا سونے کا ہے، تیسرا زمرد کا ہے، چوتھا یاقوت کا ہے پھر الماس کا ہے اور ساتواں آسمان خالص ایک موتی کا ہے، لیکن کیسا ہوگا چاندی سونا؟ یہ یہاں کا چاندی سونا نہیں۔ دنیا میں چاندی سونے میں کچھ نہ کچھ کدورت، کچھ نہ کچھ سیاہی ملی ہوئی ہوتی ہے۔ روپیہ گننے بیٹھے تو دس پانچ منٹ میں انگلیاں کالی ہو جاتی ہیں، انگلیوں میں بو آنے لگتی ہے۔ تو وہاں کا سونا اور چاندی کدورت ملا ہوا نہیں خالص سونا، تو وہ آسمان زمین سونے اور چاندی جواہرات اور خالص موتی کے ہیں۔ اس واسطے ان میں کوئی جوڑ بھی نہیں، کہ بھئی اینٹ ہی گر گئی، چونا نکل گیا، یہ نہیں ایک ذات ہے سارا آسمان مَاتَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ. تم کوئی فرق نہیں دیکھو گے اللہ کی بناوٹ میں۔ اس لیے کہ یہ شاہی قلعہ ہے تمہارا مکان نہیں بنا ہوا۔ اللہ نے اپنا مکان بنایا ہے۔ مَاتَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ . پھر دوبارہ لوٹا کر نگاہ کرو۔ کوئی فطور نظر آتا ہے تمہیں؟ پھر لوٹا ؤ نگاہ کو...... دو مرتبہ دیکھ نگاہ لوٹ کر آئے گی۔ اور نامراد واپس ہوگی، کوئی عیب لے کر نہیں آئے گی، چونکہ دار السلطنت کو انتہائی طور پر مضبوط بناتے ہیں، فطرت یہی ہے تو فطرت الٰہی، سے تو یہ فطرت انسانوں نے لی ہے، وہاں اصل فطرت نے کام کیا۔

دار الحکومت کی افواج...... تو سب سے پہلے دار الحکومت کی تعمیر کی گئی اور اس میں سات شہر پناہیں بنائی گئیں اور شہر پناہوں کے اندر فوجیں رکھی گئیں اور فوجیں ہیں ملائکہ، جو نہایت ہی قوی فوج ہے کہ اگر سارے جہان، ساری کائنات، سارے شیاطین بھی مل جائیں تو ایک فرشتہ ان کے قابو میں نہیں آسکتا۔

حدیث میں ہے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے بارے میں ہے کہ ان کی دو صفتیں قرآن کریم میں بیان کی گئیں ہیں۔ ایک قوی اور ایک امین کہ وہ قوی بھی ہیں اور امانت دار بھی ہیں، تو امانت کے بارے میں تو یہ فرماتے ہیں حضرت جبرئیل کہ اللہ کے لاکھوں اسرار میرے سینے میں ہیں، آج تک میں نے ظاہر نہیں کیے۔ حق تعالیٰ ہی کا امر ہوتا ہے تو کسی مخصوص بندے پر کوئی ایک چیز ظاہر کرتا ہوں، جسے ہم لوگ عارف کہنے لگتے ہیں کہ فلاں بزرگ معرفت رکھتے ہیں۔ اور اسرار خداوندی کو جاننے والے ہیں تو کروڑوں اسرار میں سے بذریعہ ملائکہ کے کوئی ایک آدھ چیز قلب میں ڈال دی جاتی ہے۔ وہ ہماری معرفت بن جاتی ہے تو اس ذات کے بارے میں قیاس کیا جائے کہ جبرئیلؑ کتنے بڑے عارف اور کتنے بڑے صاحب معرفت ہیں۔ فرماتے ہیں کہ لاکھوں اسرار میرے سینے میں محفوظ ہیں۔ آج تک میں نے انہیں کسی سے ظاہر نہیں کیا، وہ امانت خداوندی ہیں، تو امانت کا تو یہ حال ہے۔

اور قوت کا یہ عالم ہے کہ جب حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب آیا تو جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ تم ان کی بستیاں پلٹ دو، انہوں نے ایک ہاتھ ڈال کے وہ سارے شہر اور اقلیم ایک ہاتھ سے اٹھا کر اوندھے کر دیئے، ان کو پلٹ دیا، یہ حال قوت کا ہے تو فرشتے کی یہ طاقت ہے تو جیسا بادشاہ ویسی اس کی فوج، بادشاہ لامحدود قوت والا ہے تو اس کی فوج بھی اتنی قوت والی ہے کہ ایک فرشتہ پورے جہان کے لیے کافی ہے۔ سب کو اٹھا کر لوٹ دے، تو ملائکہ علیہم السلام ان آسمانوں میں مقیم کیے گئے، جیسے فوجی۔

فوج کی عظمت وتقدس...... چونکہ بادشاہ سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ ہے اور پاک ہے اس لیے فوجیں بھی پاک، دنیا کی فوجوں میں تو ایک درجے کا تعین بھی ہوتا ہے آزادی بھی ہوتی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ فوجی کو تو سات خون معاف ہیں، جس پر چاہے گولی چلا دی، کسی بستی میں گھس گئے تو ناموس تباہ ہوتا رہتا ہے، آبروئیں جاتی رہتی ہیں، کھیت اجڑ جاتے ہیں، باغ اجڑ جاتے ہیں۔ لیکن وہ اللہ کی فوج ہے، اس کے قلعوں کے محافظ ہیں، وہ پاکباز مخلوق ہیں۔ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ نہایت ہی کرام والے مکرم بندے ہیں، کرامت والے بندے ہیں۔ سب صاحب کرامت ہیں۔ اور: لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ① "کبھی اللہ کی نافرمانی نہیں کی ہمیشہ احکام ربانی کے پابند ہیں"۔ منشاء ربانی کو پاتے ہیں تو کر چلتے ہیں، تو مخلوق بھی نہایت پاکباز ہے، جس کی فوج بنائی گئی ہے کہ اس سے زیادہ مطیع اور مقدس مخلوق دوسری نہیں اور ان کا کام دن رات اطاعت اور عبادت ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ آسمانوں میں چار انگشت جگہ خالی نہیں ہے، کہ کوئی نہ کوئی فرشتہ مصروف عبادت نہ ہو۔ تو اتنی فوجیں رکھی گئیں ہیں کہ چار انگشت جگہ خالی نہیں ہے کہ کوئی سپاہی موجود نہ ہو، تو ان گنت فوج اس لیے کہ جیسا بادشاہ ویسی بادشاہی، ویسی ہی اس کی فوج، ویسی ہی پاکباز فوج۔ گویا سات قلعے بنے اس میں فوجیں رکھی گئیں اس کے اوپر وہ خندق ہے جو سمندر ہے جس کی ایک ایک موج زمینوں آسمانوں کے برابر ہے۔ اور اس کے اوپر جا کر ہے کرسی اور کرسی اتنی بڑی کہ سارے آسمان اس کے سامنے ایسے ہیں جیسے چھلا۔ وہ پائیدان ہے عرش کا۔

مرکز نفاذ احکام...... کرسی کے بارے میں علماء لکھتے ہیں کہ تخت پر چڑھنے کے لیے جو سیڑھی بنائی جاتی ہے وہ کرسی درحقیقت عرش پر چڑھنے کا پائیدان ہے، تو جب سیڑھی اتنی بڑی ہے تو عرش کتنا ہوگا۔ جو ساری کائنات کو گھیرے ہوئے ہے، تو یہ تخت شاہی جس سے يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ ② اللہ نے عرش پیدا کیا۔ اور اس پر سے ہی تدبیرات الٰہیہ جاری ہوتی ہیں۔

ان جہانوں میں جو کچھ چیزیں ہیں وہ دنیا ہو یا ستارے ہوں، ان سب میں جو امر خداوندی جاری ہے وہ عرش سے چلتا ہے احکام وہاں سے نافذ ہوتے ہیں يُدَبِّرُ الْاَمْرَ تدبیر امر وہاں سے ہوتی ہے۔

تو عرش عظیم گویا سب سے بڑی علامت ہے حکومت کی، اسی واسطے کہا کرتے ہیں کہ تخت کے سامنے ادباً

---

① پارہ: ۲۸، سورۃ: التحریم، الآیۃ: ۶۔ ② پارہ: ۱۱، سورۃ :یونس، الآیۃ: ۳.

نذریں پیش کی جائیں۔ یوں نہیں کہتے کہ بادشاہ کو نذر دے رہے ہیں۔۔ درباری تخت کے سامنے نذر پیش کر رہے ہیں۔یعنی بادشاہ تو بڑی چیز ہے۔وہاں کس کی پہنچ ،تخت شاہی کے پائے کو چومتے ہیں وہی اظہار عقیدت ہوتا ہے بادشاہ سے،تو عرش عظیم گویا علامت ہے شہنشاہی الٰہی کی اس کے سامنے نذریں پیش کرتے ہیں،اس کے سامنے اطاعت کے لیے جھکتے ہیں۔

سورج مرکز سے باجازت طلوع ہوتا ہے...... حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ یہ سورج جب چلتا ہے تو اذن حاصل کرتا ہے، پہلے سجدہ کرتا ہے عرش کے نیچے اور پھر کہتا ہے: اجازت ہے جانے کی۔؟ اجازت مل جاتی ہے تو پھر اپنا دورہ پورا کرتا ہے۔ دورہ کے بعد پھر پہنچا، پھر اذن چاہا، قیامت کے دن فرمائیں گے کہ آگے جانے کی اجازت نہیں۔ پیچھے لوٹ جا،تو آفتاب طلوع کرے گا مغرب سے اور وسط میں آ کر پھر لوٹ جائے گا،اس کے بعد پھر حسب معمول طلوع ہونے لگے گا یہ علامت کبریٰ ہوگی قیامت کی،....

بہر حال تخت کے آگے جھکنا یہ بادشاہ کے آگے جھکنا ہے۔تو سب سے بڑا نورانی کرہ اس عالم میں آفتاب ہے وہ روزانہ سجدہ کر کے عرش کے نیچے اجازت طلب کرتا ہے،تب اسے جانے کی اجازت ملتی ہے۔تو سرکاری مہمان خانہ بھی ہوگیا اور شاہی قلعہ بھی ہوگیا اور شاہی قلعہ کی فوج بھی ہوگئی اور عرش عظیم بھی اس کے اوپر تک گیا۔

حکومت الٰہی کی پالیسی...... اب بادشاہ کے لیے تاج بھی درکار ہوتا ہے مگر حق تعالیٰ شانہٗ کے لیے تاج مناسب نہیں کہ تاج بادشاہ کے سر کے بھی اوپر ہوتا ہے اور اَللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ہے اس سے بلند کوئی چیز نہیں۔ اس لیے وہاں تاج کی مثال ایسی رکھی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ عرش پر حق تعالیٰ نے ایک لوح اور تختی رکھی کہ جس کی بڑائی زمینوں اور آسمانوں سے بھی کہیں زیادہ ہے،اس پر لکھ کر رکھا ہوا ہے۔اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ. ①
''میری رحمت ہمیشہ میرے غضب کے اوپر غالب رہے گی''۔

اگر گنہگار آئے کہ نیکیاں کی بھی ہوں اور جرم بھی۔ پہلے رحمت بڑھے گی کہ نیکیوں کا صلہ لے،غضب نہیں بڑھے گا کہ اس کو سزا دے۔ اگر کسی نے جرائم ہی جرائم کیے ہوں تو مجبوری کو غضب بڑھے گا،ورنہ رحمت ہی بڑھے گی اور آغوش رحمت میں اٹھائے گی۔تو یہ دستاویز رکھی،یہ وہ ہے جیسے کہا کرتے ہیں،حکومت کی پالیسی حکومت جب پالیسی بناتی ہے،منشور بناتی ہے تو فلاں قوم کے ساتھ یہ برتاؤ ہوگا اور فلاں قوم کے ساتھ یہ برتاؤ ہوگا۔وہ پالیسی طے ہوجاتی ہے۔تو پھر وزراء امراء سب اسی پر عمل کرتے ہیں تو پالیسی حکومت الٰہی کی یہ طے ہوئی کہ رحمت الٰہی غالب رہے گی،غضب پیچھے رہے گا۔

استحکام حکومت کا اصول...... اسی واسطے عرش عظیم پر جب بادشاہی کی حیثیت سے حق تعالیٰ نے استویٰ فرمایا تو

---

① الصحیح لمسلم، کتاب التوبۃ،باب سعۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ وانہا سبقت غضبہٗ ج:۴ ص:۲۱۰۸ رقم:۲۷۵۱.

فرماتے ہیں: اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی . ① رحمٰن چھا گیا عرش کے اوپر۔ یوں نہیں کہا: اَلْقَهَّارُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی. قہر والا چھا گیا۔ اَلْغَضَّابُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی .غضب والا چھا گیا۔

اگر غضب کی تجلی چھاتی تو ساری کائنات ختم ہو جاتی، رحمت کے ساتھ سب کے ساتھ معاملہ کیا جا رہا ہے۔ یہ رحمت کے ساتھ ہے تو شکل ایسی بن گئی کہ ساری کائنات، اس کے اوپر آسمان اس کے اوپر دریا، اس کے اوپر عرش ،عرش کے اوپر رحمت خداوندی تو گویا پوری کائنات کو رحمت نے ڈھانپ رکھا ہے۔ رحمت نے چلا رکھا ہے۔ اس سے گویا اشارہ نکلتا ہے کہ جو بادشاہ غضبناک ہو وہ ملک کو زیادہ دیر تک نہیں چلا سکتا۔ وہی بادشاہ چلا سکتا ہے جس میں شفقت اور کرم غالب ہو اور جس کے اندر قہر اور غضب اور تعصب اور عناد غالب ہوگا زیادہ دیر اس کی حکومت نہیں چل سکتی وہ ختم ہو جائے گی۔ گویا اصول نکل آیا کہ پائیدار حکومت بنانا چاہتے ہو تو ایسے شخص کو بادشاہ بناؤ جو رحیم وکریم ہو۔ جس کی رحمت غالب ہو، غضب مجبوری کو جائے، جب مجرمین تنگ ہی کر دیں تب جا کر غضب کے احکام نازل کرے ورنہ رحمت چلتی رہے تو پہلے تو فرمایا: اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا بادشاہانہ وہ ذات ہے اللہ کی جس نے سات طبق میں آسمان بنائے، اور: مَاتَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ. تم اللہ کی بناوٹ میں کوئی فرق نہیں محسوس کرو گے۔ اور ہم کہتے ہیں: فَارْجِعِ الْبَصَرَ نگاہ کو لوٹاؤ، غور کرو، ہے کوئی فرق؟ نہیں ہے۔ پھر لوٹاؤ، دوبارہ لوٹاؤ، تو لوٹ کر آ جائے گی نگاہ مگر کوئی عیب اور فرق نہیں نکال سکے گی۔

بے مثال روشنی کا انتظام...... اب ظاہر بات ہے کہ قلعے تو بن گئے مگر اس میں اندھیرا بھٹ پڑا ہو تو رہنے والے کیسے رہیں گے، ظلمت ہو، تاریکی ہو تو ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے گا کام کیسے چلے گا اس لیے آگے فرمایا: وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ . بڑے بڑے چراغوں سے اور ہنڈوں سے ہم نے روشن کیا۔ آسمان دنیا کو، اور وہ چاند اور ہنڈے وہ چاند سورج ہیں، ستارے ہیں اور وہ ہماری ضرورت اس لیے کہ آسمان سے بالاتر جو عرش عظیم کی روشنی ہے جنتوں میں بھی، وہاں خوبصورت چاند کی نہیں چلتی۔ یہ تو معمولی درجے کی روشنی ہے، تو دنیا والوں کو ضرورت تھی، انہیں کے لیے چھت بنایا آسمان دنیا کو، اور طبعی طور پر لالٹینیں چھت میں ٹانگی جاتی ہیں۔ زمین میں چراغ کوئی نہیں رکھا کرتا یا دیوار پر لگا تا ہے یا چھت کے قریب اور جب بجلی کی روشنی ہو تو قمقمے تو چھت ہی میں ٹانگے جاتے ہیں۔ تکلف کے طور پر وہ دیوار میں لگا لے لیکن اصل مقام چھت ہے۔ اسی واسطے دنیا کی چھت بنایا آسمان دنیا کو اور اس آسمان سے نیچے یہ تمام ہنڈوں کا ایک نظام سجا دیا، کوئی زیادہ روشن، کوئی کم روشن۔ سورج تیز روشن ہے تاکہ کام کاج کر سکیں۔ دن کا وقت ہے۔ رات میں ضرورت پڑتی ہے سونے کی تو سورج نہیں چمکایا چاند چمکایا تاکہ ٹھنڈی روشنی ہو۔ بالکل اندھیرا گھپ ہوگا تو وحشت بڑھے گی، نیند نہیں آئے گی۔ کچھ چاندنا بھی ہو، مگر نگاہوں میں چبھنے والا نہ ہو۔ تو چاند کی روشنی رکھی۔

① پارہ: ۱۶، سورۃ: طٰہٰ، الآیۃ: ۵۔

یہ وہی روشنی ہے مگر وہ ریفریجریٹر کے اندر کونکل رہی ہے کہ جو ٹھنڈی کر کے پیش کی جاتی ہے۔ تو وہی سورج کی روشنی یہاں چاند میں ٹھنڈی بنادی گئی اور اگر چاند بھی نہ ہو تو کروڑوں ستارے روشن کر دیئے کہ کچھ نہ کچھ چاندنا رہتا ہے زمین پر، اگر ایک بھی ستارہ نہ ہوتا تو گھپ اندھیرا ہو جاتا، اس لیے فرمایا کہ ہم نے کائنات بنائی تو روشنی کا بھی سامان کیا۔ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ .

دفاعی نظام ...... اب ظاہر بات ہے کہ جتنی بڑی سلطنت ہوتی ہے اتنے ہی بڑے دشمن بھی ہوتے ہیں۔ تو فوجیں بے شک قوی ہیں، سلطنت بڑی عظیم ہے مگر جتنی بڑی حکومت ہے اتنے بڑے ہی دشمن بھی۔ سارے شیاطین دشمن ہی تو ہیں، یہ کب چاہتے ہیں کہ اللہ کا حکم چلے، انبیاء علیہم السلام احکام لے کر آتے ہیں، ساتھ ہی انہیں چلانا چاہتے ہیں لیکن قدم قدم پر شیطان رکاوٹیں ڈالتا ہے۔ تو ایک پل بھر کے لیے شیطان نہیں چاہتے کہ احکام خداوندی دنیا میں چلیں بلکہ سارے آدمی مل کر اللہ کے دشمن بن جائیں، مدمقابل آجائیں۔

تو حق تعالیٰ نے اپوزیشن پارٹی بھی پیدا کی، حالانکہ اس کی حکومت کو ضرورت نہیں تھی مگر ایک مخالف پارٹی پیدا کی تاکہ اس کا کام یہی ہو کہ اللہ کی حکومت میں دین میں اعتراضات نکالتی رہے۔ تاکہ دوست تو یہ سمجھیں کہ یہ اعتراض کی چیز ہے، اس کا یہ جواب دیں گے تو ان کا علم وسیع ہے اور دشمن جتنے ہیں وہ بھول بھلیاں میں رہیں تاکہ اچانک جب پنجۂ گرفتاری کا عذاب آئے تو اس وقت اچانک گرفتار کر لیا جائے۔ تو دوست بھی اپوزیشن پارٹی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دشمن عداوت میں فائدہ اٹھاتے ہیں، دوست محبت اور دوستی میں فائدہ اٹھاتے ہیں۔

بہر حال ایک مخالف پارٹی کا وجود فطرت ہے ضروری ہے۔ ترقی نہیں ہوسکتی جب تک کہ مخالفت کرنے والی کوئی جماعت نہ ہو۔ اس واسطے شیاطین کی جماعت پیدا فرمائی جس کا کام مخالفت ہے اور جب ہے تو وہ جیسے دنیا میں نہیں چاہتی کہ اللہ کی حکومت قائم ہو۔ وہ آسمانوں میں بھی نہیں چاہتی کہ اللہ کی حکومت قائم ہو، لیکن آسمان قلعے ہیں۔ اگر وہاں حکومت ختم ہو تو دنیا میں بھی باقی نہیں رہے گی، اس لیے ان کی کوشش ہے کہ وہیں سے مٹانے کی کوشش کرو، اس لیے حق تعالیٰ نے حفاظتی سامان بنایا تو فرمایا کہ ستارے جو ہم نے مصباح اور چراغ بنادیئے ہیں انہی سے بموں کا بھی کام لیتے ہیں وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ .

جہاں شیاطین آسمان کے کناروں تک پہنچے اور یہ بم ان کے اوپر برسنے شروع ہوئے شہاب ثاقب اور یہ بھسم ہو جاتے ہیں۔ تو گویا ملائکہ علیہم السلام سارا گولہ بارود کا سامان لیے ہوئے ہیں۔ بم بھی ان کے ہاتھ میں ہے۔ جہاں دشمن الٰہی آسمانوں کے قریب پہنچا وہیں سے انہوں نے وہ گولہ پھینک کے مارا اور وہ بھسم ہوا

تو فرماتے ہیں کہ ان چراغوں سے ہم دو کام لیتے ہیں۔ ایک روشنی کا اور اس کے ساتھ ساتھ دشمنوں کے دفع کرنے کا، تو مدافعت کا سامان بھی ہمارے یہاں پورا ہے اور پوری طاقت موجود، ساری دنیا کے شیاطین جمع ہو جائیں وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور وہ دروازے میں بھی قدم نہیں رکھ سکتے۔ وہ تو ذرا قریب پہنچے وہیں سے ان کے

اوپر بم پڑا وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ .

دنیا میں حق کے ساتھ باطل کو بھی باقی رکھا جاتا ہے۔ اب اس کے بعد شیاطین تو پٹ پٹا گئے ،مگر وہ انسانوں کے دشمن ہیں وہ تو چاہتے ہیں .....کہ انہیں بھی اللہ سے جدا کرو،تو بہت سوں کو ورغلانے سے خدا کی دشمنی پرآمادہ کردیتے ہیں کہ انبیاء علیہ السلام کی بھی مخالفت کریں ،اولیاءاللہ کی بھی مخالفت کریں،علماء ربانی کی بھی صلحاء امت کی بھی سب کے مدمقابل آئیں اورایسی ایسی چیزیں کریں گے کہ حق کا کارخانہ درہم برہم ہوجائے۔

یہ ایسا کرتے رہتے ہیں،تو فرماتے ہیں انہیں ہم دنیا میں تباہ نہیں کریں گے،دنیا تو آزمائش گاہ ہے،اگر وہ یہ تباہ ہوجائیں تو حق کے علو کا سامان کیا رہے حق تو باطل ہی کے مقابلے میں اونچا ہوتا ہے تو باطل بھی باقی رکھیں گے۔باقی اخیر میں ایک جیل خانہ ہم نے ان مجرموں کے لیے تیار رکھا ہے،تو یہ شیاطین مع اپنے شتونگڑوں کے مع اپنی پارٹی کے سب اس کے اندر جائیں گے اور وہ اپوزیشن پارٹی وہ ساری کی ساری ختم کردی جائے گی۔اس لیے کہ حکمرانی کا جنتوں میں کارخانہ خالص حق کا ہوگا وہاں باطل کا نشان نہیں۔دنیا میں حق اور باطل کی آمیزش تھی۔ دونوں پارٹیاں گڈمڈ کیں۔

آخرت میں حق وباطل کا امتیاز کردیا جائے گا...... جب مخلوط عالم ختم ہو:اب رہ گئے خالص عالم۔تو جنت خالص حق کا عالم ہے اور جہنم خالص مصیبت کا عالم ہے۔ساری اپوزیشن وہاں اور سارے مطیع یہاں الگ الگ کردیئے جائیں گے۔وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ ''ان کے لیے ہم نے ایک نہایت کھولتا ہوا عذاب تیار کررکھا ہے تو وہ وہاں پہنچادیئے جائیں گے''۔وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ . اور جتنے ان کی پیروی کریں گے ان شیاطین کی ان کے لیے وہ ہی کارخانہ موجود ہے وہ سرکاری جیل خانہ کہ جس میں مجرموں کو رکھا جائے گا۔

سرکاری جیل خانہ کی اندرونی کیفیت......اور ساتھ میں ان کی کیفیت بھی بیان کی کہ اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّهِيَ تَفُوْرُ . جب داخل کئے جائیں گے جہنم میں تو جہنم کے جوش کا یہ عالم ہوگا کہ جیسے غضب ناک ایک چیز ہوتی ہے اور جوش سے پھٹ پڑے۔ہیبت ناک آوازیں اور اس کی ہیبت ناک لپیٹیں اور اس کی ہیبت ناک تیزی سے یہ معلوم ہوگا کہ جیسے وہ کھول رہی ہے اور غضب ناک ہے پھٹ پڑے گی۔تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ '' گویا غیظ کے سبب سے پھٹ جائے گی''۔

ملائکہ جہنم کا اپوزیشن سے مقابلہ...... كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ جب کفار کی کوئی پارٹی ڈالی جائے گی تو جہنم کے جو محافظ اور نگران ملائکہ ہیں سوال کریں گے کہ:اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں پہنچا تھا؟ جس نے اس جہنم سے تمہیں ڈرایا ہو اس عذاب خداوندی سے؟ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ ڈرانے والے پہنچے،مگر ان پر تمام حجت کے لیے اور ان میں حسرت پیدا کرنے کے لیے کہ عذاب دوگنا تگنا ہوجائے ان سے

کہیں گے کہ: اَلَمۡ یَاۡتِکُمۡ نَذِیۡرٌ کوئی ڈرانے والا تمہارے پاس نہیں پہنچا کسی نے نہیں بتلایا کہ اللہ کا جیل خانہ بھی تیار ہے: قَالُوۡا بَلٰی قَدۡ جَآءَ نَانَذِیۡرٌ ۔ شرمندگی سے کہیں گے کہ ہاں پہنچے۔ ہمارے پاس ڈرانے والے آئے۔

جنہوں نے حق کا راستہ دکھلایا، محبت اور پیار سے سمجھایا بَلٰی قَدۡ جَآءَ نَا نَذِیۡرٌ فَکَذَّبۡنَا ۔ ہم نے انہیں جھٹلایا۔ وَقُلۡنَا مَا نَزَّلَ اللّٰہُ مِنۡ شَیۡءٍ اللہ نے کوئی چیز نہیں بھیجی ہے یہ تمہارے بنائے ہوئے ڈھکوسلے ہیں،..... کچھ مولویوں نے بنالیا ہے، کچھ علماء نے بنالیا ہے۔ یہ تمہاری بنائی ہوئی چیزیں، خدا نے کوئی چیز نہیں بھیجی اس نے تو عقل بھیجی وہ ہمارے پاس موجود ہے ہم اس سے سمجھتے ہیں۔ فَکَذَّبۡنَا وَقُلۡنَا مَا نَزَّلَ اللّٰہُ مِنۡ شَیۡءٍ اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ کَبِیۡرٍ ○ وَقَالُوۡا. اس وقت وہ کہیں گے: لَوۡ کُنَّا نَسۡمَعُ اَوۡنَعۡقِلُ مَا کُنَّا فِیۡۤ اَصۡحٰبِ السَّعِیۡرِ کہیں گے: اے کاش! ہم کچھ سوچ لیتے یا مان لیتے تو یہ عذاب کا دن ہمیں نصیب نہ ہوتا۔

تلاشِ حق کے (۲) دوراستے ..... اس لیے کہ حق کے ماننے کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو یہ کہ آدمی بلا چون وچراں مان لے کہ یہ کہنے والا حق پر ہے، اس کے ساتھ علامت حقانیت تھی تو مان لے تو سمع اور طاعت تھی کہ کانوں سے سنا اور اطاعت کی اور اگر محض سن کر اطاعت نہ ہو، کچھ چھان بین کی ضرورت ہے تو پھر عقل دی ہے۔ اللہ نے اس عقل سے غور کرے اور حق کے طلب کرنے کی کوشش کرے تو وعدۂ خداوندی ہے کہ جب عقل لڑا کر چاہے گا آدمی کہ ہدایت پا جاؤں تو ضرور ہدایت دیں گے۔ وَالَّذِیۡنَ جَاهَدُوۡا فِیۡنَا لَنَهۡدِیَنَّهُمۡ سُبُلَنَا ۔ (القرآن) جو ہمارے راستے میں جدوجہد کرے گا ہم ضرور اسے راستہ دکھلائیں گے۔ تو دیکھنے کے راستے کی دو ہی صورتیں ہیں یا سمع وطاعت کہ سن کر اور مان لے اطمینان کرلے آدمی یا یہ کہ پھر عقل لڑا کر غور کرلے اور سوچ سمجھ کر مانے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے دونوں سے کام نہ لیا۔ لَوۡ کُنَّا نَسۡمَعُ اَوۡنَعۡقِلُ یا ہم سن لیتے انبیاء کی بات یا خود اپنی عقل سے سوچتے کہ کوئی فرمانروا موجود ہے، کوئی بادشاہ عالمین موجود ہے تو: مَا کُنَّا فِیۡۤ اَصۡحٰبِ السَّعِیۡرِ " پھر ہم ان جہنم والوں میں سے نہ بنتے"۔ مگر ہم نے وہ چیز کھودی، وہ وقت گزار دیا۔ لَوۡ کُنَّا نَسۡمَعُ اَوۡنَعۡقِلُ مَا کُنَّا فِیۡۤ اَصۡحٰبِ السَّعِیۡرِ ○ فَاعۡتَرَفُوۡا بِذَنۡۢبِهِمۡ ۔

اعتراف بے وقت ..... اس وقت اعتراف کریں گے اپنے گناہ کا مگر اس وقت اعتراف کرنے سے کیا فائدہ؟ وہ مثل مشہور ہے کہ اب پچھتائے کیا حوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت، جب کھیت ہی نہ رہا اور چڑیاں ہی نہیں ہیں اب اگر تم نے پرکھا کہ چڑیاں نہیں ہیں تو اب کیا پرکھنا، یہ تو مجبوری کا ایمان ہے۔

وہاں تو ہر ایک مؤمن بن جائے گا جاکے۔ آزمائشی ایمان تو دنیا میں تھا کہ مخالف اسباب موجود تھے۔ مگر پھر انبیاء علیہ السلام کی حقانیت کو سامنے رکھ کر سب چیزوں کو پرے ڈال کر آدمی اطاعت کرتا سنتا، تو کہیں گے کہ افسوس ہم نے وقت کھودیا۔ فَاعۡتَرَفُوۡا بِذَنۡۢبِهِمۡ (مُلک) "اس وقت اعتراف کریں گے اپنے گناہ کا"۔ مگر اس وقت جواب کیا ہوگا۔ فَسُحۡقًا لِّاَصۡحٰبِ السَّعِیۡرِ ۔ (ملک) پھٹکار ہو ان لوگوں کے لیے، ان کو دور دھکیل دو، یہ

قریب بھی نہ آنے پائیں اور زیادہ بعید (دور) سے جہنم میں ڈال دو فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ.

اطاعت کے پاکیزہ ثمرات...... اب جب مجرموں کی بات بتلا دی تو سوال پیدا ہوا کہ مطیعوں کا حشر کیا ہوگا؟ اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ. ① اور جو لوگ غیب سے ڈرتے تھے، غیب مطلق یعنی حق تعالیٰ کو مانا۔ یہ نہیں کہا تھا کہ اللہ کو ہم آنکھوں سے دیکھ لیں جب مانیں گے۔ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً. ② ہم تو اس وقت تک نہیں مانیں گے جب تک اللہ کو آنکھ سے نہ دیکھ لیں۔ تو غیبی چیزیں دیکھ کر نہیں مانی جاتیں، سمجھ کر مانی جاتی ہیں۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ جو ڈرتے بھی تھے اللہ سے اور انہیں خطرہ لگا ہوا تھا کہ وقت آخر آنے والا ہے، جس غیب سے ہم یہاں آئے ہیں لوٹ کر پھر اسی غیب میں جانے والے ہیں۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ جنہوں نے خوف اور خشیت اللہ اختیار کیا قلب کی رقت اور نرمی اختیار کی اور جب کوئی حق بات سامنے آئی تو گردن جھکا دی کہ حق ماننے ہی کے لیے ہوتا ہے۔

ان کے لیے مغفرت بھی ہے، یعنی اگر ان سے کچھ گناہ بھی سرزد ہوئے وہ بخش دیئے جائیں گے اس لیے کہ نیت ان کی نیک ہے۔ عقیدت ان کے قلب میں موجود تھی، بشریت سے کچھ لغزشیں ہو گئیں تو ہماری طرف سے مغفرت تیار ہے اور جو نیکیاں کیں اس کے لیے اجر عظیم تیار ہے، پاکیزہ ثمرات تیار ہیں۔ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ. ٥ وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِاجْهَرُوْا بِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ.

عالمِ انکشاف...... آگے پھر ایک کلیہ فرما دیا کہ تم کسی بات کو چھپاؤ یا کھول کر کہو وہ تمہارے دلوں کی کھٹک سے واقف ہے کوئی چیز تم اللہ سے نہیں چھپا سکتے۔ وہاں مخلوق سے تم نے پردہ ڈال لیا، چھپالی چیزیں مگر وہاں جا کر تو سب عیاں ہو جائیں گی وہ ساری پردہ داریاں، وہ سارے پردے وہاں چاک ہو جائیں گے تو اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ اور اس کی دلیل بیان فرماتے ہیں کہ: اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ کیا پیدا کرنے والا جانے گا نہیں کہ میں نے کیا چیز پیدا کی ہے؟

پہلے تو اسی کو علم ہوگا کہ اس مخلوق میں کیا چیزیں رکھ رہا ہوں، کتنی عقل رکھی ہے میں نے کتنا فہم رکھا ہے۔ کتنا علم رکھا تو جو بنانے والا ہے مخلوق کا وہ تو اس کے اندر باہر سے سب طرح واقف ہے، ورنہ وہ خالق ہی کیسا جو واقف نہ ہو، تو عقلی دلیل بھی بیان فرما دی اور نقلی بھی، فرما دیا کہ وہ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ. ہے اور کیوں نہیں ہوگا عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ. اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ کیا خالق بھی نہیں جانے گا مخلوق کو اور کون جاننے والا ہوگا......؟ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ اور اس کے لیے پھر دلیل یہ کہ وہ اتنا لطیف ہے کہ جسم سے بھی پاک اور روح سے بھی پاک اس لیے وہ تو ہر چیز کی رگوں کے اندر سرایت کیے ہوئے ہے رگ رگ کی اسے اطلاع ہے اور پتہ ہے۔

اس کی ذات ہی منبع انکشاف ہے اسے کوئی باہر سے خبر نہیں دیتا، اس کی ذات میں سے علم پھوٹتا ہے۔ جیسے

① سورة النساء : آيت : ١٥٣ ② پارہ: ١ سورة :البقرة،الآية:٥٥.

آفتاب میں سے کرنیں پھوٹا کرتی ہیں۔ اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۔ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ یہ ہوا گویا پہلے رکوع کا خلاصہ کہ جس کے اندر ذات بابرکات خداوندی کو بیان کیا گیا ہے۔ پھر ان صفات کو جو بادشاہی کے لیے ضروری ہیں پھر ان لوازم سلطنت کو جو بادشاہت کے لیے ضروری ہوتی ہیں، اس کا ایک رکوع کا خلاصہ یہ ہے اب دعا کر لیجئے۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ۔ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ ۝ ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِیَ تَمُوْرُ ۝ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ۔ فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرِ ۝ وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ۔

وہی ہے جس نے تمہارے آگے زمین کو پست کیا، اب چلو پھرو اس کے کندھوں پر اور کھاؤ کچھ اس کی دی ہوئی روزی اور اس کی طرف جی اٹھنا ہے، کیا تم نڈر ہو گئے اس سے جو آسمان میں ہے کہ دھنسا دے تم کو زمین میں، پھر تب ہی وہ لرزنے لگے یا نڈر ہو گئے؟ اس سے جو آسمان میں ہے اس بات سے کہ برسا دے تم پر مینہ پتھروں کا، سو جان لو گے کیسا ہے میرا ڈرانا۔ اور جھٹلا چکے ہیں جو ان سے پہلے تھے، پھر کیسا ہوا میرا عذاب؟۔

ظاہر و باطن پر اس کی حکومت...... ایک حصہ تو وہ ہے جو ان آنکھوں سے نظر آتا ہے اور آ سکتا ہے اور ایک حصہ وہ ہے جو آنکھوں سے نظر نہیں آتا بلکہ روحانی آنکھ سے نظر آتا ہے جو حصہ آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے اس کا نام ہے ملک اور جو حصہ روحانی آنکھ سے نظر آتا ہے اس کا نام ہے ملکوت، دو حصے ہوئے حکمرانی کے ایک ملک اور ایک ملکوت۔ جیسا کہ شروع میں فرمایا گیا کہ تَبَارَكَ الَّذِیْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ برکت والی ہے وہ ذات کہ جس کے ہاتھ میں ملک ہے۔ تو ملک کے جتنے حصے ہیں جو آنکھوں سے نظر آتے ہیں ملک میں داخل ہیں اور عرش سے لے کر فرش تک اور فرش سے لے کر تحت الثریٰ تک جتنے حصے ہیں۔ ان سب کا نام ہے ملک اور جو روحانی آنکھ سے دیکھے جاتے ہیں یعنی عالم روحانیت ہیں اس کو ملکوت کہتے ہیں جس کو سورۂ یٰسین میں فرمایا گیا کہ: فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ '' پاک ہے وہ ذات کہ جس کے قبضے میں ہے ملکوت ہر چیز کا ''۔ دونوں پر اسی کی حکمرانی ہے۔ ظاہر کا ملک عرش سے لے کر تحت الثریٰ تک جس میں عرش عظیم، کرسی، جنتیں آسمان اور پھر زمین کے نیچے جہنم۔ یہ سب عالم ملک ہے اور ان کے اندر جو روحانیت اور معنویت کام کر رہی ہے عرش سے لے کر فرش تک، اسی کا نام ہے ملکوت، وہ باطنی حصہ ہے۔

ملک کے تین علاقے اور ان کے ذمہ دار...... تو اس ملک کے تین حصے قرار دیئے گئے ہیں ایک آسمانوں سے اوپر اوپر، جس میں جنتیں، عرش، کرسی سب داخل ہیں اور ایک آسمانوں سے نیچے نیچے جس میں زمینیں اور دنیا اور اس کے نیچے جہنم یہ سب چیزیں داخل ہیں۔ ان سب کے کچھ ذمہ دار بنائے گئے ہیں جو حق تعالیٰ کی طرف سے حکمرانی کرتے ہیں۔ حکم اس کا چلتا ہے وسائل وہ ہوتے ہیں۔ جیسے آسمانوں میں ملائکہ علیہم السلام ہیں تو سید الملائکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں کہ جن کی حکومت پورے عالم سمٰوٰت میں ہے۔

اس دنیا کے اندر کچھ ذمہ دار بنائے گئے ہیں، تو اصل انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں اور ان کے ماتحت ہیں، ان کی وفات کے بعد پھر جو رہتے ہیں ان میں پھر عہدے ہیں، کسی کا نام ابدال ہے۔ کوئی اقطاب ہے، کوئی اغواث ہے، اس طرح سے تفصیل ہے۔

جیسے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اس دنیا میں ہمیشہ چالیس ابدال رہتے ہیں کہ جن کا باطنی طور پر حکم چلتا ہے۔ ظاہری حکام کے قلوب میں وہی چیز ڈالی جاتی ہے جو ابدالوں میں طے ہوتی ہے۔ ابدالوں کے نیچے پھر اقطاب ہیں، جو چالیس ابدال ہیں وہ شام میں رہتے ہیں جو ایک وفات پاتا ہے، نیچے ترقی دے کر ابدالوں میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ تو وہ ۴۰ کا عدد پورا رہتا ہے۔ پھر اقطاب ہیں ان کے نیچے پھر اغواث ہیں۔ درجہ بدرجہ یہ گویا اس دنیا کے ذمہ دار بنائے گئے ہیں۔ تو ان کے قلوب پر حق تعالیٰ کی مشیت وارد ہوتی ہے اور وہ اسی مشیت سے پھر قلب سے ہمتیں متوجہ کرتے ہیں ان ہمتوں سے ظاہری حکام کے دل میں وہ چیزیں پڑتی ہیں کہ جو ظاہری حکم چلتا ہے۔

اللہ کا خلیفۂ اعظم...... اور پھر حق تعالیٰ کی جانب سے ایک شخصیت وہ بنائی گئی ہے کہ ملک سے لے کر ملکوت تک اسی کی حکمرانی قائم کی گئی ہے۔ وہ اللہ کا خلیفۂ اعظم ہے اور وہ ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کہ سمٰوٰت وارضین میں آپ کے اثرات ہیں۔ اور دلیل اس کی یہ ہے کہ ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے چار وزیر ہیں: وَزِيْرَایَ فِی السَّمَآءِ وَوَزِيْرَایَ فِی الدُّنْيَا ۔ ① دو وزیر میرے آسمانوں میں ہیں اور وہ ہیں جبرئیل اور حضرت میکائیل علیہ السلام اور دو وزیر میرے دنیا میں ہیں اور وہ ہیں ابوبکر صدیق، اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما جو ان کے قائم قام چلتے ہیں دنیا میں۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وزارت عالم سمٰوٰت میں بھی قائم ہے اور عالم ارض میں بھی قائم۔ جیسے بادشاہ کے ماتحت ایک نائب السلطنت ہوتا ہے کہ پوری سلطنت میں اس کا حکم اور اس کے اثرات غالب ہوتے ہیں، وہ ذات بابرکات ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی...... تو اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ کے دو وزیر آسمانوں میں ہیں اور دو وزیر دنیا میں ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ وزیر کا یہی کام ہوتا ہے کہ بادشاہ کے نائب السلطنت کے زیر اثر رہ کر احکام چلائیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ماتحتی سب کے اوپر قائم کر دی گئی۔ اس کا ظہور شب معراج میں فرمایا گیا۔ کہ مسجد اقصیٰ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو امام بنایا گیا اور تمام انبیاء علیہم السلام اور تمام ملائکہ اور حضرت جبرئیل علیہ جو ان کے ذمہ دار ہیں، انہوں نے اقتداء کی۔ گویا ظاہراً بھی دکھلایا گیا کہ آپ بالادست ہیں اور آپ کے ماتحت ہیں انبیاء اور ملائکہ علیہم السلام تو اس طرح سے عالم ملک کا انتظام بٹا ہوا ہے۔ لیکن ایک شخصیت ملک اور ملکوت دونوں میں کام کر رہی ہے اور مشیت خداوندی اس کے قلب پر وارد ہوتی ہے۔ تو اس کا ایک حصہ تو ہے آسمان اور ایک حصہ ہے زمین اور ایک حصہ ہے بیچ میں جو اور فضا یا خلا جسے کہتے ہیں یہ تابع ہے

① السنن للترمذی، کتاب المناقب، باب فی مناقب ابی بکر وعمر رضی اللہ عنہما کلیہما ج: ۱۲ ص: ۱۳۹۔

آسمانوں کے اور زمینوں کے۔ گویا زمین کا پہلے ہے آسمان پہ جو فضا ہے اور آسمان کا ماحول ہے زمین پر وہی فضا، بیچ میں دونوں جہانوں کے، اس لیے اصل دو عالم نکل آئے ایک عالم سمٰوٰت اور ایک عالم ارضین.. تو عالم سمٰوٰت کا ذکر تو پہلے رکوع میں کیا گیا ہے جس کی کچھ تفصیل ابھی کی گئی کہ اس میں جنتیں بھی آجاتی ہیں، جہنم بھی، ماننے والے بھی نہ ماننے والے بھی۔ قانون خداوندی ذات وصفات حق تعالیٰ کی یہ پہلے رکوع میں بیان کی گئی ہیں۔

تسخیر خزائن...... اس دوسرے رکوع میں زمین کا ذکر ہے۔ جس کو فرمایا کہ: هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاکِبِهَا وَکُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ۔ انسانوں کو خطاب فرمایا جارہا ہے کہ زمین کو ہم نے تمہارے لیے ذلیل (مراد تابع) بنا دیا تمہارے کام میں لگا دیا، کتنا عظیم کرہ ہے زمین کا جس میں ہزاروں پہاڑ ہیں جنگل ہیں بحر ہے، بَرّ ہے۔ وہ سب تمہارے لیے مسخر کیا گیا کہ اس مادے سے تم کام کرو، سب سے پہلی چیز ہے انتفاع، اس سے نفع اٹھانا۔

تو زمین میں رزق کے خزانے رکھ دیئے گئے۔ مثلاً کھانے پینے کی چیزیں وہ سب زمین سے نکلتی ہیں۔ اسی طرح سے معدنیات ہیں، جواہرات ہیں وہ زمین سے نکلتی ہیں، سونا چاندی ہو، اسی طرح سے اور معدنیات ہیں جیسے تیل کے چشمے ہیں، پیٹرول ہے، کوئلہ ہے۔ یہ سب چیزیں انسانوں کے کام میں آتی ہیں اور اللہ نے انسانوں کے اندر فطرت میں ان چیزوں کا تصرف ڈال دیا کہ وہ کھود کرید کر کے پتہ چلاتا ہے کہ تیل کے خزانے کہاں ہیں، جواہرات کہاں چھپے ہوئے ہیں، سونا کہاں سے نکلے گا؟ چاندی کہاں سے نکلے گی؟ اس کی تدبیریں ذہن میں ڈال دی گئیں کہ مشینوں کے ذریعہ یا ہاتھ سے دستکاری کے ذریعہ مٹی سے سونے کو الگ کرنے کا یہ طریقہ ہے۔ چاندی کو الگ کرنے کا یہ طریقہ ہے۔

تیل اگر نکلے اس میں اجزاء زمین کے ملے ہوئے ہیں تو صاف کرنے کا یہ طریقہ ہے۔ پہلے لوگ اپنی دستکاری سے صفائی کرتے تھے۔ اب دور مشینی دور ہے تو مشینوں کی بات اللہ نے ذہنوں میں ڈال دی اور ایسی ایسی مشینیں انسان نے ایجاد کرلیں کہ منٹوں میں ہزاروں من مٹی میں سے سونا نکال لیتے ہیں، چاندی نکال لیتے ہیں۔ اسی طرح سے جواہرات، اسی طرح سے قسم قسم کے پتھر، سنگِ خارا اور سنگِ مرمر۔ اور مرمر کی پھر اقسام ہیں، سرخ اور سبز اور زرد، وہ سب انسان نکالتا ہے اور اپنے کاموں میں لاتا ہے تاکہ دنیا میں تصرفات چلیں۔

تو فرمایا کہ ہم نے ذلیل کردیا تمہارے لیے زمین کو وہ چوں نہیں کرسکتی، حالانکہ تمہاری اصل ہے تم سے کہیں زیادہ بڑی ہے لیکن اس کو کھودے جاؤ اس میں نہریں بناؤ، کنوئیں بناؤ، ذرا بھی چوں وچراں نہیں کرتی اور تمہارے ہاتھ میں مسخر ہے اس کے اخلال طبعی یعنی جگر کے ٹکڑے۔ سونے چاندی نکالے جاؤ وہ ذرا بھی چوں نہیں کرتی، یہ سب تمہارے لیے حاضر ہے۔

ایجاد و تصرف...... پھر اس میں تصرف کی طاقت بھی رکھی کہ دو چیزوں کو ملا کر ایک تیسری چیز پیدا کرلو، یہی

انسان کی ایجاد کی حقیقت ہے۔ ایجاد کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کوئی مادہ خود انسان پیدا کردے، سونے کو خود پیدا کردے، چاندی کو پیدا کردے، یہ نہیں ہے۔ بلکہ چند چیزوں کو ملا کر ایک چیز نکالتا ہے، یا دو چیزوں کو ملا کر ایک تیسری چیز بنالیتا ہے۔ دو درخت ہیں، دو قسم کے پھل ہیں، ان میں قلم لگایا اور ایک تیسری نوع تیار کرلی۔ سونے اور چاندی کو ملایا تو اس سے طرح طرح کے ظروف اور برتن بنالیے تو انسان کی ایجاد کی حقیقت ترکیب اور تحلیل دو چیزوں کو ملا کر تیسری چیز بنالینا یا ایک چیز کا تجزیہ کر کے اس سے اجزاء نکال لینا اور اس سے چیزیں بنانا، تو ترکیب کردینا دو کی، یا ایک کی تحلیل کر کے اس کے اجزاء کردینا، یہی انسان کی ایجاد کا حاصل ہے۔ ایک ذرہ برابر زمین نہیں پیدا کرسکتا آدمی۔ پیدا شدہ میں سے کام نکال سکتا ہے آفتاب کی ایک کرن ساری دنیا کے انسان ملیں تو نہیں بناسکتے، لیکن ان کرنوں کی گرمی اور روشنی سے طرح طرح کی چیزیں بناسکتے ہیں۔

ایجاد کا حاصل ترکیب اور تحلیل نکل آتا ہے اس میں تصرف کیے جاؤ اور نکالے جاؤ، تو پیدا کی ہوئی تمام چیزیں حق تعالیٰ کی ہیں، ان کو جوڑنا، کھول دینا، ملا دینا الگ کردینا اس کی طاقت انسان کو دی گئی ہے اس سے وہ اپنے کام نکالتا رہتا ہے۔ تو زمین کو ہم نے تمہارے لیے ذلیل بنادیا ہے اور زمین ہی میں سارے خزانے چھپے ہوئے ہیں، ان خزانوں کو تمہارے ہاتھ میں مسخر کردیا اس کے لیے ضرورت پڑتی ہے کہ آدمی زمین میں چلے اور پھرے تاکہ ان معدنیات کا پتہ چلائے کتنے سفر کرنے پڑتے ہیں۔

زمین اور فضا آسمانی کی تسخیر جدید...... اس لیے فرمایا کہ: فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا، زمین کے کندھوں پر چلو اور پھرو، سفر کرو اور سیر کرو، کہیں آدمی پیدل چلتا ہے، پیدل نہیں چل سکتا تو سواریاں، کچھ قدرتی سواریاں ہیں کہ گھوڑوں اور گدھوں پر سوار ہو کر آدمی جائے، جس کو فرمایا۔ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً۔ ''گھوڑے اور گدھے اور خچر یہ سب کے سب ہم نے تمہارے لیے بنائے''۔ لِتَرْكَبُوهَا تاکہ تم سواری بھی کروان پر وَزِينَةً اور اپنا ٹھاٹ اور کروفر بھی دکھلاؤ۔ جب جلوس نکلتے ہیں تو گھوڑوں پر، ہاتھیوں پر بڑی بڑی جھولیں، دھرپال ڈالی جاتی ہیں تاکہ حشم خدم پیدا ہو، تو زینت بھی ہے اور سواری بھی۔ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۔ ① فرمایا: یہ تو وہ سواریاں ہیں جو آج موجود ہیں اور جو آگے اللہ پیدا کرے گا وہ اور بہت ہیں۔

سو برس پہلے دو سو برس پہلے کس کو خبر تھی کہ موٹر ایجاد ہو جائے گی، ریلیں ایجاد ہو جائیں گی۔ یہ اونٹ جو سواریاں ہیں ان پر سواریاں شروع کیں، جب یہ ریل اور موٹر ایجاد ہوا تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایروپلین ایجاد ہو جائیں گے۔ آج ہوائی جہاز ایجاد ہو گئے تو مہینوں کی مسافت گھنٹوں میں آدمی طے کر لیتا ہے

پھر ان جہازوں میں نئی نئی ایجادات ہیں کہ ایک جہاز ڈھائی سو میل چلتا تھا تو پانچ سو میل کی رفتار فی گھنٹہ میں نکال لیا۔ اب اس کے بعد اطلاعات آرہی ہیں کہ ایک گھنٹہ میں ایک ہزار میل ہوائی جہاز اڑے گا، یا پندرہ سو میل

① پارہ: ۱۴، سورۃ: النحل، الآیۃ: ۸۔

اڑے گا، تو پندرہ سو میل ایک گھنٹہ میں طے ہوں گے، ڈھائی ہزار میل ڈیڑھ گھنٹہ میں طے ہو جائیں گے۔ گویا یہاں سے آدمی ڈیڑھ گھنٹہ میں جدہ پہنچ جائے گا اور جدہ سے آدھ گھنٹہ میں مکہ پہنچ جائے گا۔

اور ایک وقت آئے گا کہ آدمی چاہے پی کر گھر سے کہے گا کہ میں ذرا عمرہ کر آؤں جا کے اور کھانا یہیں آ کے کھاؤں، تو وہ چائے پی کے جائے گا ڈیڑھ گھنٹہ میں پہنچ گیا، عمرہ کیا اور جہاز سے واپس آ کر گھر پر کھانا کھالیا تو جو مسافت کہ آدمی اپنے پیروں سے نہیں طے کر سکتا تھا۔ حق تعالیٰ نے قلوب میں ایسی حکمتیں القاء فرمائیں کہ نئی سے نئی سواری آدمی نے ایجاد کی: فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا ۔ زمین کے کندھوں پر تم چلو۔ اور زمین کے تابع ہے فضا تو فضا میں اڑو، وہ بھی اس کے ساتھ میں آ گئی تو آسمان زمین کے درمیان میں جو اور خلا ہے اس میں انسان اپنے سواریاں پہنچا رہا ہے حتیٰ کہ اس نے ہمتیں باندھیں کہ میں تو چاند پر پہنچ جاؤں گا اور اگر وہ پہنچنا چاہے اور اللہ تعالیٰ قدرت دے تو آدمی پہنچ بھی سکتا ہے اس میں کوئی مانع نہیں ہے کوئی وہ چیز ممنوع نہیں ہے، تو: فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا ۔ زمین کے کندھوں پر تم چلو۔

یادِ حق کے ساتھ انسانی تصرفات منشاءِ خداوندی ہیں...... اب اس سارے سیر و سفر کا حاصل کیا ہے: کہ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ''زمین کے رزق سے فائدہ اٹھاؤ''۔ کھانے کی چیز سے کھانے کا فائدہ، استعمالی چیز سے استعمال کا فائدہ، زینت کی چیز سے زینت کا فائدہ، کچھ چیزیں پیٹ میں جاتی ہیں، کچھ چیزیں بدن کے اوپر رہتی ہیں اور کچھ بدن کے باہر رہتی ہیں۔ پیٹ میں کھانا جاتا ہے، بدن کے اوپر لباس رہتا ہے، لباس سے باہر باہر مکان اور بلڈنگ اور بنگلے رہتے ہیں اور یہ سب زمین ہی سے پیدا ہو رہے ہیں۔ سب کے مادے زمین ہی سے نکل رہے ہیں، تو زمین کو ایک عجیب و غریب خزانہ حق تعالیٰ شانہٗ نے بنا دیا اور انسان کے ہاتھ میں دے دیا کہ تصرف کرو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی تصرف سے روکا نہیں گیا بلکہ منشاء قدرت ہے کہ تصرف کرو۔

مگر ایک چیز بتلا دی کہ سب کچھ کرو، مگر ہمیں مت بھولو، اس لیے کہ ہم ہی تو ہیں محسن حقیقی، ہم نے ہی تو یہ زمین بنائی، ہم نے ہی تو تمہارے دلوں میں یہ چیزیں ڈالیں کہ کس طرح اس زمین کے مادے کو، اس کی نعمتوں کو استعمال کرو۔ تو یہ سارا جو کچھ بھی ہے ہمارے انعام اور احسان کا ثمرہ ہے تو بدفطرت ہو گا وہ انسان کے منعم کا انعام کھائے اور منعم کو بھول جائے، محسن کے احسان سے فائدہ اٹھائے اور محسن کو بھلا دے، وہ بدفطرت کہلائے گا۔ سلیم الفطرت انسان وہ ہے کہ جتنی نعمت بخشی جائے اتنا ہی شکر بڑھتا جائے، اتنی ہی طاعت بڑھتی جائے تو کہا جائے گا کہ یہ سلیم الفطرت انسان ہے، دنیا کی ہر چیز کو اللہ نے نعمتوں سے مالا مال کیا۔

کرامتِ انسانی...... مگر سب سے زیادہ نعمتیں جو دیں وہ انسان کو عطا کیں، سب سے زیادہ چہیتی مخلوق اللہ کی اور پیاری مخلوق وہ انسان ہے اس لیے اسے وہ کچھ دیا کہ وہ کسی کو نہیں ملا، اسی کو ایک جگہ فرمایا گیا کہ:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰی كَثِیْرٍ

مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا. ① ہم نے انسان کو معظم اور مکرم بنایا اور بحر و بر میں اسے اٹھایا کہ بر میں جہاں چاہے چلا جائے اور بحر میں بھی جہاں چاہے چلا جائے۔ بر کے لیے سواریاں الگ..... دریا کے لیے سواریاں الگ دیں، فضا کے لیے سواریاں الگ دیں۔ دنیا کا ہر جاندار اپنے پیروں سے چلتا ہے، آپ نے نہیں دیکھا ہوگا کہ گھوڑا گھوڑے پر سوار ہو کر جائے، شیر شیر پہ، سانپ سانپ پر، بچھو بچھو پر، ہر ایک چیز اپنے پیروں پر سفر کرتی ہے۔ حتی کہ دریا میں بھی اگر گر جائے تو تیر کر نکلتی ہے، یہ کرامت انسان کو دی گئی کہ دریا میں جائے تو سواریاں موجود، خشکی میں چلے تو سواریاں موجود، فضا میں جائے تو سواریاں موجود حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ. پھر دنیا کے جس جاندار کو آپ دیکھیں گے اس کی ایک غزا متعین ہے، مثلاً شیر خون ہی پیئے گا، گوشت ہی کھائے گا، پرندے ہیں وہ دانہ چگیں گے وہ گوشت نہیں کھاتے، حیوان چرندے ہیں وہ گھاس کھائیں گے، لیکن انسان کے لیے ساری چیزیں وقف ہیں، گھاس یہ کھا جائے، ماس یہ کھا جائے، مٹی یہ کھا جائے پتھر یہ کھا جائے۔ سونا اور چاندی یہ کھا جائے، جواہرات یہ کھا جائے، اول تو ساری چیزیں مٹی سے بنی ہوئی ہیں.......... تو آدمی ویسے بھی مٹی کھاتا ہے۔ اب یہ پان کھاتے ہیں ہم یہ چونا مٹی کے سوا اور کیا ہے، پتھر بھی کھالیا آدمی نے، پھر سونے اور چاندی کہیں ورق بن رہے ہیں تو وہ دواؤں میں کام آ رہے ہیں سونے اور چاندی کے زیور تو الگ ہیں، کھانے میں بھی سونا اور چاندی استعمال کیا جاتا ہے۔ جواہرات ہیں تو یاقوتیاں بنتی ہیں وہ مقوی باہ ہوتی ہے، وہ مقوی بدن ہوتی ہیں۔ تو یاقوت اور زمرد آدمی بھی کھا جاتا ہے۔ تو گھاس بھی کھا جائے، ماس بھی کھا جائے، پتھر بھی کھا جائے، مٹی بھی کھا جائے، پھر کون سی سبزی ہے جو آدمی نہیں کھاتا۔ ترکاریاں ہر قسم کی بجز اس کے کہ کوئی کڑوی ہو اور نہ منہ میں چلے تو چھوڑ دے اس کی عنایت ہے۔ کھانے والے اسے بھی کھا جاتے ہیں تو غرض دنیا کی ہر چیز انسان کھاتا ہے۔ تو فرمایا کہ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ہر پاکیزہ چیز ہم نے انسان کو دی۔

ناپاک چیز سے روک دیا کہ وہ مت کھاؤ، کھانے کے لیے بہتیری پاک چیزیں ہیں۔ مردار مت کھاؤ، خنزیر مت کھاؤ، شراب مت پیو کہ یہ چیزیں نجس بنائی گئی ہیں، تم نجاستوں کے استعمال کے لیے نہیں بنائے گئے، تم بنائے گئے ہو پاک باز، معظم اور مکرم، تو تمہاری غذا بھی پاک ہونی چاہیے۔ نہ کہ ناپاک چیزیں۔ تو پاک چیزیں اتنی بنادی ہیں کہ ان کی حد و نہایت نہیں، تو یہ کیا مصیبت ہے کہ ناپاک کی طرف آدمی جائے۔ ناپاک کی طرف جب جائے کہ جب پاک چیزیں نہ ہوں۔ حرام خوری جب کرے کہ جب حلال چیزیں نہ ہوں۔ ناجائز پیشہ جب اختیار کرے کہ جب جائز پیشہ نہ ہو۔ تجارت ہے، زراعت، صحافت، ملازمت، صنعت ہے، حرفت ہے، کیا ضروری ہے کہ آدمی سود ہی لے اور بٹہ ہی لے اور چوری اور ڈکیتی کرے، اور ڈکیتی، یہ ناجائز پیشے ہیں۔ تو جائز پیشے اس لیے ہم نے بنا دیئے ہیں کہ تم ان کے اندر محدود ہو، تا کہ حرام اور ناجائز کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ یہ صرف حرص وہوس ہے کہ انجام سے بے

① پارہ: ۱۵، سورۃ: الاسراء، الآیۃ: ۷۰.

خبر ہو کر حرام چیزوں میں بھی آدمی پڑ جاتا ہے جس سے دنیا بھی ضائع ہو جاتی ہے۔ آخرت بھی تباہ ہو جاتی ہے۔

استعمالِ اشیاء میں جائزاتِ شرعیہ سے تجاوز ممنوع ہے...... اس لیے فرمایا کہ زمین مسخر، سارے خزانے تمہارے، استعمال کرو مگر اللہ کو مت بھولو، یعنی ان اصول کے تحت رہو جو اللہ نے حرام وحلال کے اصول بنا دیئے جائزات کے حدود میں رہو، اسراف مت کرو۔ اپنے استعمال میں چیز لاؤ، مگر فضول خرچی سے نہیں بلکہ حدود کے اندر، دوسرے کو استعمال کے لیے دو، عنایت کرو، ہدیہ دو مگر حدود کے اندر، یہ ہدیہ نہیں ہے کہ سارا گھر لٹا دے آدمی، اور یہ بھی نہیں ہے کہ امساک اور بخل میں آ کر ایک پائی بھی اس کے ہاتھ سے نہ نکلے، تو دینے میں عطا کرنے میں بھی درمیانی چال ہونی چاہیے، اپنے استعمال میں درمیانی چال ہونی چاہیے، حتی کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اگر دریا کے کنارے بیٹھ کر وضو کرو: لَاتُسْرِفْ فِي الْمَآءِ۔ اسراف مت کرو کہ خواہ مخواہ پانی اچھال رہے ہو۔ بیٹھے ہوئے اور ایک لوٹے میں وضو ہو سکتا ہے تو دو گھڑوں میں وضو کر لیا وہ اسراف میں شمار ہوگا، کپڑا پہنو مگر حدود کے اندر۔ فرمایا گیا ہے کہ جو آستین پہنچوں سے نیچے لگی ہوئی ہو وہ اسبال اور سدل کے حکم میں ہے وہ فضول خرچی ہے اس پر عنداللہ مواخذہ ہوگا... تو کپڑا پہننے میں بھی حد بندی کر دی، کھانے پینے میں بھی حد بندی کر دی، خزانے پر بیٹھے ہو مگر حدود کے اندر استعمال کرو، یہ مت سمجھو کہ جب دس لاکھ روپے ہیں میرے پاس تو جس طرح چاہے خرچ کرلوں۔ اس میں بھی حد بندی ہے کہ اعتدال کے ساتھ خرچ کرو، نہ اتنا خرچ کرو کہ کل کو تم خود بھک منگے بن جاؤ، نہ اتنا امساک اور بخل کرو کہ نہ اپنے کام آئے نہ غیر کے کام آئے۔ ایک درمیانہ چال رہے۔ انہیں اصول پر چلنا اور جائزاتِ شرعیہ کے اندر رہنا یہی ہے حد بندی اور اللہ کو یاد کرنا۔

ذکر اللہ کے دو معنی...... تو ایک اللہ کو یاد کرنے کے یہ معنی ہیں کہ استعمال کرتے وقت قلب میں غفلت نہ ہو، ذکر جاری ہو کوئی اچھی چیز کھائی تو الحمدللہ کہے، کھانے کی ابتداء کرے تو بسم اللہ سے کرے، لباس پہنے آدمی تو بسم اللہ سے لباس پہنے، اور جب پہن لے تو حمد وثناء کرے، اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِیْ کَسَانِیْ هٰذَا" اللہ کی حمد ہے کہ جس نے مجھے پہننے کو دیا"۔ اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنِیْ " اللہ کی حمد ہے اس پر کہ مجھے کھانے کو دیا"۔ اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِیْ سَقَانِیْ ''اللہ کی حمد کہ مجھے پینے کو دیا'' گھر میں داخل ہوں تو ذکر اللہ یہ ہے کہ: اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِیْ رَزَقَنِیْ هٰذَا الْبَیْتَ ۔ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے یہ بلڈنگ دی، یہ مجھے مکان دیا۔ تو قدم قدم پر یہ دعائیں بتلائیں تا کہ مالک یاد رہے تو ایک تو ذکر اللہ کے یہ معنی ہیں کہ آدمی پڑھتا رہے۔ مختلف اوقات کی جو دعائیں بتلائی گئی ہیں، ان کو استعمال کرتا رہے، حمد وثناء کرتا رہے۔

اور دوسرے یہ ہے کہ اس شے کو اصول شریعت کے مطابق استعمال کرے، یہ بھی ذکر اللہ میں داخل ہے چاہے زبان سے ذکر اللہ ہو یا نہ ہو مگر جب جائز کی حد میں ہے، طریقہ شرعیہ پر چل رہا ہے، سنت کے مطابق چل رہا ہے وہ عملی ذکر ہے..... اگرچہ زبان پر ذکر نہیں، تو ذکر اللہ کے اور منعم اور محسن کو یاد کرنے کے دو طریقے بیان کیے گئے

ہیں۔ایک یہ کہ زبان سے یاد کرو اس کے لیے وہ دعائیں ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمادیں۔

ذکر اللہ کی نہایت سہل صورت ......اور اگر کسی کو وہ دعا نہ بھی یاد ہو تو ہر کام میں جو نعمت ہو کہے کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے۔ یہ تو کہہ سکتا ہے استنجاء کر کے واپس آئے اگر دعاء یاد نہ ہو تو کم سے کم کہے کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے میرے اندر سے تو نے فضلات نکال دیئے ہیں ہلکا ہو گیا۔ یہ تو کہہ سکتا ہے زبان سے،سونے کے لیے لیٹے اگر وہ دعا یاد نہ ہو تو آیۃ الکرسی پڑھ کر سو جائے۔بسم اللہ پڑھ کر سو جائے،غرض اللہ کے نام سے سوئے جاگ جائے تو گویا موت کے بعد زندگی دی (اللہ نے) تو چاہیے کہ وہ دعا پڑھے جو حدیث میں فرمائی گئی ہے۔ اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَحْیَانَا بَعْدَ مَآ اَمَاتَنَا وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ. ① ”حمد ہے اس اللہ کے لیے جس نے مجھے موت کے بعد زندگی دی اور میں اسی کی طرف لوٹ کر جانے والا ہوں“۔

لیکن اگر یہ دعا یاد نہ ہو تو کم سے کم کلمہ ہی پڑھتا ہوا اٹھے آدمی،سبحان اللہ کہتا ہوا اٹھے،الحمد للہ کہہ کر اٹھے۔تو ایک ہے لسانی ذکر اس میں اعلیٰ طریقہ وہ ہے کہ سنت کے مطابق جو الفاظ ثابت ہیں انہیں یاد کر لے،بچوں کو یاد کرا دیئے جائیں،بآسانی یاد کر لیں گے،جو بچے پورا قرآن شریف یاد کر لیتے ہیں وہ کیا دعائیں حدیث کی یاد نہیں کر سکتے،مہینے بھر میں سب دعائیں یاد ہو جائیں گی اور اگر نہ ہو تو کم سے کم اللہ کا نام زبان پر ہو یہ لسانی ذکر ہے۔

اور ایک یہ کہ ہر چیز کے استعمال میں یہ دیکھ لے کہ شریعت کے مطابق کر رہا ہوں استعمال یا نہیں،وہ بھی ذکر اللہ میں داخل ہے،کمانے کے لیے بیٹھے آدمی تو یہ دیکھ لے کہ جائز پیشہ اختیار کیا ہے یا ناجائز،جائز کو اختیار کرے،یہ بھی ذکر اللہ میں شامل ہے یہ بھی اللہ کی یاد ہے۔تو فرماتے ہیں کہ نعمتیں استعمال کرو،کوئی روک نہیں،مگر حدود میں رہ کر، اسراف نہ ہو فضول خرچی نہ ہو،جیسا کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو فرمایا گیا کہ: یٰٓاَیُّهَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا. ② ”اے رسولوں کے گروہ پاک غذائیں استعمال کرو،کھانے کی ہوں،پہننے کی ہوں لیکن عمل صالح کرتے رہو“۔وہ ذکر اللہ آ گیا تا کہ محسن کا حق ادا ہوتا رہے۔اور اس کا احسان دل کے اندر تازہ بہ تازہ رہے۔

یہ جو نمازیں پڑھتے ہیں یہ بھی وہی ذکر اللہ ہے کہ اے اللہ! ہم نے نعمتیں استعمال کیں مگر آپ کو نہیں بھلایا، جو اوقات فرض کر دیئے حاضر ہیں آپ کی بارگاہ میں،مؤذن اذان دیتا ہے اللہ اکبر اللہ اکبر۔

یہ محض اعلان نہیں کہ اطلاع دے دی کہ آ جاؤ نماز کے لیے،یہ یاد دلاتا ہے ذکر اللہ کا کہ تم ہر وقت اللہ کی کبریائی اور عظمت دل میں رکھو اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ .توحید اپنے دل میں رکھو،اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ نبوت کی عظمت اور عقیدت اپنے دل میں رکھو،حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ نماز کی طرف جھکو،حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ دنیا و آخرت کی بہبود اور فلاح کی طرف آؤ،تو کبریا خداوندی،توحید الٰہی،نبوت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ یاد دلانے کے لیے مؤذن

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب مایقول عندالنوم وأخذ المضجع ج:۱۳ ص:۲۳۷،رقم:۴۸۸۶. ② پارہ۲۴،سورۃ :المومنون، الآیة:۵۱.

پانچ وقت کھڑا ہوتا ہے تاکہ بندے غفلت میں نہ پڑ جائیں اور اگر اپنی نعمتوں میں پڑے ہوئے ہوں تو اذان کی آواز سنتے ہی چونک جائیں ایک دم کہ اب ہمیں حق بھی ادا کرنا ہے اس محسن کا جس نے یہ ساری نعمتیں دیں اس لیے فرمایا کہ زمین کی نعمتیں استعمال کرو اس کے کندھوں پر سیر و سیاحت کرو، سفر کرو، مگر ہمیں مت بھلاؤ۔

سفرِ تنہائی...... اس لیے کہ اگر تم بھول گئے تو وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ دیکھو کل کو آنا ہے ہمارے سامنے، اگر یہیں رہنا ہوتا دنیا میں ابدالآباد تک کے لیے تب بھی انسان یہ غور کرتا کہ جانا تو مجھے ہے ہی نہیں (چاہے یاد کروں چاہے نہ کروں زمین میری۔ لیکن ایک دن زمین کو چھوڑنا ہے اور موت کا منظر سامنے ہے، ہزاروں لاکھوں انسان گزر رہے ہیں اس زمین کو چھوڑ کر جا رہے ہیں جو لکھ پتی تھے وہ بھی جا رہے ہیں جو بھک منگے تھے وہ بھی جا رہے ہیں۔ غرض ایک نہ ایک دن اس زمین کو چھوڑنا ہے اور اس کی ساری نعمتوں کو چھوڑنا ہے اور چھوڑ کر جانا کہاں ہے؟ فرماتے ہیں ہمارے ہی پاس تو آنا ہے جہاں سے گئے تھے وہیں تو لوٹ کر آؤ گے، تو اس دن کو بھی یاد رکھو ایسا نہ ہو کہ اسے بھلا دو اور اس کو فرماتے ہیں؛ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ۚ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ①

ہمارے پاس تم تنہا تنہا آؤ گے کوئی لشکر ساتھ نہیں ہوگا، بادشاہ ہے وہ بھی اسی زمین فرشِ خاک پر ہمارے پاس آئے گا۔ اور فقیر ہے وہ بھی اسی فرشِ خاک پر کوئی لاؤ لشکر تمہارے ساتھ نہیں ہوگا، تو جیسے تنہا ہم نے بھیجا تھا تمہیں کہ ماں کے پیٹ میں تم ہی تھے، اسی طرح سے زمین کے پیٹ میں جو اصل ماں ہے تم تنہا ہی آنے والے ہو۔ فرماتے ہیں کہ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى پھر اس خیال میں مت رہنا کہ کوئی تمہارے ساتھ لاؤ لشکر ہوگا جو ہمارے مقابلہ میں تمہاری مدد کر دے گا، تنہا آؤ گے اور اگر ساری دنیا کا لشکر لے کر بھی آؤ تو ہمارے مقابلہ میں تمہاری کیا چل سکتی ہے؟ ہم تو خالق ہیں، پیدا کرنے والے ہیں، جب چاہیں موت دے دیں، جب چاہیں ضعیف کر دیں، کمزور بنا دیں، تو مقابلہ اس کا کرو جو عاجز ہو، قادرِ مطلق کا کیا مقابلہ؟ اول تو تم تنہا آؤ گے، یہ سارا لاؤ لشکر یہیں رہ جائے گا اور اگر کسی کے ساتھ بالفرض ہو بھی لشکر ہمارے مقابلہ میں کام نہیں دے سکتا، اس لیے فرمایا: وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ۔

لشکرِ الٰہی سے بے خوفی کی کوئی صورت نہیں...... یہاں سے انسان کو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اللہ کا لشکر جو ہے وہ تو فرشتے ہیں جو دارالسلطنت میں رہتے ہیں آسمانوں کے اندر جو میں ہیں فضا میں ہیں۔ بھلا اتنے لشکر آئے گا اتنے میں ہم اپنا کام کر لیں گے، تو کیا ضرورت ہے یاد کریں، مقابلہ کے لیے تیاری کر لو، اس سے ہم اپنا کام کر گزریں گے، بہرحال لشکر کو بنتے سنورتے دیر لگتی ہے، اتنے میں ہمارا کام ہو جائے گا، تو کیا مقابلہ ہوگا اس لیے آگے فرمایا کہ: ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِى السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ۔ تم فرشتوں کے لشکر کو لے رہے ہو یہ

① پارہ: ۷، سورۃ: الانعام، الآیۃ: ۹۵۔

زمین بھی تو ہمارا لشکر ہے اگر اس کو ہم زلزلے سے دھنسا دیں اور سب دھنستے ہی چلے جاؤ۔ تو کسی فرشتے کے بھی آنے کی ضرورت نہیں جو زمین فرش بنی ہوئی تھی وہی منٹ بھر کے اندر قبر بن جاتی ہے۔ اسی میں آدمی دفن ہو جاتا ہے توءَ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِکُمُ الْاَرْضَ. کیا آسمان والے سے تم بے پرواہ ہو گئے؟ اگر زمین کو ہم زلزلے میں ڈال دیں اور لگے موجیں مارنے اور جگہ جگہ اس میں دراڑ کھل جائیں اور پناہ نہ ملے تب کیا ہوگا؟ فرشتوں کو آتے آتے اگر بالفرض دیر بھی لگی تو لشکر اوپر کا کیا آئے گا۔ یہ تو نیچے ہی لشکر موجود۔

اور میں کہتا ہوں زمین بھی بعد کی چیز ہے ایک چیونٹی کو مسلط کر دے، کان میں گھس جائے، بس انسان کی زندگی ختم ہے...... ایک کیڑا مکوڑا ناک میں گھس جائے، بس انسان کی زندگی ختم ہے...... تو ایک چیونٹی جسے ختم کر سکتی ہے وہ قادر مطلق کی طرف سے مطمئن ہو کر بیٹھے گا کہ فرشتے آویں گے، مقابلہ ہوگا، دیکھی جائے گی۔ فرشتے تو بعد آویں گے جو تمہارا فرش خاک ہے وہی تمہارے لیے مقابلہ کا لشکر ہے اس کی پیداوار میں ایک چیونٹی تمہارا مقابلہ کر سکتی ہے۔

قادر مطلق تکبر و نخوت کو جس طرح چاہے توڑ دے...... نمرود جیسے عظیم بادشاہ کو جس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا ، ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں اور اس کا دماغ نیچے آتا ہی نہیں تھا، وہ تو کہتا تھا کہ میں رب ہوں، اس کو کیسا نیچا دکھایا کہ ایک مچھر اس کی ناک میں گھس گیا اور دماغ میں جا کر لپٹ گیا اور وہ پھڑ پھڑ کرتا تھا، اب وہ بے چین، تو اس نے طریقہ یہ رکھا تھا ایک خادم مقرر کر رکھا تھا کہ وہ جوتے سر پر مارتا تھا، جب جوتے پڑتے تو ذرا دیر کے لیے ٹھہر گیا مچھر اور جہاں جوتے الگ ہوتے پھڑ پھڑ پھرایا، پھر اس نے خادم کو بلوایا تو جن پر خدائی کا دعویٰ کر رکھا تھا انہیں کے ہاتھ سے سر پر جوتے پٹوا دیئے، تو مطلب یہ ہے کہ چیونٹیاں بھی بعد کی چیز ہیں، خود انسان ہی کو مسلط کر دے تمہارے اوپر جس کو تم اپنا بندہ جانتے ہو خدائی کا دعویٰ کر رہے ہو اسے ہی جوتیاں دے کر تمہارے سر پر مسلط کر دے تو کیا کرو گے ، تو خالق سے بچ کر کہا جائے گا آدمی، تو زمین ہے، زمین کی پیداوار ہے اور خود انسان ہے، وہ تمہارے حق میں مد مقابل آ جائیں گے اور ایک فوج انسانوں کی کھڑی کر دے اور وہ تلواریں لے کر آ جائے تو سارا کروفر رہ جاتا ہے۔ تو انسان ہی انسان کو بتلا دیتا ہے وہ درحقیقت خدا کی طرف سے لشکر مسلط ہوتا ہے۔ تا کہ متکبروں کا غرور توڑ دیا جائے نخوت شعاروں کی نخوت توڑ دی جائے، انسان انسان پر مسلط ہو جاتا ہے تو فرماتے ہیں وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ بہرحال ایک وقت آنا ہے کہ ہماری طرح آؤ گے اور آنے کے سلسلے میں موت بھی قبول کرنی پڑے گی۔

اسباب موت ہزاروں ہیں!...... اور موت کے اسباب ہزاروں ہیں، جانور کاٹ لے، ہارٹ فیل ہو جائے، زمین میں دھنس جائے، کوئی اوپر سے مصیبت آ پڑے، ہزاروں اسباب ہیں کہ جن کے ذریعے سے ہم تک آؤ گے ، تو اس وقت کو بھی یاد رکھو کہ سدا یہ وقت نہیں رہے گا کہ بلڈنگ بھی ہے، دولت بھی ہے، کام چل رہا ہے۔ یہ سب وقتی چیزیں ہیں اصل وہی وقت ہے کہ جو آنے والا ہے وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ اسی کی طرف تمہیں پھیل کر جانا ہے۔ توءَ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ. زمین ہی میں دھنسا دے تو کیا ہوگا؟ ءَ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِکُمُ

الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ o اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ط کیا تم مطمئن ہو مامون ہو آسمان والے سے اگر پتھر برسادے آسمان سے، بادل آئیں اور بجائے پانی برسنے کے پتھر برسنے لگیں اور میں کہتا ہوں کہ یہ اولے جو پڑتے ہیں پتھر ہی تو ہیں اسی پانی کو منجمد کر کے جما کر پتھر کی شکل دے دیتے ہیں۔ اگر وہ بڑھ جائیں دو دو سیر کا ایک اولہ پڑنے لگے تو پناہ نہیں مل سکتی، مکان ٹوٹ جاتے ہیں، ڈھ جاتے ہیں، انسان تو بجائے خود ہے کمزور تو کس چیز نے تمہیں مطمئن بنا رکھا ہے، مالک کی طرف سے کون سی پناہ گاہ ہے کہ اس سے بچ کر تم اس میں پناہ پالو گے اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۔①

اگر تم بڑے بڑے سنگین قلعوں میں بڑے بڑے پتھر کے برجوں میں، لوہے کے برجوں میں رہو گے موت وہیں جا پکڑے گی، یہ نہیں ہے کہ موت میدان میں آتی ہے اگر برجوں کے اندر تم کوئی منفذ ہی نہ رکھو، ہوا کا راستہ نہیں تو حبس دم ہو کر آدمی ختم ہو جائے، ہوا کا راستہ رکھو تو بھی بہر حال ختم ہو سکتا ہے تو فرشتے موت کے ان کے یہاں نہ سنگین کوئی چیز ہے نہ لوہے کے قلعے کوئی چیز ہیں۔ جیسے بجلی جب آتی ہے تو کتنا ہی بڑا لوہا ہو وہ تو اس کے جگر میں سما جاتی ہے۔ تو ملائکہ تو بجلی سے بھی زیادہ لطیف ہیں۔ وہ ہر چیز میں سما کر اندر دخول کرتے ہیں تو موت کے فرشتے وہیں پہنچ جائیں گے۔

تو فرماتے ہیں کہ زمین بھی سبب موت بن سکتی ہے پانی بھی سبب موت بن سکتا ہے، بادل بھی سبب موت بن سکتے ہیں، اولے برس جائیں، پتھر برس جائیں..... آخر لوط علیہ السلام کی قوم پر پتھر برسائے گئے اور کیوں برسائے گئے اس لیے کہ انہوں نے حدود سے تجاوز کیا، جائز طریقہ دیا گیا تھا کہ نکاح سے عورتوں کی طرف آؤ انہوں نے لڑکوں کو استعمال کیا، اس لواطت کے جرم میں آسمان سے پتھر برسائے گئے اور کوئی پناہ نہیں پا سکے۔ قوم ثمود، ان کو تباہ کر دیا گیا، ایک چنگھاڑ سے جبرئیل علیہ السلام نے ایک ڈانٹ دی، گھرکی دی، کلیجے پھٹ گئے، قوم عاد کو ہوا سے تباہ کر دیا گیا کہ سات دن تک ہوا کے جھکڑ چلے ہیں۔ اس طرح سے کہ جو مکان گہری گہری بنیادوں کے تھے مع بنیادوں کے ہوا نے اکھاڑا اور اوپر لے جا کر پٹخا نیچے کی طرف حدیث میں ہے کہ جب مکان اوپر جاتے تھے تو جانوروں کی آوازیں اوپر سے سننے میں آتی تھیں فضا سے مع جانوروں کے مکان اوپر گئے اور لے جا کر پٹخ دیئے گئے ۔ تو وہی ہوا جس سے ہم زندگی حاصل کرتے ہیں وہی موت کا ذریعہ بن جاتی ہے وہی زمین جو فرش تھا ہمارے لیے وہی قبر بنا دی جاتی ہے۔ وہی بادل جو پانی برساتے تھے اور زندگی کا سامان ہوتا تھا وہی ذریعہ موت کا بنے..... تو ہم تو زندگی کے اسباب کو چاہیں تو موت کا سبب بنا دیں پھر تم مطمئن ہو کر کیسے بیٹھ گئے، کس طرح سے غفلت میں پڑے، اس واسطے ادھر توجہ دلائی کہ زمین کا ملک بے شک تمہارے لیے ہم نے کیا، مگر دیکھو دینے والے کو مت بھلاؤ ءَ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ زمین میں دھنسا دیئے جائیں اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ

① پارہ: ۵، سورۃ: النساء، الآیۃ: ۷۸.

يُّرۡسِلَ عَلَيۡكُمۡ حَاصِبًا ۔۔ یا پتھر برسا دیئے جائیں آسمان سے فَسَتَعۡلَمُوۡنَ كَيۡفَ نَذِيۡرِ. اس وقت تمہیں معلوم ہوگا کہ ڈرانے والے کا ہے سے ڈراتے تھے۔اس وقت تمہیں پتہ چلے گا کہ انبیاء علیہم السلام نے جن چیزوں سے ڈرایا تھا وہ معاذ اللہ! واہی تباہی باتیں نہیں تھیں۔وہ ایک امر واقعہ تھا جو ہونے والا تھا تو اس وقت نذیروں کی نذارت کا پتہ چلے گا، ڈرانے والوں کے ڈرانے کا پتہ چلے گا اس وقت تم ایمان لاؤ گے کہ سچ کہتے تھے وہ، لیکن اس وقت ایمان لانے سے کیا فائدہ کہ جب موت سر پر آ گئی۔موت سے پہلے پہلے درجہ ہے ایمان کا بھی اور ڈرنے کا بھی۔

تصدیق وتکذیب کا انجام......اس میں فرماتے ہیں کہ پھر دو قسم کے لوگ ہوں گے، ایک وہ کہ جنہوں نے تصدیق کی اور جو کچھ انبیاء نے فرمایا انہوں نے امنا کہہ کر دل میں جگہ دی اور ان کے طریق پر چلے دنیا بھی بن گئی۔ اور آخرت بھی ان کے لیے۔ایک جھٹلانے والے تھے، جنہوں نے تکذیب کی اپنے غرور میں آکر کسی نے دولت کے گھمنڈ میں کسی نے رسمی علم کے گھمنڈ میں کسی نے اپنی تھوڑی سے عقل کے گھمنڈ میں وحی کو نہ مانا، انبیاء کی باتوں کو جھٹلایا وَلَقَدۡ كَذَّبَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَكَيۡفَ كَانَ نَكِيۡرِ . اس وقت وہ لوگ کہ جو جھٹلانے والے تھے جب وہ انجام بد سامنے آئے گا تب وہ کہیں گے کہ واقعی جو نکیر کی جا رہی تھی وہ اب سامنے آئی۔بالکل ایسی اس کی مثال ہے جیسے ایک بچہ ماں کے پیٹ میں نو مہینے سے اندر پرورش پا رہا ہے اور وہ یوں سمجھتا ہے کہ میری زمین اور آسمان بس یہی ہے ماں کا پیٹ۔اس کا دھیان ہی آگے نہیں جاتا ایک آنے والا وہاں خبر دے کہ جس عالم میں بسر کر رہا ہے یہ تو مہا گندا عالم ہے۔بہت تھوڑا سا عالم ہے۔ایک عالم ہے دنیا، بڑا بھاری عالم ہے۔ماں کے پیٹ جیسے مکان کروڑوں بن سکتے ہیں اس کے اندر، تو وہ یوں کہے گا کہ یہ واہی باتیں کہہ رہا ہے۔بھلے اس سے بڑھ کر کوئی اور عالم ہو سکتا ہے، حیض کا خون مل رہا ہے کھانے کو اور پانی کے اندر میں تیر رہا ہوں کتنا اعلیٰ مکان ہے اس کے بساط میں ہی نہیں ہے کہ وہ دنیا کو سمجھے اس نے دنیا کو جھٹلا دیا، لیکن جب پیدا ہوا اور دنیا میں آیا تو اس نے دیکھا کہ واقعی ماں کے رحم جیسے تو کروڑوں عالم بن سکتے ہیں اس دنیا میں، وہاں غذا ملتی تھی گندے خون کی۔ یہاں اعلیٰ درجے کی مٹھائیاں ہیں، غذائیں ہیں، تو کہنے والا سچ کہتا تھا۔میں نے جھٹلایا اب وہ نادم ہے، لیکن جب اس دنیا میں آ گئے تو اسی آنے والے نے پھر کہا، اب ایک دفعہ تو جھٹلا چکا ہے اب میں خبر دیتا ہوں کہ اس دنیا کے بعد ایک اور بہت بڑا عالم آنے والا ہے جس کو عالم برزخ کہتے ہیں اور وہ اتنا بڑا عالم ہے کہ دنیائیں جیسی کروڑوں بن سکتی ہیں اس کے اندر، جب ایک میت کے سامنے قبر وسیع کی جائے گی اور حد نظر تک ایک عالم نظر آئے گا تو ایک ایک برزخ والے کو اتنا بڑا ملک ملے گا جیسی ایک دنیا۔

تو دنیائیں کروڑوں بن سکتی ہیں عالم برزخ میں سے، اتنا بڑا عالم ہے تو آنے والا کہتا ہے کہ ایک دفعہ تو نہیں سمجھا، مگر اب سمجھ جا، اس کے بعد ایک عالم آنے والا ہے اور اس کے بعد ایک اور آنے والا ہے جس کو عالم جنت کہتے ہیں۔تو یہ برزخ جیسے کروڑوں عالم اس میں سے بن جائیں، وہاں ادنیٰ جنتی کا حصہ دس دنیا کے برابر ہوگا

یہاں تو ایک ہی دنیا کے برابر ہے۔ تو جھٹلانے والے تو اخیر تک جھٹلاتے چلے جائیں گے اور تصدیق کرنے والے ابتداء سے ہی تصدیق کرتے ہیں کہ یہ بھی سچ کہا کہنے والے نے، اگلی بات بھی سچ کہی، اس سے اگلی بھی سچ کہی، تو تصدیق کرنے والا امن میں ہے اس لیے کہ جسے مان لیا تھا وہ چیز آ گئی اس کی آنکھوں کے سامنے جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے: وَ نَادٰۤی اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ اَصۡحٰبَ النَّارِ اَنۡ قَدۡ وَجَدۡنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَہَلۡ وَجَدۡتُّمۡ مَّا وَعَدَ رَبُّکُمۡ حَقًّا اہل جنت کہیں گے ہم نے تو اللہ نے جو وعدے کیے تھے، ٹھیک اس کے مطابق پالئے، تمام انعامات ہمیں مل گئے، تمہیں بھی وہ چیز مل گئی جس کا تم سے کہا گیا تھا کہ اگر نہیں مانو گے تو جہنم ملے گی تو تمہیں مل گیا اللہ کا وعدہ۔ قَالُوۡا نَعَمۡ ۚ کہیں گے، ہاں اب ہم اقرار کرتے ہیں کہ مل گیا لیکن اس وقت کا اقرار کام نہیں دے گا۔ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَیۡنَہُمۡ اَنۡ لَّعۡنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیۡنَ. ① ایک نداء کرنے والا نداء کرے گا کہ ان ظالموں پر اللہ کی لعنت جو، اب آ کر سمجھے ہیں وہاں ایمان نہیں لائے۔

قبولیت ایمان کا وقت...... تو بعد میں ایمان لانا وہ ایمان نہیں ہے وہ تو مجبوری کا ایمان ہے۔ جب موت کے فرشتے سامنے آ گئے اور آنکھوں سے نظر آ گئے اب کوئی کہے میں ایمان لاتا ہوں وہ ایمان نہیں. ایمان کہتے ہیں غیب کی خبر کو ماننا، غیب کی خبر اس نے نہیں مانی تو وہ فرعون کا سا ایمان ہے، فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا، موسیٰ علیہ السلام کی بات نہیں مانی، جب غرق کیا گیا اور گلے گلے پانی آیا تو اس وقت کہا کہ میں ایمان لایا موسیٰ کے خدا پر، بنی اسرائیل کے خدا پر اس وقت فرمایا گیا: آٰلۡـٰٔنَ وَ قَدۡ عَصَیۡتَ قَبۡلُ وَ کُنۡتَ مِنَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ② اب ایمان لایا اور چار سو برس تک زمین میں فساد پھیلایا، وہاں تو موسیٰ کی بات نہ مانی اب کہتا ہے کہ میں ایمان لایا، تو وہ ایمان مجبوری کا ہے، جب آنکھوں کے سامنے عذاب آ گیا تو اب بھی ایمان نہیں لائے گا؟ تو اسے ایمان تھوڑا ہی کہتے ہیں تو وقت کے بعد کسی چیز کو سمجھنا وہ ایسا ہی ہے جیسے مثل مشہور ہے فارسی کی:

مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید برکلہ خود باید زد

دشمن نے جب آ کر گھیر لیا اور سب ہتھیار بے کار ہو گئے اس وقت کہا کہ افوہ! قلعے میں فلاں ہتھیار بھی تو رکھا ہوا ہے۔ تو اب اس ہتھیار کو اپنے منہ پر مارنا چاہیے دشمن تو قابض ہو گیا۔ تو بعد از وقت جو چیز یاد آتی ہے وہ بے کار ہوتی ہے اس لیے فرمایا جا رہا ہے کہ نعمتوں کے زمانے میں ہمیں یاد کرو۔ جب مصیبت آ پڑی اس وقت کا یاد کرنا یاد نہیں کہلائے گا۔

یاد خداوندی کا وقت...... ایک حدیث میں ہے: حدیث قدسی ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں بندوں سے خطاب کرتے ہیں کہ "اے بندے! تو اپنی صحت کے زمانہ میں مجھے یاد کرتا کہ تیری بیماری کے زمانہ میں میں تجھے یاد رکھوں اور اے بندے تو اپنی نعمت کے زمانہ میں مجھے یاد رکھتا کہ تیری مصیبت کے زمانہ میں میں تجھے یاد رکھوں۔

① پارہ: ۸، سورۃ: الاعراف، الآیۃ: ۴۴. ② پارہ: ۱۱، سورۃ: یونس، الآیۃ: ۹۱.

اور اپنی زندگی میں مجھے یاد کر، تاکہ تیری موت کے وقت میں تیری دست گیری کروں۔'' جب اس وقت یاد نہ کیا تو موت کے وقت کیا یاد کرے گا اور جب نعمت میں یاد نہ کیا تو مصیبت کے وقت کیا یاد کرے گا؟ تو یاد کرنا وہ ہے کہ آدمی قبل از وقت یاد کرے۔

سات قسم کے آدمی قیامت کے دن عرش الٰہی کے سائے میں ہوں گے......اسی واسطے فرمایا گیا حدیث شریف میں کہ سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللهُ فِیْ ظِلِّهٖ يَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلُّهٗ ① '' سات قسم کے افراد ہوں گے کہ جن کو قیامت کے دن عرش کے سائے میں جگہ دی جائے گی جب کہ کوئی سایہ نہیں ہوگا بجز اللہ کے'' سائے کے، ان میں سے ایک قسم فرمائی گئی کہ شَابٌّ نَشَأَ فِیْ عِبَادَةِ اللهِ وہ نوجوان جس نے نوجوانی میں اللہ کو یاد کیا اور عبادت میں وقت گزارا، اس لیے کہ بڑھاپے میں اگر عبادت کرے وہ زیادہ عجیب بات نہیں، جب قبر میں پیر لٹکا چکا آدمی دنیا کی قوتیں جواب دے گئیں، جذبات سرد پڑ گئے امنگ باقی نہیں رہی، کھٹے میٹھے کی طرف کوئی توجہ نہیں رہی، اب بھی اگر اللہ کو یاد نہ کرے گا تو اور کون سا وقت آئے گا تو وہ مجبوری کا یاد کرنا ہے۔ اس لیے فرمایا گیا کہ یاد کرنا وہ ہے جو جوانی کے زمانہ میں یاد کر لے آدمی جبکہ امنگوں کے سبز باغ سامنے ہیں، امنگیں سامنے ہیں، دنیا کی بہاریں سامنے ہیں، قوت اندر موجود ہے، اس وقت ہر چیز سے کٹ کر آدمی متوجہ ہو اللہ کی طرف وہ زیادہ عجیب چیز ہے تو وقت آنے سے پہلے پہلے یاد کر لے، یہی یاد کہلاتی ہے اور وقت آجانے کے بعد یاد کرے وہ یاد، یاد نہیں ہے۔

قیامت کے حساب سے پہلے اپنا حساب کر لیں......اس لیے اس آیت میں توجہ دلائی گئی وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ زمین سے فائدہ اٹھاؤ، چلو پھرو ہمارے خزانوں سے منتفع ہو مگر اسے یاد رکھو کہ لوٹ کر ہماری طرف آنا ہے اور حساب دینا پڑے گا اور ایک ایک چیز کا، ایک ایک ذرہ کا حساب دینا ہوگا، اس کو ایک جگہ فرمایا گیا قرآن کریم میں کہ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ② پھر قیامت کے دن نعمتوں کا سوال کیا جائے گا تم سے، کہاں سے کمایا کس طرح استعمال کیا۔

نعیم کی تفسیر......اور نعیم کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ سردی کے زمانہ میں گرم پانی بھی نعیم ہے۔ پوچھا جائے گا کہ سردی میں ہم نے گرم پانی دیا تم نے کیا شکر ادا کیا اور گرمیوں کے زمانہ میں ٹھنڈا پانی نعیم میں داخل ہے تو سوال کیا جائے گا کہ برستی ہوئی آگ میں ہم نے ٹھنڈا پانی دیا تم نے الحمد للہ کہا یا نہیں؟ تم نے توجہ کی ہماری طرف یا نہیں؟ وہاں ایک ایک ذرہ کا سوال کیا جائے گا، ایک ایک چیز کا اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ . یہ ساری اربوں کھربوں مخلوق ہر ایک سے اس کی اربوں کھربوں چیزوں کا حساب لیا جائے گا اور حق تعالیٰ سوال کر لیں گے اور پچاس ہزار برس کا دن رکھا ہے قیامت کا تاکہ ساری امتوں کا حساب اس دن آجائے تو ایک ایک چیز کا سوال کیا جائے گا تو اس سے پہلے کہ

① الصحيح لمسلم، كتاب الزكوة، باب فضل اخفاء الصدقة ج: ۲ ص: ۷۱۵، رقم: ۱۰۲۱.

② پارہ: ۳۰، سورۃ: التکاثر، الآیۃ: ۸.

وہاں سوال کیا جائے یہیں اپنے ذہن سے کیوں نہ سوال کرو، حدیث میں ہے کہ حَاسِبُوْا قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا ① قبل اس کے کہ حساب لیا جائے قیامت کے دن تم ہی اپنا کچا چٹھا کیوں نہیں درست کر لیتے یہاں، پہلے ہی اپنا حساب کیوں نہیں لے لیتے۔

مراقبہ کے ذریعہ روز کا روز حساب ...... ایک معمولی سا عمل ہے اگر اسے ہی کر لے آدمی تو ساری زندگی درست ہو جائے۔ آپ بہر حال دن بھر کام کاج کر کے رات کو پڑ کے سوتے ہیں، چارپائی پر لیٹ کر ایک دس منٹ مراقبہ کر لے آدمی یہ سوچے کہ آج دن بھر میں میں نے کتنی اللہ کی اطاعت کی ہے، کتنی نافرمانی کی، نعمتوں پر کتنا شکر ادا کیا کتنا غفلت میں گزارا، جتنی چیزیں غفلت میں گزریں، جتنی چیزیں معصیت کی ہوں، گناہ کی ہوں، سچے دل سے توبہ کرے اور فرمایا گیا اَلتَّآئِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّاذَنْبَ لَهٗ ② گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے کہ جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں تھا، اگر حقوق العباد ہیں تو سوچ لے رات کو پڑ کے کہ کس کس کی حق تلفی کی ہے، مال کی حق تلفی، کسی کو گالی دی ہے، کسی کو تیز جملہ کہا ہے کسی کا دل دکھایا ہے، یہ بھی حق تلفی ہے، اگلے دن اس سے معذرت کر لے کہ بھئی وقتی بات تھی جذبہ آ گیا تھا، میں نے تمہیں یہ کہہ دیا تم اللہ کے لیے معاف کرو، کچا چٹھا صاف ہو گیا کسی کی چیز زبردستی جھپٹ لی ہے واپس دے دو، اگر وہ خود تمہیں رضا سے دیدے رکھ لو، معاملہ صاف ہو گیا۔ کسی کو گالی دی ہے اس سے معافی مانگ لو معاملہ صاف ہو گیا۔ تو قبل اس کے کہ ان گالیوں کا ان معصیتوں کا وہاں حساب لیا جائے اس سے پہلے ہی کیوں نہ حساب لیا جائے۔

تو اگر روزانہ آدمی سوتے وقت ایک دس منٹ سوچ لے، تو دن بھر کی تو ساری باتیں یاد رہتی ہیں کہ کتنی نیکیاں کیں، کتنی بدیاں کیں، جتنی بدیاں کی ہیں ان سے توبہ کر لیں، جتنی نیکیاں کیں کہے کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے، میں تو اس قابل نہیں تھا کہ یہ نیکی انجام دوں، تیری توفیق بخشی سے انجام دیں تو شکر پر وعدہ ہے کہ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ جتنا شکر کرو گے نعمت پر نعمتوں کو میں بڑھاتا جاؤں گا۔ نیکیوں پر شکر کیا تو نیکیاں بڑھتی جائیں گی اور بدی سے توبہ کی تو وہ مٹتی رہے گی، تو روزانہ اگر آدمی چٹھا صاف کر لے، بدیاں مٹا دے، نیکیوں میں اضافہ کر لے یہ کونسی مشکل بات ہے اگر پانچ دس منٹ سوچ لیا کرے چارپائی پر لیٹ کر تو روز کا روز حساب ہوتا رہے گا۔ اور اگر نہیں سوچتا اور اس غرضے (چکر) میں ہے کہ جب موت کا وقت آئے گا جب کر لوں گا اکٹھی توبہ، تو اول تو جسے آج توفیق نہیں ہوئی کیا ضروری ہے کہ کل کو توفیق ہوگی۔

کل جب آئے گی تو کہے گا کہ کل کو کر لوں گا، پھر وہ کل آئی تو کل کل میں گزر جائے گی، اسے موقعہ ہی نہیں ملے گا، اور اگر موقعہ بھی ملا موت سے قبل تو اس وقت کہاں اتنا موقعہ ہے کہ اہل حقوق کے حقوق ادا کرے اور جو

① المصنف لابن ابی شیبة ج:۷ ص:۹۶ رقم:۳۴۴۵۹ (یہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔)

② المعجم الکبیر للطبرانی ج:۸ ص:۴۹ رقم:۱۰۱۲۸ . مجمع الزوائد، باب التوبة علی الذنب ج:۱۰ ص:۹۹.

چیزیں کی ہیں ان کی تلافی کرے وہ تو مرنے کا وقت ہے، اس واسطے قبل از موت کرے،

آسان محاسبہ......اس میں سہولت یہ کہ روز کا روز حساب کرتا رہے نامۂ اعمال درست ہوتا رہے گا۔ جیسے ایک سرکاری ملازم ہو اگر وہ روز کا روز اپنا حساب دیکھ لے، کاغذات درست کر لے وہ مطمئن رہے گا کہ چیکر جس وقت بھی آ جائے گا میں پیش کر دوں گا یہ میرا حساب صاف ہے۔ ہر وقت اسے امید لگی ہوئی ہوگی اور وہ چاہتا ہوگا کہ کوئی چیکنگ کرنے کے لیے آئے تاکہ میرا صاف ستھرا حساب دیکھے تو میری ترقی ہوگی اور گورنمنٹ سے میرا اعزاز ہوگا۔ اور ایک وہ ملازم ہے کہ اپنا وقت آرام سے گزار رہا ہے اس نے کہا غلطیاں ہیں مہینہ کے ختم پر کرلوں گا اکٹھی لیکن مہینہ گزرنے نہیں پایا تھا کہ بیچ میں چیکر آ گیا اب جو چیکنگ کی تو معلوم ہوا سارا حساب غلط ہے، تو سوائے برخواستگی کے، سوائے جرمانے کے، سوائے جیل خانہ کے اور کیا ہوگا اس کے لیے....؟ تو بہترین شخص وہ ہے جو روز کا روز حساب اپنا درست کر لے تاکہ انجام کے وقت مطمئن ہو کر چلا جائے کہ میرا چِٹھا تو صاف ہے:

آں راکہ حساب پاک است از محاسبہ چہ باک

جس کا حساب صاف ہے اس کو محاسبہ اور چیکنگ سے کوئی بھی ڈر نہیں ہوگا وہ تو تمنا میں رہے گا کہ کاش کوئی چیکنگ کرے تو میرا انعام بڑھے میری ترقی ہو۔ اس لیے میں نے عرض کیا کہ مہینہ اور سال کو چھوڑ کر اگر روز کا روز سوتے وقت ایک دس منٹ آدمی غور کر لیا کرے کہ کتنی میں نے حق تلفیاں کیں اور کتنی حقوق کی ادائیگیاں کیں۔ جتنی ادائیگی اللہ کے حقوق کی، بندوں کے حقوق کی ہوئی شکر کرے، حمد کرے اور کہے کہ یا اللہ! یہ تیری توفیق سے ہوا میں تو اس قابل نہ تھا اور جتنی غلطیاں ہوئیں فوراً معافی مانگ لے جو اہل حقوق ہیں ان سے معاف کرالے، وہ صاف ستھرا رہے گا، پھر اس کے قلب میں تشویش نہ ہوگی، طمانیت ہوگی، بشاشت ہوگی، بادشاہوں کی مانند اس کی زندگی ہوگی کہ میں کسی کا قرض دار نہیں ہوں، کسی کا دَینِدار (مقروض) نہیں ہوں۔ وہ بادشاہوں کی طرح زندگی بسر کرے گا، یہ بہتر ہے کہ ایک آدمی فقیر، پریشان پراگندہ حال کی طرح زندگی بسر کر دے، یا یہ بہتر ہے کہ بادشاہ بن کر زندگی بسر کرے، جس کا قلب صاف ہے وہ بادشاہت میں ہے اور جس کے قلب میں بے چینی ہے وہ فقیر ہے پریشان حال ہے تو اس پریشانی کو دور کرنے کی صورت شریعت نے محاسبہ رکھی کہ روزانہ اپنا حساب لے لیا کرے اس لیے فرمایا وَإِلَيْهِ النُّشُوْرُ نعمتوں کے استعمال سے ہم نہیں روکتے، مگر دو باتیں چاہتے ہیں ایک تو یہ کہ حدود میں استعمال ہو، حد سے گزرا ہوا نہ ہو اور ایک یہ کہ موت کو یاد کرتے رہو، بے فکر ہو کر مت رہو۔

کارآمد عبادت......تو گویا مسلمان کی حقیقت نکلی متفکر، وہ فکر میں رہے کہ میرے سے کسی کی حق تلفی نہ ہو جائے، ہر وقت فکر لگی ہوئی ہو، اسی کو حدیث میں فرمایا گیا ہے: تَفَكُّرُ سَاعَةٍ خَيْرٌ مِّنْ عِبَادَةِ سَنَةٍ ۔ ① ایک گھڑی فکر

① علامہ عجلونیؒ امام فاکہانیؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ حضرت سری سقطیؒ کا قول ہے، نیز فرماتے ہیں: حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابودرداءؓ سے ان الفاظ کے ساتھ منقول ہے: فکرۃ ساعۃ خیر من عبادۃ ستین سنۃ دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۱ص: ۳۱۰۔

کرنا اپنے معاملے میں یہ ایک برس کی عبادت سے زیادہ بہتر ہے۔
اس لیے کہ صحیح فکر سے ایک برس کی عبادت کا راستہ درست ہو جاتا ہے، کھل جاتا ہے تو بے فکری عبادت کارآمد نہیں ہے، فکر مندانہ عبادت ہوگی وہ کارآمد ثابت ہوگی، اس لیے اِلَیْهِ النُّشُوْرُ سے توجہ دلائی گئی ہے کہ حساب آتا ہے اور ہماری طرف پہنچنے والے ہو، تم اس وقت کو پیش نظر رکھ کر کرو، جو تمہارا جی چاہے کرو، چاہے اسلام اختیار کرو چاہے کفر کرو مگر یہ سمجھ لو کہ آ کر حساب دینا ہے۔

صوبہ زمین کے احکام کا حاصل...... اور اگر یہ کہو کہ ہمارے فرشتے وقت پر نہیں آئیں گے۔ اوّل یہ خام خیالی ہے لیکن اگر یہ ہو بھی تو فرشتوں کو بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ زمین ہی کافی ہے تمہارے لیے بادل ہی کافی ہیں، ایک مچھر ہی کافی ہے۔ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ. اللہ کے لشکروں کو کوئی نہیں جانتا کہ کہاں کہاں ہیں۔ چاہے مچھروں سے کام لے لے، چاہے چیونٹیوں سے کام لے لے، چاہے بادلوں سے کام لے لے چاہے زمین سے کام لے لے۔ وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ پہلے سے پہلے نذیروں کے ڈرانے کو یاد رکھو ایسا نہ ہو کہ وقت کے وقت پر تمہیں یاد آئے تو کہو کہ واقعی ڈرانے والے صحیح کہہ رہے تھے ہم ہی غلطی پر تھے۔ اس وقت کا اعتراف کارآمد ثابت نہیں ہوگا، تو یہاں تک حق تعالیٰ نے گویا زمین کا جو صوبہ ہے اس کی حکومت کا، اس کے متعلق ایک اجمالی صورت بیان فرمائی کہ نعمتوں کے استعمال کی اجازت دی، حدود بتلا دیں۔ اب دوسرا علاقہ جو ہے وہ جو اور فضا کا ہے جس کو آگے شروع کیا گیا ہے۔

فضا پر خدائی حکومت...... اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّ يَقْبِضْنَ ۘ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ ۭ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍۢ بَصِيْرٌ ○ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ ۭ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ ○ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ يَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ۚ بَلْ لَّجُّوْا فِيْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ ○ اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰي وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

''اور کیا نہیں دیکھتے ہواڑتے جانوروں کو اپنے پر کھولے ہوئے اور پر جھپکتے ہوئے۔ ان کو کوئی نہیں تھام رہا رحمان کے سوا، اس کی نگاہ میں ہے ہر چیز بھلا وہ کون ہے جو فوج ہے تمہاری، مدد کرے تمہاری رحمٰن کے سوا منکر پڑے ہیں برے بہکائے میں۔ بھلا وہ کون ہے جو روزی دے تم کو اگر وہ رکھ چھوڑے اپنی روزی، کوئی نہیں پر اڑ رہے ہیں، شرارت اور بدکنے پر۔ بھلا ایک جو چلے اوندھا اپنے منہ کے بل وہ سیدھی راہ پائے یا وہ شخص جو چلے سیدھا ایک سیدھی راہ پر''۔

حق تعالیٰ کی مملکت کے تین علاقے ہیں...... میں نے عرض کیا تھا کہ حق تعالیٰ کی مملکت کے تین علاقے ہیں جو اس سورۃ میں بیان فرمائے گئے ہیں۔ اور ایک سمٰوات، آسمان اور اس کی مخلوق اور اس پر حکمرانی کا انداز اور ایک زمین اور زمینی مخلوق اور اس پر حکومت کا انداز اور ایک جو اور فضا جو آسمان اور زمین کے درمیان میں ہے، اس

پرحکمرانی کا طریق تو دوعلاقوں کے بارے میں میں نے بقدرِ ضرورت تفسیر عرض کی۔ یہ تیسرا علاقہ ہے جو اور فضا کا جس کو اَوَلَمۡ یَرَوۡا اِلَی الطَّیۡرِ فَوۡقَهُمۡ صٰٓفّٰتٍ وَّ یَقۡبِضۡنَ ، سے شروع کیا گیا ہے اور اس کی بنا یہ ہے کہ زمینی مخلوق میں انسانوں کو توجہ دلائی گئی ہے کہ وہ اللہ کی حکومت کو مانیں اور اس کے قانون پر چلیں اگر ایسا نہیں کریں گے تو ان پر بلیات اور فتنے برسیں گے اور وہ مصائب میں مبتلا ہوں گے، منجملہ ان کے دو چیزیں بیان فرمائی گئی تھیں کہ کیا تم آسمان والے سے مطمئن ہوکر بیٹھ جاؤ گے کہ زمین تمہیں دھنسا دے اور خسف کر دیئے جاؤ یا یہ کہ آسمان سے پتھر برسا دیئے جائیں اور ان سے انسانوں پر پتھراؤ ہو جائے، اس پر انسان اگر سلامتی کے ساتھ غور کرے اور اطاعت شعاری کے جذبے سے غور کرے تو بات بالکل سیدھی اور صاف ہے۔

انسانی روگ، عقل کا بے جا استعمال...... مگر انسان میں ایک روگ یہ ہے کہ وہ اللہ کے احکام میں خود رائی کو دخل دیتا ہے اور اس خود رائی کا منشاء ہوتا ہے عقل۔ تو عقل تو دی گئی تھی اس لیے کہ اللہ کے احکام کو سمجھے اور غور کرے اور کوئی شبہ پیش آئے تو عقل سے اس شبہ کو صاف کرلے، اس نے عقل کو استعمال کیا معارضہ میں اور حق تعالیٰ کے مقابلے میں، عقل کو اللہ کے احکام میں طرح طرح کے شبہات نکالنے کا، شکوک پیدا کرنے کا اور اس میں الجھنے کا ذریعہ بنایا، تو قلبِ موضوع ہوگیا۔ عقل اس لیے دی گئی تھی کہ احکام کو سمجھے اور کوئی شبہ طبعی طور پر پیش آئے تو عقل سے اس کو دفع کرلے۔ اس نے کیا یہ کہ عقل کو لڑائی کا ذریعہ بنایا اللہ سے اور اس کے احکام میں طرح طرح کے شکوک اور شبہات نکالنے شروع کیے اور معارضہ شروع کیا جس کا مطلب یہ ہے کہ گویا یہ احکام معاذ اللہ عقل کے خلاف ہیں، پھر میں انہیں کیوں مانوں؟....

تو اپنی برأت ذمہ کے لیے اس نے عقل کو حق کے مقابلہ میں استعمال کیا حالانکہ عقل دی گئی تھی حق کی اطاعت کے لیے کہ پوری طرح سے سمجھو تو یہاں بھی انسان نے یہی کیا کہ جب فرمایا کہ ہم آسمان سے پتھر برسا دیں گے تو اس نے کہا بھلے یہ کیسے ہوسکتا ہے، پتھر تو ایک وزنی چیز ہے اور وزن دار چیز ہمیشہ نیچے کی طرف کو آتی ہے۔ زمین مرکزِ ثقل ہے اور وہ اپنی طرف کھینچتی ہے، اسے اوپر نہیں جانے دیتی تو آسمان میں پتھر کہاں ہیں جو وہاں سے برسیں ، یہ عقل کے خلاف ہے کہ وزنی چیزیں اوپر جائیں۔

خالقِ طبیعت کو خلافِ طبیعت بھی قدرت ہے...... حالانکہ اگر وہ اس پر غور کرتا کہ جس خالق نے یہ چیزیں پیدا کی ہیں اور ان میں طبعی رفتار رکھی ہے تو طبیعت کا پیدا کرنے والا بھی تو وہی ہے، اگر وہ طبیعت کو بدل دے تو اس کے اختیار میں ہے، اتنا تو اس کا اختیار سمجھا کہ وہ طبیعت کے مطابق بنا دے اور یہ نہ سمجھا کہ طبیعت کے خلاف کرے، حالانکہ جو طبیعت کا خالق ہے وہ طبیعت کو ادھر بھی چلا سکتا ہے ادھر بھی چلا سکتا ہے۔ طبیعت کے خلاف کرے تو طبیعت اس پر حاکم تو نہیں ہے، حاکم تو طبیعت کے اوپر وہ ہے۔

ایک درخت جب پیدا ہوتا ہے اور آپ منوں مٹی کے نیچے بیج ڈال دیتے ہیں، اس بیج میں سے کونپل نکلتی ہے

،کونپل اتنی کمزور ہے کہ اگر چٹکی سے مسلیں تو مسل دی جائے۔لیکن اللہ نے اس کو اتنا طاقت ور بنایا کہ منوں مٹی کے جگر کو چیر کراوپر کی طرف آتی ہے۔حالانکہ طبیعت یہ تھی کہ نیچے کی طرف کو جائے ،پتے کو اگر آپ چھوڑ دیں تو وہ نیچے جائے گا،اوپرنہیں جائے گا،لیکن وہی پتا جب بیج سے نکلتا ہے تو وہ جاتا ہے اوپر کی طرف ،اول تو منوں مٹی کو چیرتا ہے،اس کے جگر کو شق کر کے باہر نکلتا ہے پھر باہر نکل کر بھی یہ نہیں کہ نیچے کی طرف جائے وہ چڑھ کر آسمان کی طرف جاتا ہے اور ایک بڑا اتنا درخت بن جاتا ہے۔یہ طبیعت کو کس نے بدل دیا،طبیعت تو یہ چاہتی ہے کہ درخت نیچے کی طرف آئے لیکن نیچے کے بجائے اسے اوپر کی طرف لے گئے تو قدرت ہے مالک کی۔وہ اس طبیعت کے خلاف حکم جاری کردے،طبیعت کو اپنے خلاف چلنا پڑے گا،طبیعت کے موافق اگر حکم دے موافق چلنا پڑے گا ۔طبعی چیز یہ ہے کہ آدمی اگر نقش ونگار بنائے تو کاغذ پر بنا سکتا ہے اور پتھر پر بنا سکتا ہے لکڑی پر نقش ونگار بنا سکتا ہے ،لیکن کیا یہ کسی کو قدرت ہے کہ پانی کے اوپر نقاشی کردے مگر اس کی قدرت یہ ہے کہ ایک گندے پانی کے قطرہ کے اوپر ایسے نقش ونگار بناتا ہے کہ انسان بن جاتا ہے۔

تو ایک پانی کے قطرے پر نقاشی کرنا یہ آپ کی طبیعت کے خلاف ہے لیکن اللہ کی قدرت کے خلاف تو نہیں تو جب قدرت والے کو قدرت والا مان لیا تو مان کر پھر اسے مقید کرنا کہ آپ ادھر کو چلیں ادھر کو نہ چلیں۔یہ انسان کی کج فطرتی کی بات ہے۔ورنہ وہ یوں کہتا کہ طبیعت کو چلا دیا ادھر یہ بھی اس کی قدرت ہے اور طبیعت کو اس کے خلاف چلا دیا یہ بھی اس کی قدرت ہے،پتھروں کے نیچے ڈال دے ......یہ بھی اس کی قدرت ہے اور اوپر اٹھا کر ے جائے یہ بھی اس کی قدرت ہے تو پہلے تو غور کرنا چاہیے تھا کہ عقل سے مگر عقل کو اللہ کی قدرت کے مقابلہ پر استعمال کیا اور اپنی موافقت کے گویا عقل میری ہے اور میری تائید کرے گی،آپ کے خلاف کرے گی اور یہ نہ جانا کہ عقل بھی انہی کی پیدا کی ہوئی اور تم بھی انہی کے پیدا کیئے ہوئے،تمہیں حق کیا ہے کہ مالک کے خلاف چلو اور اپنے آلات اور قوئی کو اس کے خلاف میں استعمال کرو،تو یہ تو ہے ایک عقلی چیز۔

خلاف طبیعت پر قدرت کی تاریخی مثال......لیکن حق تعالیٰ نے جواب دیا دو طرح پر ایک تاریخ پیش کی،اور ایک حسی مثال پیش کی،تاریخ کی طرف تو اشارہ کیا وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ پچھلوں نے بھی اعتراضات کیے لیکن پچھلوں پر تاریخ شاہد ہے کہ پتھر برسائے گئے،تو حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر پتھر برسا دیئے گئے۔ایک تاریخی واقعہ ہے اور سچی تاریخی حقیقت ہے اور سچائی سے بیان کیا گیا ہے۔تو اسی کو دیکھ کو عبرت پکڑ و تھوڑی سی کہ جس نے ایک قوم پر پتھروں کو برسا دیا وہ آج بھی برسا سکتا ہے،گنہگار جب بھی تھے اور آج بھی ہیں تو جس نوع کے گناہ پر پچھلے دور میں پتھر برس سکتے ہیں تو اس دور میں اس قسم کے گناہ پر آج کے دور میں کیوں نہیں برس سکتے۔

یہ تو رحمۃ للعالمین کا فضل ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت عامہ کا فضل ہے کہ اس قسم کے عام عذابوں میں امت کو مبتلا نہیں کیا گیا،لیکن اس کی نفی بھی نہیں کی گئی کہ اگر ضرورت پڑی تو اس امت پر بھی ہم عذاب

نازل کریں گے۔حدیث میں فرمایا گیا ہے:لَيْسَ عَذَابُ اُمَّتِي الْخَسْفُ وَالْمَسْخُ وَالرَّجْمُ اِنَّ عَذَابَ اُمَّتِي الْفِتَنُ وَالْقَتْلُ وَالزَّلَازِلُ.

میری امت کا عام عذاب یہ نہیں ہوگا کہ ان کی صورتیں مسخ کردی جائیں جیسے پچھلی امتوں کو بندر بنادیا گیا،بعضوں کو خنزیر بنادیا گیا۔اس امت پر یہ رحمت ہے کہ عام طور سے نہیں ہوگا،لیکن جزوی طور پر اگر ہوجائے کسی کو مسخ کر کے خنزیر کی صورت بنادیا جائے یا کسی کو بندر کی صورت دے دی جائے تو یہ آج بھی ممکن ہے اور واقعات پیش آئے ہیں۔

امم سابقہ کے اجتماعی عذاب کی جزوی صورت آج بھی ممکن ہے!......آپ نے سنا ہوگا کہ اخبارات میں ایک واقعہ آیا،بھوپال میں یہ قصہ گزرا اور وہ یہ کہ ایک عورت کے اولاد نہیں ہوتی تھی تو اس نے کسی سادھو سے رجوع کیا اور کہا کہ کوئی تدبیر ایسی بتلایئے کہ میرے اولاد ہوجائے۔اس کم بخت نے کہا کہ قرآن شریف کو نیچے رکھ کے اس کے اوپر بیٹھ کر تو غسل کر تو تیرے اولاد ہوجائے گی،حالانکہ وہ مسلمان عورت تھی۔لیکن بعض دفعہ عورتیں اولاد کی طمع میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دیتی ہیں اور اس قسم کے ٹونے اور ٹوٹکوں میں مبتلا ہوجاتی ہیں۔ اس ظالم نے یہ حرکت کی اور ایمان کو پس پشت ڈال کر قرآن شریف پر بیٹھی اور وہاں سے اٹھ کر جب آئی تو اس کی صورت خنزیر کی سی تھی۔بال وال تو تھے سر پر جس سے یہ پہچانا گیا کہ وہ انسان تھی لیکن شکل مسخ ہوگئی۔یہ واقعہ اخبارات میں بھی آ گیا۔

اور بعضوں کو شبہ ہے کہ صاحب،اخبار میں کیوں اس واقعہ کو لکھ دیا اس سے تو معاذ اللہ!اسلام کی توہین ہوئی کہ ایک مسلمان بدک گیا،میں کہتا ہوں کہ قرآن شریف میں واقعات اس قسم کے کیوں بیان کئے کہ پچھلی امتیں مومن ہوتے ہوئے جب حق کے مقابلہ پر آئیں تو انہیں خنزیر کی صورت دے دی گئی،اگر اس سے اس دور کے اسلام کی توہین نہیں تھی تو آج بھی اگر اس قسم کا واقعہ آئے اور وہ عام کیا جائے تو اس میں اسلام کی توہین نہیں۔

یہ تو کفر کی توہین ہے کہ اسلام چھوڑ کر جب کفر اختیار کیا تو صورت مسخ ہوئی اگر عیاذ اًباللہ!یہ ہوتا کہ اسلام قبول کرنے پر تلاوت قرآن کرنے پر معاذ اللہ صورت بگڑ جاتی تو اسلام کی توہین تھی۔لیکن اسلام کو چھوڑ کر کفر کی طرف آنے میں جب صورت بگڑی تو اسلام کی عظمت نمایاں ہوئی،کفر کی اہانت اس میں واضح ہوئی تو یہ اسلام کی توہین نہیں بلکہ کفر کی توہین ہے اور اسلام کی عظمت اس سے ظاہر ہوتی ہے اور اگر اس میں اہانت تھی تو حق تعالیٰ قرآن کریم میں ایسے واقعات ہی بیان نہ فرماتے،تو اگر آج کے لوگوں نے اس قسم کے واقعات کو نقل کر دیا ہے تو قرآن کی پیروی کی کہ اللہ نے پچھلے واقعات نقل کیے انہوں نے سامنے کا واقعہ نقل کر دیا۔اسلام کی عظمت اس سے نمایاں ہوگئی۔

امم سابقہ کے تاریخی واقعات سے عبرت حاصل کی جائے......بہر حال میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ خسف یا مسخ یہ عام تو نہیں ہوگا رحمۃ للعالمین کی اس امت میں لیکن خاص خاص طور پر ہوگا۔حدیث میں فرمایا گیا کہ تقدیر کو جھٹلانے والے بعض طبقات زمین کے اندر دھنسا دیئے جائیں گے۔اس امت کے اندر بھی ایسے

واقعات ہونگے، تو اگر ایسا واقعہ پیش آئے معاذ اللہ! اس کو نقل کر دے مسلمان، تو یہ ڈرانا ہوگا اس سے کہ دیکھو تقدیر کے خلاف کرنے میں یہ وبال پڑتا ہے، لہٰذا تقدیر کی حمایت کرو اسلام کے مطابق چلو تاکہ اس قسم کے وبال سے بچ جاؤ۔ تو قرآن کریم نے تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کیا کہ پچھلے دور میں ایسا ہو چکا ہے وہ ہوا ہے پورے طبقے کے طبقے مسخ کر دیئے گئے پوری امت ڈرادی جائے یا پوری امت دھنسادی جائے، اس واسطے کہ یہ امت دوامی اور ابدی ہے اور اس کے مٹنے کے بعد کوئی اور امت آنے والی نہیں اس لیے قیامت تک یہ امت رہے گی اور ایک طبقہ حق پر رہے گا، خلاف کرنے والوں پر اس قسم کے عذابات آئیں گے اور اس قسم کے وبال ڈالے جائیں گے۔ تو اشارہ دیا قرآن کریم نے کہ جنہوں نے پہلے تکذیب کی تھی ان پر یہ واقعہ ہوا، لہٰذا تم بچو اس قسم کی تکذیب سے کہ تم نہ کہیں مبتلا کر دیئے جاؤ، تو پہلی چیز تو یہ ہے کہ تاریخی واقعات سے عبرت پکڑو، لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ . ①

قرآن کریم نے جو پچھلی امتوں کے واقعات بیان کیے ہیں وہ قصہ کہانی کے طور پر نہیں ہیں کہ وقت گزاری کے لیے تفریح طبع کے لیے کچھ قصے سنا دیئے۔ وہ بیان کیے گئے عبرت کے لیے تاکہ آدمی غور کرے کہ پچھلوں کی ان حرکتوں پر جب یہ عذاب آیا تو آج اگر وہ حرکتیں ہو گئیں تو آج بھی عذاب آسکتا ہے، یہی معنیٰ اعتبار کے اور عبرت پکڑنے کے ہیں تو ایک جواب تو دیا ہے تاریخی۔

قدرت خداوندی کا حسی ظہور...... اور دوسرا جواب ہے حسی اور وہ یہ کہ: اَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَٰفَّٰتٍ وَّيَقْبِضْنَ یا تم اللہ کی قدرت نہیں دیکھتے کہ یہ پرندے فضا کے اندر اڑ رہے ہیں وہ بھی تو اجسام ہیں پتھر جسم ہے، وہ بھی تو مٹی کے بنے ہوئے پرندے ہیں، لیکن ہزاروں گز اوپر ہوا میں ان کو تھام رکھا ہے تو کس نے تھاما ہے ان کو...؟

اگر آپ یہ کہیں کہ ان میں قوت ایسی تھی کہ وہ تھم گئے تو سوال یہ ہے کہ وہ قوت کس نے ان کے اندر رکھی۔ اس لیے فرمایا ان کو تھامنا یہ اللہ کی قدرت ہے اور جب چاہتے ہیں انہیں گرادیتے ہیں، بعض دفعہ اڑتا اڑتا جانور ایک دم نیچے آپڑتا ہے، وہ قوت اس وقت اس میں سے سلب کر لی جاتی ہے۔ چھین لی جاتی ہے۔ تو جب ایک جسم کو حق تعالیٰ ہزاروں گز فضا کے اندر اڑا کر تھامتے ہیں تو یہ کیوں نہیں ممکن ہے کہ ایک پتھر جسم کو اڑا دیں اور وہ چلا جائے نیچے اور اسے ڈال دیں نیچے پہلے تو اوپر جائے اور رکے فضا میں اور پھر نیچے آجائے۔

اگر اس پر یوں کہا جائے کہ صاحب ہوسکتا ہے کہ ایک جانور بے چارہ ہوا اڑا کر لے گئی اور وہ چلا گیا وہ ہوا کی طاقت سے اڑ گیا۔ ہوا بیچ میں سے نکل گئی وہ نیچے آپڑا تو یہ ہوا کہ کارستانی ہے قدرت کی تھوڑا ہی ہے۔ عیاذاً باللہ اگر کوئی (کہے) تو اس بارے میں فرماتے ہیں اور إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ تمہارے سروں پر یہ پرندے اڑ رہے ہیں اور صف ..... ٹکڑیاں اور جماعتیں بن بن کر اڑ رہے ہیں، اگر ہوا اٹھا کر لے جاتی تو ایک کو دو کو چار کو ایک اتفاقی

① پارہ: ۱۳، سورۃ: یوسف، الآیۃ: ۱۱۱.

واقعہ پیش آتا لیکن یہ تو ترتیب وار صف بندی کر کے جانور اڑتے ہیں، یہ تو ان کے شعور اور ارادہ کا دخل ہوا وہ اللہ نے ان کے اندر پیدا کیا تو یَقْبِضْنَ خدا کے سوا کسی نے روک رکھا ہے انہیں اور وہ صف بن کر اڑتے ہیں جیسے مرغابیاں اڑتی ہیں تو ہمیشہ مثلث کی صورت پر اڑتی ہیں دو ٹکڑیاں ہوتی ہیں مثلث، آگے ان کا سردار ہوتا ہے، وہ آگے آگے چلتا ہے اور پیچھے وہ چلتی ہیں جیسے پریڈ کرتی ہوئی فوج جاتی ہے، ترتیب وار، تو مرغابیاں جب اڑتی ہیں تو ترتیب وار اڑتی ہیں، بطخیں جب اڑتی ہیں تو ترتیب وار اڑتی ہیں۔ چھوٹی چڑیاں جب اڑتی ہیں تو ترتیب وار ٹکڑیاں بن بن کر اڑتی ہیں، تو سارے نمونے دکھلا دیئے، انفرادی طور پر بھی پرندے اڑتے ہیں صف باندھ کر بھی اڑتے ہیں، ٹکڑیاں بن کر بھی اڑتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ کوئی محض طبعی کارخانہ نہیں ہے بلکہ فاعل مختار کی بنائی ہوئی چیزیں ہیں کہ کسی کو اس طرح بنادیا، کسی کو اس طرح۔ اگر طبعی بات ہوتی تو طبیعت کی ایک رفتار ہوتی جب جانور گرا نیچے آپڑتا، لیکن ترتیب وار اڑنا قاعدہ سے اڑنا، معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص نظام کے تحت وہ اڑ رہے ہیں، کسی اختیار کے تحت وہ اڑتے ہیں صفیں باندھ کر،

کوئی اگر یوں کہے کہ صاحب پر چونکہ ان کے بنائے ہوئے ہیں وہ کھول دیئے، لہٰذا اڑ رہے ہیں تو پروں کی کارستانی ہے تو فرماتے ہیں ویقبضن ایسا بھی تو ہے کہ پر سمیٹ لیتے ہیں اور پھر جا رہے ہیں دور تک، تو اب کیوں جا رہے ہیں؟ اگر پروں کی کارستانی تھی تو پروں کو سمیٹ کر بھی بہت سے جانور اڑتے ہیں۔ بہت سے پر پھیلا کر اڑتے ہیں۔ بہت سے پروں کو سمیٹ کر اڑتے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں کہ ایک مسافت تک پر کھولے ہوئے ہیں اور ایک مسافت میں پر سمیٹ لیے اور چلے جا رہے ہیں تو اگر پروں کی وجہ سے اڑ رہے ہیں تو وہاں بھی پروں کو سمیٹ لیا گیا اب کیسے اڑ رہے ہیں.....؟ اب کس نے تھام رکھا ہے انہیں؟ تو پروں سے بھی اڑتے ہیں اور پروں کو سمیٹ کر بھی اڑتے ہیں۔ یہ طبعی بات نہیں ہے بلکہ اللہ کے اختیار اور قدرت کی بات ہے۔ وَيَقْبِضْنَ اور ان پرو کو وہ سمیٹ دیتا ہے وہ پھر بھی اڑتے ہیں اور فضا میں معلق ہو جاتے ہیں بہت دیر تک، بعضے جانور نہیں اڑتے لٹکے ہوئے ہیں فضا میں۔ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمٰنُ رحمٰن کے سوا کون ہے جس نے تھام رکھا ہے تو جو ان پرندوں کے اجسام کو اوپر تھام سکتا ہے وہ اگر پتھروں کو تھام دے تو تمہاری عقل اس کے بارے میں کیا کہتی ہے؟ عقلیں یہاں لڑائی تھیں لیکن انہی کی طبعی رفتار نے تمہاری عقلوں کو کند کر دیا ہے۔ جواب دے دیا تو پتھر کے بارے میں بھی سمجھ لو کہ تمہاری عقلیں کند ہیں قدرت اللہ کی تابع نہیں ہے، تمہاری عقلوں کے یا تمہارے ڈالے ہوئے وسوسوں کے وہ تو اپنی قدرت سے کام کرتا ہے تو مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمٰنُ حاصل یہ نکلا کہ تاریخ دیکھو تب واقعات ثابت، پھر کیوں نہیں مانتے انہیں؟ تاریخ پر نظر نہ کرو تو محسوسات پہ نظر کرو جو ہر وقت تمہارے سامنے ہیں اس کو سامنے رکھو اب اگر تم نہ اُسے مانو نہ اِسے مانو تو معلوم ہوا مقصود مقابلہ ہی ہے حق تعالیٰ کا یہ عقل کا نام محض حیلے کے طور پر لے رکھا ہے ورنہ عقل تو سمجھا رہی ہے کہ جب یہ واقعہ پرندوں میں پیش آ سکتا ہے تو پتھر میں بھی پیش آ سکتا ہے۔

عقل پرست طبقہ سے ایک سوال...... اگر میں کہوں کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے یہ قدرت دی ہے کہ جب آپ اینٹ پھینکتے ہیں تو بیس گز تک چلی جاتی ہے حالانکہ اینٹ کی طبعی رفتار کا تقاضا ہے کہ نیچے آئے مگر آپ کے ارادہ کی قوت اسے اوپر پھینک دیتی ہے، جب آپ کے ارادہ کی قوت ختم ہو جاتی ہے تو پھر وہ اصلی رفتار پہ آ کر اینٹ نیچے آ جاتی ہے۔ تو آپ کے ارادہ میں تو یہ طاقت ہو کہ اینٹ کی طبیعت کے خلاف اسے اوپر پہنچا دے اور اللہ کے ارادہ میں یہ طاقت نہ ہو کہ وہ اس کو طبیعت کے خلاف اوپر پہنچا دے تمہارا ارادہ زیادہ سے زیادہ پچاس گز تک اس کی قوت جاسکتی ہے اللہ کا ارادہ لامحدود ہے۔ وہ اگر پچاس ہزار گز سے اوپر اڑا دے تو اس کی طاقت سے بعید نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ باہر کی طاقت لے جاسکتی ہے اوپر اشیاء کو اور جتنی طاقت ہوگی اتنا لے جائے گا۔ انسان کی طاقت محدود کہ اس نے بیس گز پھینک دیا ڈھیلا اور اللہ کی طاقت لامحدود ہے۔ اس نے پچاس ہزار گز سے اوپر پھینک دیا پتھر کو اور پھر نیچے ڈال دیا۔ تو مطلب یہ ہے کہ حسی طور پر دیکھو، عقلی طور پر دیکھو، تاریخی طور پر دیکھو، کوئی وجہ انکار کی نہیں ہے سوائے ڈھٹائی کے، سوائے سرکشی کے، اس واسطے فرمایا کہ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمٰنُ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيرٌ ۔ س واسطے کہ وہ ہر چیز کو بصیرت سے جانتا ہے اس لیے کہ وہی تو پیدا کرنے والا ہے، اسے تو معلوم ہے کہ کس چیز میں میں نے کتنی قوت رکھی ہے اور کس طرح میں اسے استعمال کروں گا تو إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيرٌ ۔ تم پتھر پھینکتے ہو تو تمہیں بصیرت حاصل نہیں ہے کہ اس کے اندر کیا قوت ہے کیا نہیں ہے؟ تم نے تو اٹھا کر ڈھیلا پھینک دیا۔ چلا گیا، وہ بصیرت کے ساتھ اپنی طاقت کے ساتھ لے جائے اس پر تو اعتراض..... اور تم جو بے بصیرتی کے ساتھ ایک حرکت کر گزرو اس پر کوئی اعتراض نہیں تو یہ سوائے عصبیت اور جہالت کے اور کیا چیز ہے کوئی عقلی دلیل تو نہیں ہے کہ انکار کرو۔

مخلوق مخلوق کے ذریعہ خالق سے کیا مقابلہ کرے گی؟...... حاصل اس کا یہ نکلا کہ تمہیں تو اللہ میاں سے لڑنا ہی مقصود ہے۔ نہ عقل سے کام لینا، نہ حس سے کام لینا، نہ تاریخ سے عبرت پکڑنا، لڑنا مقصود، تو فرمایا کہ اچھا آؤ لڑو: أَمَّنْ هٰذَا الَّذِي هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ یہ کون ہے جو خدا کے مقابلے پر وہ لشکر آئے گا تمہاری مدد کرے گا اس لشکر کو بھی ہمیں بتا دو وہ کون سا لشکر ہے؟

یہ لشکر جتنا تم لاؤ گے اس مخلوق میں سے لاؤ گے، یہ تو ہماری بنائی ہوئی چیز ہے تو ہماری بنائی ہوئی چیز ہمارے ہی مقابلہ پر تھوڑا ہی آسکتی ہے۔ تمہاری کوئی بنائی ہوئی چیز ہو، وہ تمہارے مقابلہ پر نہیں آتی تو ہماری بنائی ہوئی چیز ہمارے مقابلے پر کیسے آ جائے گی؟ اور تم جو بھی لشکر لاؤ گے وہ مخلوق میں سے لاؤ گے اس لیے کہ خالق سے تو تم نے تعلق پیدا نہیں کیا کہ اس کے تابع بنتے، اس کی طاقت کو لیتے، اس سے تو لڑائی ٹھان لی اب مقابلہ کرو گے تو اپنی طاقت سے اور مخلوق کی طاقت سے تو بتلاؤ وہ کون سی مخلوق ہے جو ہمارے مقابلے پر آئے گی۔ أَمَّنْ هٰذَا الَّذِي هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ إِنِ الْكٰفِرُوْنَ إِلَّا فِي غُرُوْرٍ ''وہ کون ہے، جو رحمٰن کے

مقابلے پہ تمہاری مدد کرے گا''۔ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِیْ غُرُوْرٍ سوائے اس کے کہ تم دھوکے میں پڑے ہوئے ہو اور بہکے ہوئے ہو اور کیا کہا جائے۔ عقل کی تم نہیں کہتے، حس کی تم نہیں کہتے، تاریخ کی تم نہیں کہتے، کوئی قوت تمہارے ہاتھ میں نہیں کہ خدا کا مقابلہ کرو اور لڑنے کے لیے تیار، بقول شخصے:

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

لڑنے کو موجود اور نہ ہاتھ اور ہاتھ میں تلوار، اور پھر وہ قوتیں بخشی ہوئی خدا کی ہیں تو اس کی بخشی ہوئی قوتوں کو اس کے مقابلہ پر لانا اس سے زیادہ حماقت کی بات اور کیا ہوگی تو: اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ یَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِیْ غُرُوْرٍ

اللہ سے مقابلہ کی سوچ صرف انسان کی ہے......اب آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہیں گے کہ صاحب، سامان اور وسائل ہمارے ہاتھ میں ہیں، ہم بجلی کی مدد سے کام لیں گے۔ ہم گیس کی طاقت سے کام لیں گے، ہم راکٹ سے کام لیں گے، ان چیزوں کو لائیں گے مقابلہ پہ، تو اول تو ظاہر ہے کہ یہ تو مخلوقات خداوندی ہیں، ان میں یہ جراء ت کہاں ہے کہ اپنے خالق کا مقابلہ کریں۔ یہ حماقت تو انسان ہی پر سوار ہے کہ وہ خالق کا مقابلہ کرتا ہے، نہ پتھر مقابلے پہ ہیں نہ درخت مقابلے پہ ہیں نہ پہاڑ نہ دریا، کوئی چیز مقابلے نہیں کرتی یہ چیزیں حق ہیں: اِنْ كُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ① ''آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ بھی ہے وہ عبد اور بندہ (غلام) بن کر اللہ کے سامنے آیا ہوا ہے''۔

ڈھٹائی پر یہی انسان ہے کہ مقابلہ کرتا ہے اور کیوں کرتا ہے؟ اس لیے کہ ہم نے کچھ طاقتیں دے دی تھیں کچھ عقل کی طاقت دے دی تھی کچھ وسائل دے دیئے تھے تو سوال یہ ہے کہ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ یَرْزُقُكُمْ. وہ رزق دینے والا ان سامانوں کا وہ کون ہے؟ تم نے خود پیدا کر لیے تھے؟ بجلی تم نے پیدا کی ہے؟ پیدا اللہ نے کی ہے۔ کام اس سے تم لے لیتے ہو۔ زمین اللہ نے پیدا کی ہے، کام تم اس سے لے لیتے ہو، بیج کا درختوں کو اگانے کا، لیکن نہ درخت تم نے پیدا کیا، نہ بیج تم نے پیدا کیا، نہ زمین تم نے پیدا کی تمہاری بنائی ہوئی کوئی چیز نہیں استعمال کرنے کی کچھ قوت ہے تمہارے اندر، تو حاصل یہ نکلا کہ رزق دینے والے حق تعالیٰ ہیں، وہ دانے کا رزق ہو، کیڑے کا رزق ہو، عقل کا رزق ہو، قوتوں کا رزق ہو، ہتھیار کا رزق ہو، دینے والے وہ ہیں۔

اچھا اگر وہ اپنے رزق کو چھین لیں پھر تم کیا کرو گے، تمہارے قبضے میں تو نہیں، ایک بارش رک جائے، دانہ نہ ہو، بیٹھ جاتے ہیں حضرت انسان، اب آگے کچھ نہیں، بارش صرف روک دے اور بارش تو خیر سال بھر میں آتی ہے ہر وقت آپ دھوپ سے اور ہوا سے کام لیتے ہیں۔ ایک منٹ کے لیے وہ اپنی ہوا نکال لے، اب کیا ہوگا؟ بس سانس گھٹ کر ختم ہو جائے گا انسان، یہ کل آپ کی طاقت ہے تو اسی کے دیئے ہوئے رزق پر غرہ اور اسی کا مقابلہ

① پارہ: ۱۶، سورۃ: المریم، الآیۃ: ۹۳.

کرنا اس سے زیادہ حماقت اور سفاہت کیا ہوگی، کوئی اپنی چیز لاتے جو خدا کے مقابلے پر استعمال کرتے تو اپنی چیز تو کیا ہوتی تم خود بھی اپنے نہیں، تم نے خود بنالیا ہے اپنے آپ کو؟ بنانے والے نے بنایا ہے تم کون ہو، تو جب تم خود نہیں بنے اپنے آپ تو بقیہ چیزیں تم کیا بنا سکتے ہو، جو کچھ ہے وہ رزق دیا ہوا ہے اللہ کا تو: اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ یَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ''اگر اللہ اپنا رزق روک لے تو وہ کون ہے جو اللہ کے مقابلے میں آ کر تمہیں رزق دے گا''۔ اچھا، ہم بارش روک لیتے ہیں اور ساری مخلوق کو اکٹھا کر لو کہ وہ تمہیں رزق دے تو کہاں سے دے دے گی اس لیے دارومدار بارش پہ اور وہ قبضے میں ہے اس کے، ہم نے رزق روک لیا تو جس کا رزق ہم روکنا چاہیں وہ کون ہے جو تمہیں رزق دے دے، ہم نے رزق روک لیا تو کون ہے جو دروازے رزق کے تمہارے اوپر کھول دے تو اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ بات کیا ہے بَلْ لَّجُّوْا فِیْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ

سوائے اس کے کہ یہ بدک رہے ہیں، سوائے اس کے کہ سرکشی پر ہیں اور ڈھٹائی پر جمے ہوئے ہیں۔ ہٹ دھرمی کے سوا کوئی حجت ان کے ہاتھ میں نہیں ہے نہ عقل کی، نہ حس کی، نہ طبع کی، نہ قویٰ کی، کوئی چیز ان کے قبضے میں نہیں ہے، ڈھٹائی پر آمادہ ہیں اور وہ ڈھٹائی انہی کے انجام کو خراب کرے گی، اللہ میاں کا کچھ بھی نہیں بگڑے گا۔ اپنے آپ کو بھی تباہ کر رہے ہیں۔ بل لجوا فی عتو ونفور۔

منزل مقصود پر پہنچنے والا کون ہو سکتا ہے؟...... تو اب ان کی مثال ایسی ہوگی کہ جیسے ایک شخص تو وہ ہے کہ سیدھے راستے پر دیکھتی آنکھوں چل رہا ہے اور منزل مقصود کی طرف جا رہا ہے اور ایک وہ ہے کہ ٹیڑھا ترچھا راستہ اور اوندھا لیٹ گیا اس کے اوپر، آنکھ بھی کام نہیں کرتی، ہاتھ پیر بھی کام نہیں کرتے اور چاہتا یہ ہے کہ منزل مقصود پر پہنچ جائے تو کون پہنچے گا منزل مقصود پر؟ وہ پہنچے گا کہ جو سیدھے راستے پر جا رہا ہے، عقل سے کام لے رہا ہے، محسوسات کو دیکھ رہا ہے، اپنی قوتوں کو خالق کی راہ میں اختیار اور استعمال کر رہا ہے، راستہ دیکھ کر چل رہا ہے، وہ پہنچے گا یا وہ پہنچے گا کہ جو اوندھا لیٹ گیا ہے اور ہاتھ پیر بھی چھوڑ دیے، آنکھیں بھی زمین میں دھنسا دیں، نہ رستہ سامنے نہ منزل سامنے۔

تو تمہاری مثال وہی ہوگئی کہ رستہ کے اوپر ہو مگر اوندھے لیٹ کر، نہ آنکھ سے دیکھتے ہو، نہ دل سے سوچتے ہو، نہ غور و فکر کرتے ہو اور چاہتے ہو منزل پر پہنچ جائیں تو منزل پر تو وہی پہنچیں گے جو متبعین انبیاء علیہم السلام ہیں کہ راستے پر پڑے ہوئے ہیں چل رہے ہیں ہاتھ پیر استعمال کر رہے ہیں، آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، عقل سے حق کا راستہ معلوم کر رہے ہیں اس کی تائید کر رہے ہیں وہ پہنچیں گے منزل پر تم نہیں پہنچو گے تو تمہاری مثال اس شخص کی ہے کہ زمین کا راستہ سامنے ہے۔ بجائے چلنے کے اوندھا لیٹ جائے سب قویٰ کو بے کار کر دے، ہاتھ پیر کو بے کار، اس لیے کہ جب کسی قوت سے بھی کام نہیں لیتے تو اور کیا مثال ہے تمہاری یہی مثال بن سکتی ہے تو اس کو فرمایا کہ: اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُكِبًّا عَلٰی وَجْهِهٖۤ اَهْدٰۤی اَمَّنْ یَّمْشِیْ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ '' آیا وہ شخص جو چل رہا ہے اوندھا چہرہ کے اوپر الٹا پڑا ہوا ہے۔ وہ ہدایت پائے گا یا وہ پائے گا جو سیدھے

راستے پر سیدھا سیدھا چل رہا ہے''؟ تو جو سیدھے چلنے والے ہیں وہ انبیاء علیہم السلام ہیں، ان کے متبعین ہیں، ان کے پیروکار ہیں کہ علم وحی سامنے آیا کانوں سے سنا، آنکھوں سے دیکھا، عقل سے سوچا اور چل پڑے راستے کے اوپر، وہی پہنچیں گے منزل پر، وہ نہیں کہ آنکھ بھی بند کرلی، یعنی اوندھے لیٹ گئے، دل کو بھی بے کار کرلیا یعنی عقل سے بھی نہ سمجھا، ہاتھ پیروں کو الٹا ڈال دیا کہ چلنے کے قابل نہ رہے اور مدعی اس کے ہیں کہ ہم پہنچیں گے منزل مقصود پہ تو سوائے اس کے کہ اندھا پن کہا جائے اور کیا کہا جائے گا۔ وہ راستے پر پہنچے گا یا یہ راستے پر پہنچے گا۔

اپنی ذات میں مشاہدہ کی دعوت...... اس کے بعد فرمایا کہ یہ تو ہے سامان سا ہی مختلف چیزیں ہم نے دیں، عقل دی، سب کچھ دیا۔ لیکن خود تم اپنے اوپر غور کرو تم کہاں سے آئے؟ آیا تمہیں اللہ نے بنایا یا خود بخود بن گئے تھے؟ ظاہر ہے کہ خود بخود تو بنے نہیں، اگر خود بخود بن جاتے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وجود تمہارے ہاتھ میں ہے تو اگر وجود ہاتھ میں تھا تو یہ موت کیوں قبول کرتے ہو جبراً؟ کس کا جی چاہتا ہے کہ مر جائے تو اگر وجود ہاتھ میں ہے تو ملک الموت کو واپس کر دیا کرو کہ صاحب، ہم زندگی دینا نہیں چاہتے آپ کو یہ خود ہمارے قبضہ میں تھی وہاں تو چپ پڑے رہتے ہو، وہاں تو سانس چلنے لگتا ہے، جان دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہو، معلوم ہوتا ہے تمہارے ہاتھ میں کچھ نہیں تو جب روکنا زندگی کا تمہارے ہاتھ میں نہیں۔ تو لانا بھی زندگی کا تمہارے ہاتھ میں نہیں۔

لائی حیات آئے، قضا لے چلی، چلے   اپنی خوشی آئے نہ اپنی خوشی چلے،

جب ہم پیدا ہو رہے تھے تو ہماری درخواست نہیں تھی، خواہش نہیں تھی اللہ کو دینا تھا جان تو لینی پڑی، مجبوراً آنا پڑا، چاہے ہمارا جی چاہتا تھا آنے کو یا نہیں چاہتا تھا اور جب لے جائیں گے تو جانا پڑے گا، چاہے ہمارا جی چاہے نہ چاہے۔

عقل کے اندھے...... تو وجود تو آپ کا یہ ہے کہ نہ حیات پر قبضہ نہ اپنے وجود پہ قبضہ۔ اور دعوے یہ ہیں کہ اللہ کے احکام میں (''مـــن'' میخ نکالنا کہ ہم یوں کر ڈالیں گے اور قدرت کے چیلنجوں کو منظور کرتے ہیں، یہ جو درمیان میں بہت سے سیلاب آئے اور انہوں نے بستیوں کو غرقاب کیا ہزاروں آدمی مارے گئے تو بعض عقل کے اندھوں نے دعویٰ کیا کہ ہم نے بند لگانے شروع کر دیئے ہیں اور قدرت کے چیلنج کو ہم نے قبول کرلیا ہے، ہم مقابلے کے لیے تیار ہیں۔ جو بند باندھے اگلے ہی سال اس میں شق واقع ہو گئے دراڑ واقع ہو گئے، پھر مرمت شروع ہوئی اور خدا جانے کب تک وہ مرمت کام دے گی۔ خدانخواستہ وہ پھٹ پھٹا گئے تو پھر ساری بستیاں اور جلدی غرق ہونگی۔

بعض عقل کے نابینا وہ بھی ہیں کہ وہ قدرت کی پکار کو چیلنج سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں ہم نے چیلنج مان لیا، ہم مقابلہ کریں گے اور طاقت یہ ہے کہ اپنی زندگی بھی اپنے ہاتھ میں نہیں، اپنی قوت بھی نہیں اپنے ہاتھ میں۔ تو فرماتے ہیں قُلْ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَکُمْ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ . جن قویٰ پر تم نازاں ہو آنکھ پہ ناک پہ یہ دینے والا کون ہے اَنْشَاَکُمْ وہی ہے جس نے تمہیں ابتداء میں بنایا اور از سرنو بنایا اور وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ تم میں سننے کی طاقت رکھی کہ کچھ معلومات سن کر حاصل کرو، آنکھوں میں دیکھنے کی

طاقت رکھی کہ کچھ معلومات دیکھ کر حاصل کرو، دل میں بوجھنے کی طاقت رکھی تا کہ غور وفکر سے کچھ معلومات میں اضافہ کرو۔ یہ ساری قوتیں حق تعالیٰ نے دیں اور عجیب صناعی کے ساتھ دیں۔

قلبی بینائیاں ...... اللہ نے قلب کو ایک عجیب کائنات بنایا، اس قلب کے اندر جیسے محققین لکھتے ہیں کہ دو دروازے ہیں، ایک نیچے کی طرف کھڑکی کھلی ہوئی ہے قلب میں ایک اوپر کی طرف۔ اوپر کی کھڑکی کھلتی ہے تو عالم غیب کے مشاہدات کرتا ہے وحی اور الہام ربانی اور جمالات اور کمالات خداوندی کو دیکھتا ہے۔ عالم غیب منکشف ہوتا ہے اور نیچے کی کھڑکی سے دیکھتا ہے تو محسوسات نظر پڑتے ہیں، دریا اور پہاڑ اور جنگل، تو محسوسات کو نیچے کے سوراخ سے دیکھتا ہے اور مغیبات کو اوپر کے سوراخ سے دیکھتا ہے قلب ایک ہی ہے، لیکن اس میں بینائیاں دو قسم کی رکھیں۔ ایک اوپر کے دیکھنے کی ایک نیچے کے دیکھنے کی۔ ایک ظاہری چیزیں دیکھنے کی، ایک باطنی چیزیں دیکھنے کی۔ ظاہری چیزوں کے دیکھنے کے لیے آلات بنائے قلب کے لیے، آنکھ بنائی تا کہ شکلیں اور صورتیں دیکھے، کان بنائے تا کہ آوازوں کو سنے، زبانیں دیں تا کہ ذائقوں کو چکھے، ناک دی تا کہ خوشبو اور بدبو کو سونگھے، تو کسی شی کی صورت بھی انسان دیکھتا ہے کسی شئی کو خوشبو، بدبو کا بھی ادراک کرتا ہے کسی۔ شئی کی آوازیں بھی سنتا ہے۔ آوازیں سن کر بچاؤ بھی کرتا ہے اپنے کام بھی نکالتا ہے اگر شیر کی دھاڑ سنی تو بچنے کی کوشش کرتا ہے تو کان ذریعہ بنتے ہیں بچنے کا اور اگر آواز سن لی کسی اچھے خوشنما پرندے کی تو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے کہ گھر کی زینت بناؤں گا۔

تو کان ذریعہ بنا منافع حاصل کرنے کا بھی اور مضار کی مضرتوں سے بچنے کا بھی۔ اسی طرح سے آنکھ ذریعہ بنتی ہے چیزوں کے لینے کا بھی اور چیزوں سے بچنے کا بھی۔ اگر صورت دیکھ لے سانپ کی تو بھاگتا ہے آدمی، اگر صورت دیکھ لے کسی اچھے خوشنما پتھر کی سونے کی چاندی کی، دوڑتا ہے اس کے اٹھانے کے لیے۔ اگر آنکھ نہ ہوتی تو نہ نفع حاصل کر سکتا نہ مضرت سے بچ سکتا۔ تو آنکھ کو اللہ نے ذریعہ بنایا دور سے دیکھ کر منافع حاصل کرنے کا اور مضرتوں سے بچنے کا۔ بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ سامنے نہیں ہیں، ان کی آواز بھی نہیں آتی، لیکن ان کی بدبو اور خوشبو سے سمجھ لیتا ہے کہ یہاں فلاں چیز موجود ہے۔ شیر کے منہ میں بدبو ہوتی ہے اگر وہ سامنے بھی نہیں تو اس کے منہ کی بدبو دور تک آدمی سونگھ سکتا ہے، سمجھ لیتا ہے کہ یہاں شیر موجود ہے، وہاں سے بھاگتا ہے اور اگر دوسرا جانور ہے اس کی بو آئی اور وہ استعمال کا ہے تو شکار کرنے کی کوشش کرتا ہے تو ناک ذریعہ بنتی ہے بہت سی چیزوں سے بچنے کا اور بہت سی چیزوں کے حاصل کرنے کا، اسی طرح سے ذائقہ بعض چیزوں کو چکھ کر آدمی محسوس کرتا ہے کہ یہ مضر ہوں گی، اس کا ذائقہ بتلا رہا ہے کہ یہ مضر ہے بعض ذائقے ہیں جو فرحت بخشتے ہیں۔ انہیں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

قوتِ قلبیہ کے اِدراک ...... تو آنکھ، ناک، منہ یہ تمام چیزیں آلات ہیں مگر حقیقت میں ان ساری چیزوں کا ادراک کرنے والا قلب ہے۔ یہ سب خدام ہیں اس کے۔ آنکھ حقیقتاً خود نہیں دیکھتی، دل دیکھتا ہے۔ یہ عینک چڑھی ہوئی ہے دل کے اوپر آنکھ، آنکھ خود نہیں دیکھتی، بسا اوقات آپ کسی بازار میں چلے جا رہے ہیں اور بڑے بڑے اعلیٰ

مناظر، بڑی بہترین دکانیں اور روشنیاں ہیں، گھر آ کر دوسرا کہتا ہے کہ بھئی بڑے بڑے تماشے تھے آج تو بازار میں تو آپ کہتے ہیں کہ مجھے کچھ بھی نظر نہیں پڑتا، کہتا ہے میاں آنکھیں تو کھلی ہوئی تھیں، افوہ! میں تو فلاں خیال میں غرق تھا، مجھے تو کچھ نہیں نظر آیا۔ معلوم ہوا آنکھ دیکھنے والی نہیں ہے دل دیکھنے والا ہے۔ جب دل متوجہ ہے دوسری طرف کچھ نہیں نظر آتا۔ آپ کسی دھیان میں پڑے ہوئے ہیں اور زور سے گھنٹہ بجا، آپ کو پتہ بھی نہ چلا تو دوسرے نے کہا کہ میاں تم نے نماز نہیں پڑھی، وہ گھنٹہ جو بج گیا تھا اور تم نے افطار نہیں کیا وہ اتنا بڑا گولہ چھوٹا تھا۔ اے ہے! میں نے تو سنی ہی نہیں، اے میاں! بڑے زور سے بجا ہے، کہتے ہیں افوہ میں تو فلاں خیال میں ڈوبا ہوا تھا مجھے تو دھیان ہی نہ آیا، معلوم ہوا کہ دل سنتا ہے کان نہیں سنتا، جب دل متوجہ ہے تو کان سنیں ...... اور دل متوجہ نہیں تو کھلے ہوئے کان نہیں سنتے، اسی طرح سے ذائقہ کی بات ہے بعض دفعہ دھیان نہیں ہوتا تو نہ کھٹے کا ذائقہ آتا ہے نہ میٹھے کا۔

مجھے ایک واقعہ یاد آیا ہے، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سالے تھے حاجی مقبول صاحب، بڑے بزرگ لوگوں میں سے تھے تو حضرت کے یہاں رہتے تھے، کھانا وانا سب وہیں تھا، اتفاق سے دو تین دن سے روزانہ چنے کی دال پک رہی تھی، تو انہوں نے بہن سے شکایت کی کہ روز چنے کی دال، کوئی اور دال بھی پکا لیا کرو۔ خیر انہوں نے اگلے دن ماش کی دال پکائی، کھانا کھانے کے بعد کہنے لگے آج بھی وہی چنے کی دال پکائی تھی، انہوں نے کمر میں دو ہنٹر ماری، اندھے یہ دال چنے کی ہے ماش کی؟ کہا کہ افوہ! مجھے وہی دھیان رہا جو تین دن سے تھا، اسی دھیان میں کھاتا رہا، مجھے وہی مزا آتا رہا جیسے چنے کا تھا۔ معلوم ہوتا ہے زبان نہیں چکھتی بلکہ دل چکھنے والا ہے اگر دل متوجہ ہو جائے تو آدمی متوجہ ہو کر سب کچھ چکھ لیتا ہے۔ دل متوجہ نہ ہو نہیں چکھتا۔ تو اصل میں دیکھنے والا بھی دل ہے، سننے والا بھی دل ہے، چکھنے والا بھی دل ہے اور صورتیں دیکھنے والا بھی دل ہے تو دل عجیب چیز نکلا وہ ان تمام خدام کو استعمال کرتا ہے۔ محسوسات کو دیکھتا ہے۔

ادراکات کا تحفظ ...... اچھا اب اس کے بعد پھر ایک عجیب کائنات دل کی یہ بھی ہے کہ ان ساری چیزوں کے ذریعے اس نے دیکھ بھی لیا، سن بھی لیا، چکھ بھی لیا، چکھنے کے بعد وہ ذائقہ غائب ہو جانا چاہیے تھا، دیکھنے کے بعد صورت غائب ہو جانی چاہیے تھی۔ لیکن دل نے اتنا قبول کیا کہ اب وہ شئی سامنے نہیں ہے لیکن ذرا آپ نے گردن جھکائی تو شئی دل کے سامنے ہے، یہ کہاں موجود ہے، یہ آنکھ میں تو موجود نہیں اگر آنکھ میں ہوتی موجود تو دوسری چیز دیکھنے کے قابل نہ رہتے، وہ چیزیں ہی ٹکراتی رہتیں تو آنکھ کہاں سے دیکھتی، آنکھ دیکھ کر فارغ ہوئی قلب نے فوٹو اتار لیا اور قلب کے اندر وہ نقشہ موجود ہے، اب جب چاہیں گے آپ دیکھ لیں گے۔ کسی شاعر نے کہا ہے ناں کہ:

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار ‏ ‏ ‏ اک ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

پس جہاں مراقبہ کیا اور سامنے موجود چیز، جہاں غور کیا چیز موجود، تو دل فقط دیکھتا ہی نہیں بلکہ نگلتا بھی ہے۔ ان چیزوں کو۔ دیکھنے میں تو یہ ہے کہ دیکھ لیا باہر باہر کی چیز ہے، دیکھ کر اس کی صورت کو نگلتا ہے اپنے اندر اور اس کا

نقشہ کھینچ لیتا ہے، فوٹو لے لیتا ہے تو دل ایک بڑا زبردست کیمرہ بھی ہے تو اس میں صورتیں بھی موجود ذائقے بھی موجود، ذائقے جو چکھے تھے وہ بھی موجود، آپ کہا کرتے ہیں کہ فلاں صاحب کے یہاں میں نے ایسا عجیب وغریب سالن کھایا کہ آج تک ذائقہ میری زبان میں موجود ہے، وہ زبان میں نہیں دل میں ذائقہ موجود ہے۔ اگر زبان میں وہ ذائقہ ہوتا تو دوسرا ذائقہ مل ملا کے کوئی ذائقہ باقی نہیں رہتا خلط ملط ہو جاتا تو زبان چکھ کر الگ ہوئی اس نے پہنچا دیا قلب کے اندر، تو درحقیقت ہرکارے اور اور خدام ہیں، جو صورتیں، آوازیں، ذائقے بٹور کر قلب کے سامنے پیش کر دیتے ہیں گویا یہ ایک سی آئی ڈی ہے کہ جس کے ذریعے سے قلب تمام چیزوں کے احوال معلوم کرتا ہے، صورتوں کے بھی، آوازوں کے بھی، ذائقوں کے بھی، خوشبو بدبو کے بھی قلب ہے حامل۔

قلب کے ظاہری وباطنی پانچ پانچ دروازے ......تو قلب ایک عجیب کائنات نکلی تو اس نے پانچ دروازے رکھے حواس خمسہ کے، ان کے ذریعہ محسوسات کو دیکھ کر اپنے اندر لے لیتا ہے اور پانچ ہی پھر حواس ہیں باطنی، قوت وہم اور قوت خیال اور قوت متفرقہ اور قوت عاقلہ، تو ان کے ذریعہ سے وہ غیبی چیزیں دیکھتا ہے۔ علوم میں جب غور کرتا ہے تو نئے نئے علوم اس کے سامنے منکشف ہوتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ بدن کے اندر نہیں ہے روح میں ہے، اور روح کا کنکشن ہے روح اعظم سے تو وہاں سے علوم اترتے ہیں، تو قلب ہی کے اندر یہ خاصہ ہے کہ جب غیب کی طرف متوجہ ہو تو وہاں سے علوم اور کمالات لیتا ہے، تو عجیب کائنات اللہ نے بنائی ہے۔ تو اتنی سی ڈبیہ گاجر کی شکل کی سینے کے بائیں جانب پڑی ہوئی ہے لیکن ایک بطن اس کا وہ ہے جو اوپر کی چیزیں منکشف ہے اور ایک بطن وہ ہے جو نیچے کی چیزیں منکشف۔

تو اگر انسان اوپر کے دروازے کو بند کر دے اور صرف نیچے کی چیز دیکھے نہ علم ہو، نہ کمال ہو، نہ اللہ کا اعتقاد ہو، وہاں سے علوم ہوں تو وہ اندھا ایسے ہی کام کرے گا جس کی شکایت کی جارہی ہے کہ وہ آنکھیں بھی بند کر لے، ہاتھ بھی سکوڑ لئے، کچھ بھی نہیں کر رہا۔ اور ایک وہ لوگ ہیں جو محسوسات کو بھی دیکھتے ہیں اور ساتھ میں مغیبات کے علوم بھی ان کے قلب میں ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے طفیل سے وہ ان علوم کے ذریعہ سے وہ ان ساری محسوسات کو اپنی اپنی حد پر رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اس محسوس کو کہاں استعمال کرنا چاہیے اور کہاں نہیں اور کہاں جائز ہے، کہاں ناجائز ہے۔ کہاں حرام ہے کہاں حلال۔

حلال وحرام کا مدرک بھی قلب ہے ......تو حرام وحلال کی تمیز علم غیب سے ہوتی ہے، ان محسوسات سے نہیں ہوتی، اور وہ سمجھنے والا صرف قلب ہے، آنکھ، ناک، کان یہ حق اور باطل دونوں چیزیں قبول کرتے ہیں آنکھ اگر آپ جائز چہرے پر ڈالیں جب بھی لذت لے گی اور حرام چہرے پر ڈالیں جب بھی آنکھ لذت لے گی، ہاتھ اگر آپ جائز مال پر ڈالیں اسے بھی گرفت کرلے گا اور اگر رشوت کا مال لیں تو وہ چھپے گا نہیں، ہاتھ میں اسے بھی قبضہ کر لے گا۔ اسی طرح سے کان ہے اگر آپ کسی ناجائز آواز پر گانے بجانے پر متوجہ کر دیں اس سے بھی کانوں کو لذت ہوگی

اور جائز آوازیں ہیں، تلاوت قرآن ہو رہی ہے، ذکر اللہ ہو رہا ہے۔ وہ بھی کان لے لیں گے۔

تو آنکھ حق و باطل میں امتیاز نہیں کر سکتی، ہاتھ حق و باطل میں امتیاز نہیں کر سکتا لیکن قلب وہ ہے کہ وہ امتیاز کرتا ہے حق اور باطل میں، اگر غلط چیز آئی تو کھٹکتا رہے گا قلب، جب تک کہ سچی بات سامنے نہیں آئے گی مطمئن نہیں ہوگا، ناجائز مال آئے گا قلب کے سامنے کھٹکتا رہے گا۔ چور کے دل میں کبھی اطمینان نہیں ہوگا ضمیر ملامت کرتا رہے گا کہ برا کیا، چاہے نفس مانے نہ مانے، تو قلب احساس کرتا ہے حرام کا بھی، حلال کا بھی، جائز کا بھی ناجائز کا بھی۔

لیکن یہ کس طرح سے، یہی علوم غیب کے ذریعے وہی جو اوپر سے ضمیر میں آ رہی ہے چیز، اوپر سے اس کے ذریعے سے حق اور باطل کا امتیاز ہوتا ہے۔ صورتوں اور شکلوں میں امتیاز نہیں ہوتا حق و باطل کا، تو جن لوگوں نے اوپر کا دروازہ بند کر دیا قلب کا، نہ انبیاء علیہ السلام کی بات سنی نہ علم وحی کو قبول کیا، نہ اللہ کے احکام کو لیا، ان کے سامنے صرف محسوس زندگی رہ گئی یہی اینٹ ڈلا، پتھر، خوشبو یہی چیزیں رہ گئی، اب اس پر چاہے غرور کرے وہ بھی جہالت ہوگی کیوں کہ اوپر کا علم نہیں ہے عظمت خداوندی سامنے نہیں ہے۔ اسے غلط استعمال کرے تو کر سکتے ہیں اس لیے کہ اوپر کا علم سامنے نہیں ہے جو غلط کو غلط بتاتا ہے اور صحیح کو صحیح بتاتا ہے، تو ان کی آنکھیں کھلی ہونے کے باوجود اندھی ہیں، ان کان کھلے ہونے کے باوجود بہرے ہیں کہ وہ حق اور باطل میں امتیاز نہیں کر سکتے۔

تو صورتوں کا دیکھ لینا کمال نہیں، جانور بھی دیکھتا ہے، بیل بھی دیکھتا ہے صورتیں، ان صورتوں میں یہ امتیاز کرنا کہ یہ دیکھنے کے لائق ہیں یا نہیں، یہ حلال یا حرام یہ قلب کا کام ہے مگر وہی قلب جس کے اندر ایمان کی روشنی ہو، جس میں انبیاء کی اطاعت کا جذبہ ہو، ان لوگوں نے جب وہ جذبہ کھو دیا تو ظاہر بات ہے کہ صرف محسوسات رہ گئیں اسی کے چکر میں پڑے رہے نہ عقل کام دے گی نہ علم کام دے گا۔

حقیقت علم...... مجازی طور پر آپ سائنس کو، فلسفے کو علم کہہ دیں مگر یہ علم نہیں ہے یہ حس ہے یعنی محسوسات کو دیکھنا، تجربات سے اس میں نئی نئی چیزیں پیدا کرتے رہنا۔ یہ بس دیکھنا ہے اور دست کاری..... علم کہتے ہیں مغیبات کو یعنی ایسی چیز جاننے کو کہ جو آنکھ اور کان سے نہ دیکھی جا سکے، اس چیز کا نام ہے علم۔ اور وہ علم اللہ کا ہے جو وحی کے ذریعے آتا ہے تو علم کہلانے کا مستحق وہ ہے۔ یہ حسی چیزیں ہیں حس سے تصرفات کریں گے۔ یہ احساسات سے تعلق رکھتے ہیں، اسے حس کہیں گے علم نہیں کہیں گے اور حس جانور میں بھی ہوتی ہے اور انسان میں بھی، جانور کے لاٹھی مار دو گے وہ بھی تکلیف پائے گا۔ انسان کی خصوصیت نہیں، اس کو ڈھیلا مارو، وہ بھی جذبہ میں آ جائے گا یہ عقل سے تعلق نہیں رکھتا، طبیعت سے تعلق رکھتا ہے۔ حس سے تعلق رکھتا ہے تو یہ جتنی چیزیں ہیں یہ احساسات ہیں علوم نہیں ہیں۔ علوم کا تعلق ہے مغیبات سے اور وہ جبھی آتا ہے جب قلب کے اوپر کا دروازہ کھلے اور اس دروازے میں وہاں سے علم کی آمد شروع ہو جائے۔ اس آیت کا حاصل یہ نکلا کہ انہوں نے اوپر کا دروازہ بند کر لیا ہے قلب کا، اور وہ کام نہیں لیتے جو قلب کا کام ہے کہ جائز اور ناجائز میں امتیاز کریں، صورتیں دیکھنے پر قناعت کر رہے ہیں تو پھر

کہاں سے انہیں منزل مقصود نظر آئے گی اور پھر یہ سامان بھی جتنا ہے دیکھنے کا یہ بھی ہمارا ہی تو دیا ہوا ہے، اس نے خود کہاں پیدا کیا ہے، اگر ہم روک لیں تو دیکھ بھی نہ سکے، چکھ بھی نہ سکے، تو ان طاقتوں کے بل بوتے پر ہمارے مقابلے پر آ رہا ہے جس کے خالق ہم ہیں۔ تو حماقت اور جہالت واضح فرمائی گئی۔

انسانی ذوات وصفات کی معطی ایک ہی ذات ہے...... اس کو فرمایا: قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ ۔ کہہ دیجئے اے پیغمبر! صلی اللہ علیہ وسلم کہ وہ وہی ہے اللہ جس نے تمہیں پیدا کیا، پیدا کرنے والا وہ ہے اور پیدا بھی کیا اس شان سے کہ جن قوتوں پر ناز کرتے ہو وہ اس نے رکھیں۔ سننے کی طاقت اس نے رکھی، دیکھنے کی طاقت اس نے رکھی، بوجھنے کی طاقت اس نے رکھی، دل دیا، آنکھ دی، کان دیئے مگر قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ بہت کم ہیں جو شکر گزار ہیں اللہ کے، کہ ان نعمتوں کو نعمت سمجھیں بس یوں سمجھ لیتے ہیں کہ ہماری ملکیت ہے کون ہے دینے والا؟

تو نہ شکر کا کام ہے نہ حمد کا کام ہے، تو جب حمد و شکر نہیں اس واسطے اس کا استعمال بھی صحیح نہیں، اس لیے کہ ادھر عقل لڑاتے ہی نہیں قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ یہ تو ہیں قویٰ اور فرماتے ہیں یہ جو قوتیں ہیں اب خود اپنی ذات کو دیکھ لو جس میں یہ قوتیں رکھی گئیں، وہ ذات کہاں سے آئی؟ وہ بھی تو اللہ ہی نے بنائی ہے، تم تو خود ہی نہیں بنے تو اس کو فرمایا قُلْ هُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ آپ فرما دیجئے! اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے تمہیں بکھیر دیا عجیب اعجازی شان سے کہ ایک نقش واحد کو پیدا کیا آدم علیہ السلام کو، اور اس کے ذریعے سے اربوں کھربوں انسان پوری زمین میں بکھیر دیئے تو یہ بکھیرنے والے ہم ہیں یا تم ہو؟

ہم نے ہی تو تمہاری ذات کو دنیا کے اندر بھیجا تو ذات جب ہم نے بھیجی تو ذات میں جو کرامات رکھی ہیں سننا، دیکھنا، عقل، یہ بھی تو ہم ہی رکھنے والے ہیں جو ذات کا دینے والا ہے وہ صفات کا دینے والا، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ذات تو تم بناؤ اور صفات میں ہم تمہارے تابع ہو جائیں یا ذات ہم بنائیں اور صفات تم رکھ لو جو ذات بنائے گا وہی صفات بنائے گا۔

سارے بیان کا حاصل...... تو حاصل یہ نکلا کہ اگر اللہ کی قدرت پر غور کرو تب بھی جواب موجود ہے کہ تم اس کی اطاعت کرو اور عبرت پکڑو اور اگر عقل سے غور کرو تو عقل بھی بتلاتی ہے کہ دینے والا جو ہے اس کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، اگر حس پر غور کرو تو، پرندوں کو دیکھ لو وہی ہے اوپر لے جانے والا، وہ پتھروں کو اوپر لے جا کر برسا سکتا ہے، اگر تاریخ پر غور کرو تو پچھلوں میں ایسے واقعات پیش آ چکے ہیں، لیکن جب نہ تاریخ سامنے رکھو، نہ آنکھ، کان کھول کر دیکھو، نہ عقل سے دیکھو، نہ ایمان لاؤ تو سوائے ہٹ دھرمی کے اور کیا ہے......؟

انسان کی کٹ حجتی...... اس کا حاصل یہ ہے کہ تم گویا مستعد بن رہے ہو ہمارے عذاب اٹھانے کے لیے تو ہم عذاب بھیجنے والے ہیں۔ ہم نے دنیا میں بھی عذابات دیئے ہیں قیامت کا دن بھی رکھا ہے کہ اس میں آخری طور پر

عذاب دیں گے۔اب آگے جبکہ یہ بات ہوئی تو فرمایا کہ گویا جب تم عذاب ہی چاہ رہے ہوتو اچھا تیار رہو عذاب کے لیے مگر مصیبت یہ ہے کہ انسان کی کٹ حجتی پر کہ تیار ہونے کے باوجود پھر تیار نہیں وَيَقُولُونَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ ۔ اجی صاحب! وہ عذاب کب کو آئے گا، وہ قیامت کب آئے گی؟....اب اس پر بھی یقین نہیں کہ آنے والا ہے اس لیے کہ یقین کا سبب اور اسباب تو پیدا کیے نہیں۔اس سے کام نہیں لیا تو قیامت کی دھمکی دی تو اب قیامت مانگنے کو تیار کہ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ.....

اثباتِ قیامت...... یہاں سے پھر آگے قیامت کا اثبات شروع کیا کہ آخری سزا کے لیے قیامت کا دن تیار ہے، دنیا میں جب تک گزار رہے ہو گزار لو، یہاں بھی عذاب آئے گا، اور وہاں بھی عذاب آئے گا، یہاں کے عذاب کو ممکن ہے کہ تھوڑا بہت اسباب کے ذریعے ٹال لو گو وہ ٹلے گا نہیں، لیکن قیامت کے دن تو کوئی صورت ہی نہیں ہے ٹلنے کی، وہ تو آنے والا ہے چاہے اسے مانگو تم، چاہے نہ مانگو، اس واسطے آگے قیامت کے ثبوت اور قیامت کے اثبات پر بحث فرمائی ہے۔

وَيَقُولُونَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ٥ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ٥ فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْٓئَتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقِيْلَ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ ٥ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ٥ قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ٥ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ٥

”اور کہتے ہیں کب ہوگا یہ وعدہ اگر تم سچے ہوتو کہہ! خبر تو ہے اللہ کے پاس اور میرا کام تو یہی ڈر سنا دینا ہے کھول کر پھر جب دیکھیں گے کہ وہ پاس آ لگا تو بگڑ جائیں گے منہ منکروں کے اور کہے گا یہی ہے جس کو تم مانگتے تھے تو کہہ! بھلا دیکھو تو اگر ہلاک کر دے مجھ کو اللہ اور میرے ساتھ والوں کو یا ہم پر رحم کرے پھر وہ کون ہے جو بچائے منکروں کو عذاب دردناک سے تو کہہ! وہی رحمٰن ہے، ہم نے اس کو مانا اور اسی پر بھروسہ کیا، سو، اب تم جان لو گے کون پڑا ہے صریح بہکائے میں، تو کہہ بھلا دیکھو تو اگر ہو جائے صبح کو پانی تمہارا خشک، پھر کون ہے جو لائے تمہارے پاس پانی نتھرا“۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قوم کو قیامت سے ڈرایا کہ ایک وقت آنے والا ہے کہ یہ پوری دنیا ختم ہو جائے گی اور اس کے بعد ایک نئی زندگی شروع ہوگی تو اُس زندگی کے لیے اس زندگی میں کچھ کر لیا سامان تو اگلی زندگی......راحت سے کٹے گی اور اگر نہ کیا یا برا سامان مہیا کیا تو اگلی زندگی تکلیفوں میں کٹے گی۔اور چونکہ وہ اگلی زندگی دوامی اور ابدی ہے۔اس لیے راحت کا سامان کیا تو راحت بھی دوامی ہوگی اور مصیبتوں کے سامان کر لیے تو وہ مصیبتیں بھی دوامی اور ابدی رہیں گی، جو کاٹے نہیں کٹیں گی، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کو پیش

فرمایا، تواس پر قوم نے جھٹلایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جس کی شکایت فرمائی حق تعالیٰ نے کہ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَo

یہ جو آپ لوگ قیامت سے ڈراتے ہیں، وعدہ دیتے ہیں وہ کب کو آئے گی، وہ آ کیوں نہیں جاتی قیامت؟ اگر ہوتو اسے لے آیئے جلدی سے، برسوں برس سے صدیوں سے ہزاروں برس سے وعدے دے رکھے ہیں آپ نے کہ دنیا ختم ہوگی تب وہ آئے گی تو اسے اگر آنا ہے تو وہ جلدی کیوں نہیں آجاتی تاکہ آپ کو بھی ہمیں جھٹلانے کا موقع نہ رہے۔ قیامت سامنے آجائے تو مجبور ہو کر ہم یقین کرلیں۔ یہ سوال کیا کہ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ کب آئے گی وہ قیامت؟

قیامت کے سوال کا منشاء...... اس سوال کا منشاء دو ہوسکتے ہیں اور تھے بھی دو، ایک تو یہ کہ بعضے قیامت ہی کے منکر تھے کہ کوئی زندگی اگلی آنے والی نہیں ہے...... ان کے مزاجوں میں دہریت تھی، نہ وہ اس عالم کی ابتداء کے مقر تھے نہ انتہا کے مقر تھے کہ بس یونہی چلا آرہا ہے قصہ، یونہی چلتا جائے گا ابدالآباد تک مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ

یہ زندگی ہماری، مر رہے ہیں، جی رہے ہیں یونہی دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ یونہی دیکھتے ہوئے چلے جائیں گے تو زمانہ ہمیں زندگیاں دے رہا ہے زمانہ ہی آتا ہے، وقت گزرتا ہے موت آجاتی ہے، یہی سلسلہ چلتا رہے گا۔ نہ قیامت ہے نہ کوئی ابتداء ہے اس عالم کی، تو کچھ دہریہ مزاج تھے کہ جو شروع ہی سے منکر تھے قیامت کے۔

منکرین قیامت...... جیسا کہ فلاسفۂ یونان، وہ بھی منکر ہیں قیامت کے، وہ عالم کو قدیم مانتے ہیں کہ ہمیشہ سے ہے دنیا اور ہمیشہ اسی طرح چلی جائے گی، نہ کوئی ابتداء ہے اس عالم کی، نہ کوئی انتہا ہے اس عالم کی۔

فلاسفۂ ہند یہ بھی اسی کے قائل ہیں کہ ابتداء بھی نہیں ہے اور انتہاء بھی نہیں ہے اور اگر ہے بھی انتہاء تو وہ انتہائیں بھی ہزاروں آئیں گی۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ اتنے ارب اتنے کھرب اتنے کروڑ اتنے لاکھ برس تک یہ قائم رہتی ہے دنیا اور پھر پرلو آجاتی ہے۔ قیامت آجاتی ہے، عالم مٹ جاتا ہے اور پل بھر میں پھر از سر نو بننا شروع ہوجاتا ہے۔ اور چار جیسی یعنی جو سب سے اول پیدا ہوتے ہیں تبت کے پہاڑ وہ ہیں، ان پر ریت اترتا ہے۔ پھر دنیا چلتی ہے اور چار ارب اور چار کھرب اور چار کروڑ برس تک پھر چلتی رہے گی۔ پھر پرلو آئے گی اور پھر از سر نو، تو ارواح ان کے یہاں گنتی کی متعین ہیں وہی لوٹ پھیر کر آئے جاتی ہیں۔ وہ مختلف جون بدلتی رہتی ہیں تو ابتداء وانتہاء کے یہ بھی قائل نہیں اور فلاسفۂ یونان بھی قائل نہیں یعنی جتنے بھی بندگانِ عقل ہیں وہ قائل نہیں ہیں قیامت کے۔ ان کا خدا ان کی عقل ہے، ان کے نظریات ان کے عقائد ہیں۔ اس واسطے ان کے عقائد میں یہ چیز آئی نہیں کہ اس عالم کی ابتداء ہے، تو وہ در حقیقت خدا کے وجود کے بھی منکر ہیں اور کائنات کی انتہاء کے بھی منکر ہیں تو ایک نمونہ عرب میں موجود تھا جو قیامت کے منکر تھے، تو ایک منشاء تو ان کے سوال کا استہزا اور مسخرہ پن ہے کہ جو چیز آنے

والی نہیں ہے آپ خواہ مخواہ اس سے ڈرا رہے ہیں، نہ قیامت آوے، نہ عالم ختم۔

بعض قائل تھے قیامت کے مگر اس کے مقصد سے واقف نہیں تھے کہ حقیقت کیا ہے قیامت کی۔ اس کی جہالت کی وجہ سے یہ سوال پیدا ہوا تمسخر آمیز کہ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ کب کو آئے گی وہ قیامت۔ تو قیامت کی حقیقت پیش نظر نہیں یعنی یہ پیش نظر نہیں تھا کہ ایک زندگی ختم ہو کر اس کے ثمرات اگلی زندگی میں نکلیں اور اس کے لیے لازمی ہے کہ ایک عالم ختم کیا جائے اور دوسرے عالم کی بنیاد ڈالی جائے۔ تاکہ مجموعۂ بنی آدم کی نتائج دیکھنے کا موقعہ ملے اچھے اور برے۔ یہ ہو نہیں سکتا جب تک کہ ایک جہان بدل کر دوسرے جہان نہ لایا جائے، تو بعضے اس حقیقت کے منکر تھے تو قیامت کے قائل تھے مگر حقیقت سے لاعلم تھے اس واسطے یہ سوال کیا کہ کب کو آئے گی وہ قیامت؟

تعددِ قیامت..... لیکن حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا انکار ہو یا قیامت کے مقصد کا انکار ہو، یہ اپنی بھی تکذیب ہے، اور مشاہدات کی بھی تکذیب ہے، خود اپنے دیکھے کو جھٹلانا ہے اس واسطے کہ قیامت ایک ہی نہیں ہے بلکہ کئی ہیں قیامتیں، ایک قیامت شخصی ہے اور ایک قیامت قرنی ہے، اور ایک قیامت کلی ہے۔ شخصی قیامت ہر شخص کی موت ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ جو مر گیا اس کی قیامت قائم ہو گئی۔ تو یہ شخصی قیامت ہے کہ ہر شخص کے اوپر آرہی ہے یعنی ایک زندگی ختم ہوتی ہے اگلی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ تو شخصی زندگی ہے، شخصی موت ہے اور شخصی قیامت بھی۔

دوسری قیامت ہے قرنی، یعنی ایک نسل کا اختتام جس کا اندازہ تخمینہ سو برس ہے، سو برس کے اندر اندر ایک نسل ختم ہو جاتی ہے اور دوسری نسل کا آغاز ہوتا ہے یہ الگ بات ہے کہ کسی فرد کی عمر اتفاق سے بہت بڑھ جاتی ہے۔ سو دو سو برس ہو جائے تو ایک فرد کا نام زمانہ نہیں ہوتا، زمانہ کہتے ہیں اکثریت کو کہ ایک نسل کی نسل آجائے اور نسل کی نسل ختم ہو جائے، ایک آدھ فرد رہ جائے تو اس سے نسل پر کوئی اثر نہیں پڑتا تو ایک صدی گویا رکھی گئی ہے ایک نسل کے لیے تخمینی طور پر۔ اسی واسطے حدیث میں تجدید کا جو وعدہ فرمایا گیا ہے کہ دین کو تازہ بہ تازہ کیا جائے گا۔ تو ہر صدی کے اوپر مجدد کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس امت میں تو نبی نہیں آئے گا۔ اس امت میں یہ نبوت آخری ہے لیکن مجددین آئیں گے ہر سو برس کے بعد اللہ تعالیٰ مجدد پیدا کریں گے کہ لوگ اپنی خود رائیوں سے دین میں جو خلط ملط کریں گے، کچھ بدعات ملا دیں گے، کچھ منکرات، مجدد آکر پھر دودھ کا دودھ، پانی کا پانی الگ کر دے گا اور پھر از سر نو دین تازہ بہ تازہ ہو جائے گا..... اس لیے وعدہ دیا گیا ہے کہ ایک طبقہ ہمیشہ اس امت میں حق پر رہے گا کبھی حق منقطع نہیں ہو گا اس سے وہی ایک بیج کی مانند ہو گا اس میں سے کونپلیں پھوٹیں گی اور نئی شاخیں پھر ابھر آئیں گی اور مجددین آکر دین کی تجدید کریں گے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَّنْ يُّجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا ۔ ①

① السنن لابی داؤد، کتاب الملاحم، باب ما یذکر فی قرن المائة ج: ۱۱ ص: ۳۶۲.

اللہ تعالیٰ تازہ بہ تازہ کرے گا اس دین کو ہر صدی پر، ہر صدی پر مجدد آئیں گے ...تو ہر سو برس کے بعد مجدد کا وعدہ اس لیے کیا گیا ہے کہ سو ہی برس ہوتے ہیں ایک نسل کے جب نئی نسل آتی ہے تو کچھ نظریات بھی نئے ہوتے ہیں کچھ خیالات نئے ہوتے ہیں، زمانے میں کچھ ترقی ہوتی ہے، ان ترقیات سے نئے نئے سوالات پیدا ہوتے ہیں تو لوگوں میں اشتباہ پیدا ہوتا ہے دین کے (بارے میں) مجدد آکر اس قرن کی ضروریات کو سامنے رکھ کر دین کی جب تجدید کرتا ہے تو پھر دین قلوب میں تازہ بہ تازہ ہو جاتا ہے کیوں کہ ایک نسل کے آغاز اور ایک نسل کے اختتام کا عمومی طور پر اندازہ سو برس ہے اسی لیے سو برس پر مجدد کا وعدہ کیا گیا ہے اس کا حاصل نکلا کہ ہر سو سال بعد ایک قیامت قائم ہوتی ہے۔ یعنی ایک نسل ختم ہو کر دوسری نسل کے لیے جگہ چھوڑتی ہے، اسے قیامت قرنی کہتے ہیں۔

اور ایک تیسری قیامت ہے جو قیامت کلی ہے کہ پورے عالم پر موت طاری ہو جائے آسمان سے لے کر زمین، پہاڑ دریا حتیٰ کہ ملائکہ علیہم السلام ارواح مقدسہ کوئی چیز باقی نہ رہے اور احدیتِ مطلقہ کا ظہور ہو، صرف ایک اللہ کی ذات قائم رہے۔ تو جیسے اس کا نام واحد ہے کہ وہ ایک ہے ایسے ہی اس کا نام احد بھی ہے کہ وہ یکتا ہے اور بے مثل اور بے مثال، تو یکتائی کا ظہور نہیں ہو سکتا جب تک ہر چیز مٹ کر تنہا ذات واحد نہ رہ جائے۔

یہ عالم اللہ نے بنایا ہے اپنی صفات کے اظہار کے لیے تو تمام صفات ظاہر ہوں گی رحمانیت بھی ظاہر ہو رہی ہے غفوریت بھی ظاہر ہو رہی ہے، رزاقیت بھی ظاہر ہے۔

احدیت کا ایسا ظہور ہو کہ کوئی نہ ہو اور وہ ہو۔ یہ جب ہی ہوگا جب پورے عالم کا نظام ختم کر دیا جائے اور اس کے بعد پھر ایک نیا نظام لایا جائے۔ تو احد کی صفت کے ظہور کے لیے قیامت قائم کی گئی ہے۔

جس عالم کے اجزاء قیامت کے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اس کے مجموعہ میں بھی یہ صلاحیت ہوگی ......تو ایک قیامت شخصی ہوئی۔ ایک قرنی ہوئی، ایک قیامت کلی ہوئی، دو قیامتیں وہ ہیں جو ہر شخص انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، ہر انسان جب مرتا ہے اس کی قیامت قائم ہوئی۔ یہ ہر ایک کی نگاہوں کے سامنے ہے، تو جس عالم کے اجزاء پر قیامتیں آ رہی ہیں کیسے ممکن ہے کہ اس کے کل پر قیامت نہ آئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں فنا کے قبول کرنے کی صلاحیت ہے جبھی تو ہر ہر جزء اس کا موت کی طرف جاتا ہے، اگر اس عالم میں صلاحیت نہ ہوتی موت کے قبول کرنے کی تو ایک فرد بھی اس کا نہ مرتا۔ ایک جز میں بھی تغیر نہ ہوتا۔ سارے اجزاء علیٰ حالہ باقی رہتے لیکن جب ایک جز موت کی طرف جاتا ہے تو مجموعہ بھی یقیناً موت کی طرف جائے گا۔ ان اجزاء کے مجموعہ ہی کا نام تو عالم ہے۔ اب انفرادی طور پر یہ اجزاء جتنے ہیں ایک وقت آئے گا کہ مجموعہ مل کر مٹ جائے گا، پورے عالم پر موت طاری ہو جائے گی تو جس کے ایک جز میں یہ خاصیت ہے وہ کل کے اندر بھی ہوگی ورنہ اجزاء میں وہ بات پیدا نہ ہوتی اجزاء میں خاصیت نہ آتی۔ تو موت شخصی قیامت شخصی ہر فرد پر ہم ہر روز دیکھتے ہیں۔

انکار قیامت، انکار مشاہدہ ہے ......انسان ہی نہیں جانور بھی مرتے ہیں اور جانور ہی نہیں تمام اجزاء مرتے

ہیں، ایک پتھر رکھا صحیح سالم وہ ٹوٹ گیا، اس کی ہیئت کذائی مٹ گئی، درخت ہیں ان پر موت طاری ہوتی ہے۔ بعضے درخت کی عمر سال بھر ہے۔ جیسے پپیتہ سال بھر میں اگا، اس کے بعد نئی شاخ پھوٹ آئی۔ یا کیلا ہے سال بھر رہا ہے اس کے بعد مٹ گیا بعضے درختوں کی عمر زیادہ ہوتی ہے۔ بعضوں کی سو سو برس ہوتی ہے۔ تو جس طرح سے یہ بنی آدم میں عمریں مختلف ہیں نباتات میں بھی مختلف ہیں۔ تو نباتات بھی مرتے ہیں، جمادات بھی مرتے ہیں حیوانات بھی مرتے ہیں انسان بھی مرتے ہیں، تو جب اس عالم کے سارے اجزاء موت کو قبول کرتے ہیں تو عقل بتلاتی ہے کہ مجموعہ بھی قبول کرے گا اور اس کے اندر موت آنے کی صلاحیت موجود ہے۔ تو جو لوگ روزانہ دیکھتے ہیں قیامت کو آتے ہوئے وہ کیسے انکار کر سکتے ہیں مجموعۂ قیامت کا یہ تو اپنے مشاہدہ کو جھٹلانا ہے۔

تو قیامت کا انکار کرنا خود اپنی تکذیب کرنا ہے اپنا انکار کرنا ہے۔ ورنہ جو منکر ہیں قیامت کے انہیں چاہیے کہ وہ مرا نہ کریں اور ملک الموت کا مقابلہ کریں اور کہہ دیں کہ ہم میں موت آنے کی صلاحیت نہیں ہے، ہم میں تو ابدالآباد تک رہنے کی صلاحیت ہے لہٰذا ہم مرنا نہیں چاہتے۔ اگر وہ اس پر قادر ہوتے تو عالم کے بارے میں بھی دعویٰ کر سکتے تھے کہ اس عالم پر بھی موت نہیں آئے گی، جب اس کے اجزاء پر بھی نہیں آتی تو کل پر بھی نہیں آئے گی لیکن جب آتی ہے اجزاء پر کل پر آنا ممکن ہے اس واسطے یہ اپنے مشاہدے کی تکذیب ہے۔

شخصی قیامت کے تعین نہ ہونے کے باوجود اگلے سامان کرتے ہو تو عالمی قیامت کے تعین نہ ہونے پر بھی اگلے سامان کرنا چاہیے

...... اب دوسری چیز یہ ہے کہ قیامت کا مقصد پیش نظر نہیں ان کے جس سے وہ انکار کرتے ہیں .... قیامت کا مقصد یہ ہے کہ پہلی زندگی میں کچھ سامان کیا جائے تاکہ اگلی زندگی میں وہ کارآمد ثابت ہو، اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اس موت کا علم بھی ہو، یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ زندگی ختم ہوگی تو آدمی اگلی زندگی کا سامان کرے گا۔

مثلاً ایک شخص مرتا ہے تو کیا وہ اپنی زندگی میں اس کی فکر نہیں کرتا کہ میں اپنی اولاد کے لیے کچھ کر جاؤں تاکہ کل کو آنے والے مجھے برا بھلا نہ کہیں، اس واسطے آدمی جائیداد خریدتا ہے، تجارتیں قائم کرتا ہے، کمپنیاں بناتا ہے کہ میں ہی نہیں میری اولاد کے کام آئے یہ، اس کو یقین ہے کہ میں اس عالم سے گزر جاؤں گا تو میری نسل مصیبت میں نہ پڑے۔ احادیث میں بھی ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: ”تم بجائے اس کے کہ مرتے وقت اولاد کے ہاتھ میں بھیک کا ڈھوگھا دے جاؤ، یہ بہتر ہے کہ ایسا سامان کر جاؤ کہ تمہاری اولاد خوشحالی کی زندگی بسر کرے“

یعنی تنہا اپنی فکر نہ کرو بلکہ اپنی اولاد کی بھی کرو، تو اولاد کی فکر آدمی اسی زندگی میں تو کرتا ہے اور کرتا ہے اگلی زندگی کے لیے کہ جب میں نہ ہوں جب بھی، تو کیا وہ یہ پوچھا کرتا ہے کہ صاحب! پہلے یہ بتلا دو کہ کون سے دن، کون سی تاریخ میری موت آئے گی، جب میں اولاد کے لیے سامان کروں وہاں مطلقاً اتنا کافی ہے کہ موت کا علم ہو کہ آئے گی ضرور کب آئے گی؟ کون سی تاریخ؟....

یہ ضروری نہیں جبکہ تم اپنی شخصی زندگی کو جانتے ہو کہ ایک زندگی میرے بعد آئے گی، مجھے نیک نامی کا سامان کرنا چاہیے اور اس کے لیے یہ لازم نہیں ہے کہ موت کے وقت کا علم ہو تو مجموعۂ عالم کی موت میں کیوں سوال کرتے ہو کہ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ یہ کون سی تاریخ کو آئے گی قیامت؟؟ بھئی جیسے تمہیں شخصی قیامت کے وقت کا علم نہیں ہے۔اسی طرح اگر مجموعۂ قیامت کا بھی علم نہ ہو دن تاریخ کا تو اس میں کیا نقصان بیٹھتا ہے؟ وہاں بھی بلا تاریخ کے علم کے اگلے سامان کرتے ہو، یہاں بھی تم اس زندگی کے بعد اگلی زندگی کا سامان قیامت کے دن کے لیے کرو، وہاں تاریخ نہیں پوچھتے یہاں کیوں پوچھتے ہو؟

وہاں کیوں نہیں کہتے کہ صاحب! موت کب آئے گی، پہلے مجھے یہ علم ہو کہ جنوری کی فلاں تاریخ میں میرا انتقال ہوگا جب تو میں اپنی اولاد کے لیے کچھ آئندہ کا سامان کروں اور اگر یہ علم نہ ہو تو مرنے دو، اولاد کو بھی جانے دو، جب وہاں سوال نہیں کرتے یہاں بھی سوال نہیں کرنا چاہیے۔اسی طرح سے قرنی قیامت قائم ہوتی ہے، ایک نسل ختم ہوتی ہے دوسری نسل آتی ہے یہ نسل بھی تو سامان کرتی ہے کہ ہماری اگلی نسلیں ٹھیک رہیں، اگر کسی نسل میں حکومت ہے تو وہ اپنے دم بھر سعی کرے گی کہ میرے خاندان میں باقی رہے یہ حکومت میری قوم میں باقی رہے، دوسری قوم اس پر غالب نہ آئے تو کیا وہ یہ پوچھا کرتی ہے کہ ایک صدی کی کون سی تاریخ، کون سے منٹ پر ہماری قوم ختم ہوگی جب تو ہم سامان کریں اگلی نسل کے لیے اور جب معلوم نہ ہو تاریخ تو نہ کریں، کوئی اس کی فکر نہیں کرتا، اسے اتنا معلوم ہے کہ سو برسوں میں اندازاً ایک نسل گزر جائے گی اسے اگلی نسل کی فکر کرنی چاہیے، وہاں وہ کبھی نہیں پوچھتے کہ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ . یہ کب کو آئے گی، کون سی تاریخ ہوگی؟ جب وہاں بلا تاریخ کے علم کے اگلی نسلوں کا بندوبست کرتے ہو تو یہاں بلا علم تاریخ کے کیوں نہیں کرتے قیامت کا بندوبست؟ قیامت کے بعد کی زندگی کی کیوں نہیں فکر کرتے، معلوم ہوا کہ سوال تمہارا مہمل ہے، محض ٹال مٹول کے لیے یہ سوال کر رہے ہو، کوئی معقول سوال نہیں ہے، اگر معقول ہوتا تو شخصی موت میں یہ بھی سوال کرتے اور قرنی موت میں بھی یہ سوال کرتے لیکن وہاں نہیں کرتے۔اسے غیر معقول جانتے ہو تو کلی قیامت میں اس سوال کو کیوں تم نے معقول سمجھا؟ یہاں بھی غیر معقول۔

مقصد قیامت..... تو اصل میں قیامت کے مقصد کا علم نہیں ہے، مقصد یہ ہے کہ اس زندگی میں کچھ کر جاؤ تا کہ اگلی زندگی میں کام آئے یہ ایک مقصد ہے۔یہ شخصی قیامت میں بھی ہے قرنی قیامت میں بھی ہے۔کلی قیامت میں بھی ہے تو یا تو اس کا علم نہیں یا جان بوجھ کر اپنے کو جاہل بنا رکھا ہے۔ٹال مٹول کر کے دعوے کو رد کرنا ہے۔اس واسطے سوالات کرتے ہو، تو حاصل یہ نکلا کہ قیامت کا آنا یہ آنکھوں دیکھی چیز ہے۔روزانہ قیامتیں آنکھوں سے دیکھتے ہیں جب مشاہدہ ہے تو پھر انکار کرنا اس کا، جھٹلانا ہے اپنے مشاہدے کو وہ اپنی تکذیب ہے، وہ خدا کی تکذیب نہیں، اللہ کا وعدہ اپنی جگہ سچا ہے وہ اس درجہ کا ہے ہی نہیں کہ کوئی جھٹلا سکے۔اسے جھٹلانے والا اپنے کو جھٹلا رہا ہے۔ جیسے ایک موقعہ پر فرمایا کہ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ . یہ جو اللہ کو جھٹلا رہے ہیں درحقیقت

اپنے نفسوں کو جھٹلا رہے ہیں اپنے کو دھوکے میں ڈال رہے، تو مشاہدہ کا انکار وہ خود اپنا انکار ہے جب آنکھوں سے دیکھتے ہو کہ قیامتیں روزانہ ہیں۔ تو پھر قیامت کا انکار وہ اپنے مشاہدے کی تکذیب ہے اور اپنی آنکھوں دیکھی بات کو جھٹلانا یہ اپنے کو جھٹلانا ہے خدا کو جھٹلانا نہیں، وہ بری ہے اس سے کہ کوئی جھٹلائے اس کو، یہ تو مشاہدہ ہے۔

قیام قیامت کا عقلی ثبوت ...... اور جہاں تک عقل کا تعلق ہے تو عقل بھی اس کی مؤید ہے کہ قیامت آنی ہے، عقل خود شاہد ہے اس واسطے کہ یہ ایک عقلی قاعدہ ہے کہ جو چیز مخلوط ہوتی ہے چند اجزاء سے جب تک کہ اسے توڑ کر اجزاء الگ الگ نہ نکالے جائیں وہ نفع نہیں دیتی، جب تک کہ الگ الگ چیزوں کو نفع پہنچاتے ہیں تو مجموعہ کو توڑ پھوڑ کر جب تک اجزاء الگ الگ نہیں کر دیئے جائیں گے وہ نفع بخش ثابت نہیں ہوں گے۔

اس کی مثال کھیتی ہے۔ ایک کسان نے کھیتی بوئی جو، اور چھ مہینے اپنا خون پسینہ ایک کر دیا، چھ مہینے کے بعد کھیتی لہلہا اٹھی، آنکھیں بھی اس کو دیکھ کر مسرور ہو رہی ہیں اور کاشتکار کا دل بھی خوش ہے کہ اب میرے لیے موقع آ گیا ہے۔ میرا گھر بھرے گا، بہت خوش، لیکن جب کھیتی پک گئی اور دانے پختہ ہو گئے تو وہی کسان جس نے خون پسینہ ایک کر کے اس کھیتی کو پروان چڑھایا تھا۔ درانتی لے کر خود ہی اسے کاٹنا شروع کر دیا اور ساری کھیتی کو اجاڑ کے رکھ دیا۔ کاٹ ڈالا پھر اسی پر بس نہیں کہ کھیتی کو کاٹ کر کھلیان میں جمع کیا اور اس کے بعد بیل چلا کے اسے چکنا چور کرنا شروع کیا، ریزہ ریزہ کر دیا ...... پھر اسی پر بس نہیں کرتے کسان کہ بھئی کاٹا تھا کاٹنے کے بعد خود اپنے پیروں سے نہیں بلکہ بیلوں کے پیروں سے روندوایا، اس کے بعد تھال میں لے کر اڑاکے ہیں جو ساری بکھر کر الگ الگ ہو جائے ...... اگر کوئی کاشتکار سے یوں کہے کہ بے وقوف! چھ مہینے کی خون پسینہ کی کمائی تیری، تو نے ہی تو اسے آباد کیا تھا، پروان چڑھایا تھا، اور بے وقوف اپنے ہی ہاتھ سے اس کو اجاڑ دیا، یہ تو نے بڑی غلطی کی، غیر معقول بات کی، اپنی پروان چڑھائی ہوئی کھیتی کو کاٹ ڈالا اور ریزہ ریزہ چکنا چور کر دیا، تو وہ یہ کہے گا کہ بے وقوف تم ہو سوال کرنے والے، میں نے عقل مندی کا کام کیا اس لیے کہ میری کھیتی میں بھوسہ اور جو مخلوط تھے۔ بھوسہ غذا ہے بیلوں کی اور جو غذا ہے انسانوں کی، جب تک میں کاٹ کر اسے چکنا چور نہ کروں بھوسہ الگ نہیں ہو سکتا تھا دانے سے، جب میں نے الگ کر دیا تو بھوسہ تو گیا جانوروں کے پیٹ میں اور دانہ گیا انسانوں کے پیٹ میں اپنے اپنے ٹھکانے پر ہر چیز پہنچ گئی۔ مجموعی کھیتی اگر نہ توڑی جاتی، نہ چکنا چور کی جاتی تو ہر ایک کو اپنی اپنی غذا نہیں مل سکتی تھی۔ یہ جواب معقول ہوگا اس کا اور سوال نامعقول ہوگا۔

فرماتے ہیں "اَلدُّنْیَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ" ① یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے، اس میں کفر اور اسلام، حق اور باطل، سچ اور جھوٹ سب رلا ملا چل رہا ہے دونوں چیزیں الگ الگ ہیں ایک دوسرے کے منافی ہیں مگر یہاں رلی ملی چل رہی ہیں ایک حقانی دلائل پیش کرتا ہے، ایک باطل پسند کچھ ملمع سازی کر کے حق کو رلا کر باطل میں ملا کر پیش کرتا ہے،

---

① حدیث کی تخریج گذر چکی ہے۔

وہ اپنے باطل کو حق ثابت کر رہا ہے بہت لوگ جو زیرک ہیں دانش مند ہیں وہ تو اصلیت کا پتہ چلا لیتے ہیں۔ مگر ہزاروں بہک بھی جاتے ہیں اور پھر دلائل کو ایسی ملمع سازی سے پیش کریں گے لوگ کہ اہل حق تو بے چارے بیٹھے رہ جائیں گے اور باطل کو فروغ ہو جائے گا تو دنیا میں حق اور باطل، سچ اور جھوٹ، اخلاص اور نفاق، کفر اور اسلام سب خلط ملط چل رہا ہے اور ہر ایک مدعی ہے کہ میں حق پر ہوں، الگ نہیں ہے کہ دودھ الگ ہو، پانی الگ ہو، عقل لڑا کر غور کرو تو الگ ہوتا ہے ورنہ دیکھنے میں بالکل یکساں ہیں، ہیرا بھی یکساں ہے اور کنچ کا ٹکڑا بھی یکساں ہے۔ اب جوہری تو کم ہوتے ہیں جو ہیرے کو الگ کر دیں اور کنچ کے ٹکڑوں کو الگ سارے تو جوہری نہیں وہ کہیں گے بھئی یہ جو نقلی ہے، یہ بھی وہی ہے اصلی ہے وہ بھی ہمیں تو کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ تو دنیا میں دونوں چیزیں چل رہی ہیں خلط ملط، حق تعالیٰ نے اس دنیا کی کھیتی کو پروان چڑھایا، ہزاروں ہزار برس سے اس کو پانی دیا، سینچا لہلہا اٹھی اور قیامت کے دن اپنے ہی ہاتھوں سے سب کچھ چکنا چور کر کے تباہ و برباد کر دیں گے، آسمان نیچے گر پڑے گا، چاند سورج کے ٹکڑے، زمین کے ٹکڑے، پانی، یہ مٹی سب گڈ مڈ ہو کر خلط ملط ہو جائے گا۔

اگر کوئی حق تعالیٰ سے سوال کرے کہ آپ ہی نے تو اس کھیتی کو پروان چڑھایا تھا، ہزار ہا ہزار برس آپ کی قدرت نے اسے سینچا اور بنایا اور اپنے ہی ہاتھوں اجاڑ دیا، فرمائیں گے اس میں کفر اور اسلام، حق و باطل ملا ہوا تھا، اس میں حق اور حقانی لوگ یہ غذا ہیں جنت کی اور کفر اور کفر والے لوگ یہ غذا ہیں جہنم کی، جب تک اس کھیتی کو کاٹ کر اجزاء الگ الگ نہ کئے جائیں تو جنت کی غذا الگ نہیں ہو سکتی تھی، جہنم کی غذا الگ نہیں ہو سکتی تھی، تو میں نے اسے پروان چڑھایا تا کہ پک جائے، پکنے کے بعد اب غذا دینی ہے۔ جنت اپنی غذا مانگ رہی ہے۔

تو اسلام اور صاحب اسلام اس کو دیئے جائیں گے۔ اور کفر اور صاحب کفر جہنم کو دیئے جائیں گے، کھیتی اگر یونہی برقرار رہتی تو جنت بھی خالی رہتی، جہنم بھی خالی رہتی، حالانکہ اس عالم کو بھی بھرنا ہے، تو آج جنت خالی ہے، جہنم بھی خالی ہے، مگر دونوں مانگ رہے ہیں کہ میری غذا دیجئے، جنت بھی رات دن سوال کر رہی ہے کہ مجھے بھیجئے لوگ اور وعدہ ہے اللہ کا کہ ہم بھر دیں گے .... اور جہنم بھی پکار رہی ہے کہ مجھے بھر دیجئے اور اللہ کا وعدہ ہے کہ ہاں بھر دیں گے، لیکن ذرا بھوک کو کامل ہونے دو، ایک وقت گزر جائے، جب تکمیل کو پہنچ جائے گی بھوک تب غذا دیں گے تا کہ تمہارے اندر سرور پیدا ہو، بلا بھوک کے اگر کھا لیا تو وہ ہضم نہیں ہوگا اور اس کے لطف بھی محسوس نہیں ہوں گے، جب معدہ پوری طرح کامل بن جائے اس وقت غذا دی جائے تو فرحت، سرور اور قوت کا باعث ہوتا ہے اور اگر اشتہاء صادق نہ ہو اشتہاء کاذب ہو، مانگتا رہے معدہ اور بھرتے رہیں گے تو بیماریاں پیدا ہوتی رہیں گی۔ تو کامل بھوک کے وقت جو چیز دی جاتی ہے وہ پچتی بھی ہے کھپتی بھی ہے اور مسرت کا باعث ہوتی ہے اس کے لیے ہم نے ایک وقت رکھا ہے اس وقت اس کھیتی کو کاٹ کر چکنا چور کر کے دانہ الگ نکال دیں گے، بھوسہ الگ نکال دیں گے بھوسہ جائے گا جہنم میں دانہ جائے گا جنت میں اس جہان میں دانہ ہے حق اور اہل حق اور بھوسہ ہے کفر اور اہل کفر،

وہ جہنم کی غذا ہیں یہ جنت کی غذا ہیں تو جس طرح سے ایک کاشتکار اپنی کھیتی کو ہر چھٹے مہینے پامال کرتا ہے تا کہ الگ الگ غذا کرے حق تعالیٰ شانہٗ اس پورے عالم کی کھیتی کو ایک دن چکنا چور کر کے اجزاء الگ الگ کر دیں گے تو ظاہر بات ہے کہ قیامت کا ماننا گویا عقلاً ضروری ہے۔ عقل خود کہتی ہے کہ ایک عالم آنا چاہیے کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ الگ ہو کر نکھر جائے، اسی کا نام قیامت ہے۔

قیامت ایک نئے عالم کی تعمیر کا نام ہے ...... تو قیامت حقیقت میں تخریب کا نام نہیں ہے کہ عالم کو اجاڑ دو، تعمیر کا نام ہے بس اتنا ہے کہ اگر کسی پرانے مکان کی جگہ آپ نیا مکان بنائیں تو قاعدہ ہے کہ اسے ڈھا کر جو اچھے اجزاء ہیں وہ لے لیتے ہیں، بقیہ پھینک دیتے ہیں اور نئی تعمیر کرتے ہیں، کوٹھی دار پرانے اجزاء پھینک دیتے ہیں اور کارآمد ملبہ مٹیریل لے کر نئی تعمیر بناتے ہیں تو قیامت درحقیقت ایک نئے عالم کی تعمیر کا نام ہے مگر وہ بن نہیں سکتا جب تک کہ اس پرانے عالم کو ڈھانہ دیا جائے اور ڈھانے کے بعد جو مٹیریل عمدہ اور مضبوط ہے وہ تو ادھر لے لیں گے اور جو خراب خستہ ہے اسے پرے پھینک دیں گے۔ اس طرح سے ایک نئے عالم کی تعمیر ہوگی تو قیامت درحقیقت تعمیر کا نام ہے۔ تخریب کا نام نہیں ہے مگر تعمیر ہوتی نہیں جب تک تخریب نہ کی جائے، جب تک ڈھانہ دیا جائے بوسیدہ عمارتوں کو اس وقت تک جگہ خالی نہیں ہوتی اور نیا عالم نہیں بنتا تو اب جب قیامت کا مقصد واضح ہو گیا کہ پرانی چیزوں کو ختم کر کے نئے عالم کی تعمیر ہو اور اس پرانے میں بھی دودھ الگ کر دیا جائے، دانہ الگ۔ بھوسہ الگ اس کے لیے لازمی ہے کہ اس کی تخریب کر کے چکنا چور کر و پھر نئے عالم کو بساؤ، یہ ایک ایسی معقول چیز ہے کہ دنیا میں اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا اور جب یہ معقول ہے تو قیامت کا آنا کیوں غیر معقول اور جب وہ غیر معقول نہیں ہے تو یہ سوال کیسا کہ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۔ صاحب وہ کب کو آئے گی قیامت......؟

نادانی کا سوال ...... یہ تو ایسا ہی ہے جیسے ایک کاشتکار نے بیج بویا اور کونپلیں نکل آئیں اور اس نے کہا کہ مجھے توقع یہ ہے کہ اس کھیتی میں دانہ لگے گا اور ہزاروں روپے ہوں گے دوسرا جھٹلا دے دیتا ہے کہ دانہ نکال کیوں نہیں دیتا یعنی آج تو کھیتی بوئی ہے اور کل کو وہ کہے کہ بھئی لے آنا وہ دانا کہاں ہے؟ اگر نہیں لاتا تو یہ جھوٹ موٹ باتیں کر رہا ہے تو کاشتکار کہے گا یہ احمق ہے۔ نہ اسے کھیتی کی خبر، نہ اسے یہ پتہ کہ کتنے دنوں میں اگتی ہے؟

نہ یہ پتہ کیا کہ کیا انداز ہے کھیتی کا ؟

بس اس نے تو دانہ کا نام سن کر آج ہی مانگنا شروع کر دیا کہ اگر تو سچا ہے تو لے دانہ حالانکہ آج ہی تو کونپل نکلی ہے اور کونپل بھی نکلے گی، چار مہینے میں ذرا بڑا ہوگا، اور کوئی یوں کہے گا کہ لاؤ نا بھئی وہ کہاں ہے دانہ؟ تو کہے گا احمق ذرا ٹھہر جا تھوڑے دن یہ تو طبعی رفتار ہے چھ مہینے میں دانہ پختہ ہوتا ہے اس سے پہلے نہیں ہوتا تو جو اس چھ مہینے کو نہ مانے اور دو ہی مہینے بعد مطالبہ کرنے لگے کہ اگر تو سچا ہے تو دکھلا وہ دانہ۔

وہی کفار کی مثال ہے کہ قیامت اپنے وقت پر آئے گی، انہوں نے جھٹلا کے کہا کہ صاحب آنی ہے تو آج ہی

کیوں نہیں آجاتی تو معلوم ہوا کہ یہ سوال بالکل غیر معقول ہے اور جہالت پر مبنی ہے۔ معقول پسندی پر مبنی نہیں ہے صرف ڈھینگا ڈھانگی ہے ہٹ دھرمی ہے کہ ماننا ہی نہیں ہے پیغمبر کی بات، صرف ادھر ادھر کے سوالات میں الجھا دو، لیکن اللہ کے معاملات میں الجھاوا چلتا نہیں فوراً دودھ الگ ہوجاتا ہے پانی الگ۔

اس لیے کہ دین فطرت کا دین ہے اس کی تمام منقول چیزیں معقول بھی ہیں، جب عقل اور نقل سے ثابت ہو تو دوسرا مجبور ہو کر چپ ہوگا اور نا معقول ہی اس کا قائل ہوگا، تو قرآن کریم میں پہلے تو ان کا سوال نقل کیا **وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ** . کہتے ہیں کہنے والے کہ صاحب وہ کب کو آئے گی قیامت؟ **اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ** اگر تم سچے ہو تو بتلا دو نا کب کو آئے گی کوئی تاریخ بتلا دو یا آج ہی لے آؤ اس قیامت کو، حق تعالیٰ نے ان کو دفع کرنے کے لیے جواب دیا کہ **قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ** . اے پیغمبر فرما دیجئے بھئی مجھے کچھ خبر نہیں کب آئے گی، میں تو اتنا جانتا ہوں کہ آئے گی، کب آئے گی، کون سی تاریخ میں آئے گی تو یہ علم اللہ کو ہے، یہ مجھے علم نہیں۔

کلی قیامت کا علم نہ دینا ہی قرین مصلحت ہے...... اور اس کی ضرورت بھی نہیں، اس واسطے کہ اگر قیامت کا علم دے دیا جاتا کہ دس ہزار برس کے بعد آئے گی تو جتنی نسلیں اس سے پہلے ہوتیں وہ تو مطمئن ہو کر بیٹھ جاتیں کہ بھئی ہمارے اوپر تو قیامت آئے گی نہیں، جن پر آئے گی وہ بھگت لیں گے لہٰذا ہم تو آزاد ہیں جو چاہے کریں، حرام ہو حلال ہو، جائز ہو نا جائز ہو، پھر اس درجہ ڈھٹائی میں مبتلا ہوں گے کہ کسی کو عمل صالح انجام دینے کا ہوش نہیں ہوگا۔

سوائے اس کے کہ کچھ فکر اس نسل کو ہو شاید جس کے اوپر قیامت آتی، تو ایک تو اس میں یہ مضرت تھی کہ قیامت کی تاریخ بتلا دینے میں جو تاریخ سے بعید لوگ تھے، وہ بے فکر ہو کر دنیا کی زندگی کو تباہ کر لیتے اور عمل صالح کی انہیں توفیق نہ ہوتی۔ لیکن جبکہ ان کو اتنا علم ہے کہ آئے گی تاریخ کا علم نہیں تو ہر وقت ایک خطرہ لگا ہوا ہے کہ معلوم نہیں کہ کب قیامت قائم ہوجائے، اور جب قیامت آنے والی ہے تو بھئی اپنی زندگی کو درست کر لو، اس کی فکر کرو۔

اس کے لیے کچھ سامان کرو، تو علم نہ دینے ہی کے اندر مصلحت ہے کہ انسان نیکی کرنے میں آمادہ رہے، علم ہوجانے کے بعد یا نیکی چھوڑ دیتا یا اتنا خائف ہوگا کہ نیکی سے معطل ہوجائے گا۔

قیامت شخصی کا علم دے دیا جاتا تو دنیا کی ترقی موقوف ہوجاتی جیسے ہر انسان کی قیامت!...... حق تعالیٰ کی بڑی حکمت اور مصلحت ہے کہ کسی کو اس کی موت کا علم نہیں دیا۔

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۭ ① کسی نفس کو یہ پتہ نہیں ہے کہ میں کب مروں گا اور کہاں انتقال کروں گا، اس میں بڑی مصلحت یہ ہے کہ اگر ہر انسان کو مطلع کر دیا جاتا کہ تیری عمر ساٹھ برس کی ہے تو اول تو اس کی زندگی اجیرن ہوجاتی، ہر روز گنتا کہ آج ایک دن کم ہوگیا، آج دو دن کم ہوگئے۔ پھر نہ نیکی کرتا نہ بدی

① پارہ: ۲۱، سورۃ: لقمان، الآیۃ: ۳۴.

کرتا، وہ تو ہر وقت لرزتا رہتا کانپتا رہتا اور زندگی اجیرن ہو جاتی اس کی۔ نہ کھانے میں لطف، نہ پینے میں لطف، تو جب سارے ہی انسان ایسے ہی ہو جاتے تو نظام عالم تباہ ہو جاتا، نہ ترقی کی سوجھتی نہ تمدن کی سوجھتی نہ دنیا کو آباد کرنے کی سوجھتی، بس ہر شخص بیٹھا ہوا کانپتا رہتا لرزتا رہتا، کسی کے پاس جاتے کہ بھئی کیوں کانپ رہے ہو؟ کہ بھی میری زندگی کے ایک سو انچاس دن رہ گئے ہیں دوسرا کہتا کہ میاں میرے تو چالیس ہی رہ گئے۔ تیسرا کہتا میرے تین ہی رہ گئے تو ایک دوسرے سے دکھڑا رو کر رونے میں گزارتے۔ نہ عمل ہوتا نہ دنیا آباد ہوتی اور منشاء خداوندی ہے کہ دنیا کا نظام بھی چلے اور دنیا سے تمدن بھی چلے۔ اس تمدن میں رہ کر ہی تم دین بنا سکتے ہو اس لیے دنیا کی آبادی ضروری ہے اور وہ ہو نہیں سکتی تھی جبکہ موت کے وقت سے تمہیں غافل نہ بنایا جائے، یہ علم تو رہے کہ آنے والی ہے یہ نہ ہو کہ کب آنے والی ہے، تم سے وقت کا اور تاریخ کا چھپانا ہی مصلحت ہے اسی طرح سے قیامت کلی کے وقت کو چھپانا مصلحت تھا اتنا علم دے دیا جانا ضروری تھا کہ آئے گی قیامت اور یہ جہان ایک دن ختم ہو جائے گا تو جتنا علم دیا وہ بھی معقول اور جتنا نہیں دیا وہ بھی معقول۔

انکار معقول اپنی ہی تکذیب ہے...... اور ظاہر بات ہے کہ معقول کا انکار وہ اپنی عقل کا بھی انکار ہے وہ اپنے کو بھی جھٹلانا ہے وہ حق تعالیٰ کی تکذیب نہیں بلکہ اپنی تکذیب ہے وہ تو بری ہے تکذیب سے ان کا ہر دعویٰ سچا ہے تو اپنے کو جھٹلا رہا ہے آدمی جبکہ ایک معقول بھئی علم کب آئے گی؟ یہ اللہ کے پاس ہے جب پیغمبروں کو بھی خبر نہیں دی گئی اس کی تو میری اور آپ کی حقیقت کیا کہ ہمیں اس کا علم دیا جائے آگے فرمایا۔ وانما انا نذیر مبین علم اللہ کے پاس ہے میں تو ڈرانے والا ہوں۔ اتنا علم مجھے دیا گیا ہے کہ آئے گی قیامت تو اسے پیش کر کے میں تمہیں ڈرا رہا ہوں کہ جب آنے والی ہے تو کچھ سامان کر لو اس کے لیے۔

عقل کی گمراہی...... جیسے کہ فرمایا گیا ہے کہ "اِعْمَلْ لِلدُّنْيَا بِمِقْدَارِ بَقَآئِکَ فِيْهِ وَاعْمَلْ لِلْاٰخِرَةِ بِمِقْدَارِ بَقَآئِکَ فِيْهِ" ①

دنیا کے لیے اتنا سامان کر، جتنا تمہیں دنیا میں رہنا ہے، آخرت کے لیے اتنا سامان کرو جتنا تمہیں آخرت میں رہنا ہے۔ دنیا میں رہنا ہے چند دن تو یہاں تھوڑا بھی کافی ہے۔ آخرت میں رہنا ہے ابدالآباد تک تو وہاں کے لیے لمبا سامان کرنا چاہیے۔ انسانوں نے الٹا کر دیا کہ جہاں ابد تک رہنا ہے وہاں کا تو کوئی سامان نہیں کر رہے اور جہاں چند دن رہنا ہے وہاں کے سارے سامان کر رہے ہیں، تو یہ عقل کی گمراہی ہے، عقل کا کھوٹ ہے۔ ہونا چاہیے تھا برابر، تو آپ نے فرما دیا کہ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۪ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ علم تو اللہ کے پاس ہے کہ کونسی تاریخ ہے قیامت کی، میں تو ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں اس لیے کہ مجھے آنے کا علم دیا گیا ہے وہ علم میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں اور وہی علم مصلحت بھی ہے، تاریخ اور وقت کا علم تمہارے لیے مصلحت نہیں ہے۔

① یہ حضرت سفیان ثوریؒ کا قول ہے۔ دیکھئے: حلیة الاولیاء ج: ۳ ص: ۱۷۳۔

کفار پر قیامت کے آثار......اور اس کے بعد فرمایا کہ تم جو مانگ رہے ہو کہ جلدی آجائے قیامت **فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا** تم کیا سمجھے ہوئے ہو قیامت کو جب آئے گی قریب تو حلیے بگڑ جائیں گے تمہارے، منہ سیاہ ہو جائیں گے تمہارے۔ کفار کو خطاب کیا جارہا ہے کہ بڑی آسانی سے تم مانگ رہے ہو، آجائے قیامت، جب وہ آئے گی تو کیا حال ہوگا تمہارا؟ یہ تھوڑا ہی ہوگا جیسے آج مگن بیٹھے ہوئے کہہ رہے ہو کہ صاحب! لے آؤ قیامت کو، جب آئے گی تو چہرے بگڑ جائیں گے، حلیے بگڑ جائیں گے تمہارے۔

قیام قیامت آناً فاناً ہوگا......اور وہ آئے گی، یہ نہیں ہے کہ کوئی بڑے مقدمات اس کے چلیں گے کہ چھ مہینے پہلے کچھ اطلاعات دی جائیں اور چھ مہینے پہلے کوئی گڑ گڑاہٹ ہو۔

وہ تو پل بھر میں قائم ہو جائے گی **وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ** ② قیامت کا آنا **كَلَمْحِ الْبَصَرِ** جیسے نگاہ جھپکتی ہے اتنے میں آجائے گی، کوئی پتہ پہلے سے نہیں ہوگا۔ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ دو آدمی کپڑا سکھا رہے ہوں گے رنگریز، ایک پلہ ایک ہاتھ میں ہوگا ایک پلہ دوسرے کے ہاتھ میں وہ اسے سکھا رہے ہوں گے کہ اچانک قیامت قائم ہو جائے گی۔

حدیث میں ہے کہ ایک عورت آٹا گوندھ رہی ہوگی گھر میں، اس کا ہاتھ آٹے میں ہوگا کہ اچانک قیامت قائم ہو جائے گی، پل بھر میں قائم ہوگی۔

نفخ صور کی کیفیت......صور جب پھونکا جائے گا جو عالم کی تباہی کا سبب ہوگا۔ ابتداء بہت ہلکی آواز ہوگی کسی کو وہم بھی نہیں گزرے گا، کہیں گے کوئی چیز ہے کوئی باجا ہے کوئی چیز ہے بج رہی ہے۔ رفتہ رفتہ بڑھنی شروع ہو جائے گی۔ جب آواز بڑھے گی تو اب لوگ چونکیں گے کہ یہ کیا چیز ہے۔ رفتہ رفتہ بڑھتی جارہی ہے۔ تو ادھر ادھر دیکھیں گے پھر کچھ کام میں لگ جائیں گے۔ اس کے بعد اس میں درد کی سی آواز پیدا ہوگی۔ تو اب حیران ہوں گے، پریشان ہوں گے، درد یک دم ہوتا ہے یہ تو تدریجی طور پر بڑھتا جارہا ہے جب زیادہ درد ہوگی تو اب اضطراب اور بے چینی پیدا ہوگی، جنگلوں سے گھروں میں آئیں گے، گھروں سے جنگلوں میں جائیں گے۔

جانور انسانوں میں، انسان جانور میں، کوئی کسی کو اپنی حالت کی خبر نہیں ہوگی اور اس کے بعد جب وہ انتہائی بڑھے گی۔ حدیث میں ہے کہ جیسے سو گرجوں کے برابر ایک گرج ہوتی ہے مسلسل تو پھر کلیجے پھٹنے شروع ہوں گے۔ گرنے شروع ہوں گے۔ اور یہاں تک تو جائیں گے جب زیادہ آواز بڑھے گی تو پہاڑ پھٹنے شروع ہوں گے۔ سب چیزیں ریزہ ریزہ ہو کر گڈ مڈ ہو جائیں گی، دنیا میں بھی جب کوئی بم پھٹتا ہے تو دیواریں ہلتی معلوم ہوتی ہیں اور کھڑکیوں کے کواڑ ٹوٹ جاتے ہیں۔ انسان بعضے بے ہوش ہو جاتے ہیں تو اس کی بنا یہ ہے کہ اصل میں روح جو ہے یہ اللہ نے پیدا کی ہے قوت ہوائی اور آواز جو ہے یہ بھی ہوائی۔ یہ سانس زیادہ نکلتا ہے۔ وہی آواز کہلاتی ہے۔ تو

① یہ حضرت سفیان ثوریؒ کا قول ہے۔ دیکھئے: حلیۃ الاولیاء ج:۳ ص:۱۷۳۔

سانس کے ٹھونکنے کا نام آواز ہے، ظاہر بات ہے کہ جب آواز اور ہوا زیادہ گرجتی ہوگی تو وہ جذب کرے گی چھوٹی ہوا کو تو یہ ارواح چونکہ ہوا سے پیدا کی گئی ہیں جب اصل مادہ زوروں پر آئے گا اور وہ آواز اور ہوا ہے تو روحوں کو جذب کرنا شروع کرے گا، روحیں ہلنی شروع ہوں گی تو عرض قیامت قائم ہوگی صور پھونکنے سے۔

اور صور بتدریج پھونکے گا تو جب وہ پھونکا جانا شروع ہوگا اور آواز آئے گی تو یہ نہیں کہ پہلے سے کچھ اطلاعات ہوں گی۔ یا پہلے خطرات ہوں گے۔ وہ تو پل بھر میں قائم ہو جائے گی وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْهُوَ اَقْرَبُ...... جتنی دیر میں نگاہ جھپکاتے ہو بلکہ اس سے بھی کم میں ایک دم اچانک آجائے گی جیسے موت انسان کی اچانک ہی آتی ہے، یہ تھوڑا ہی ہے کہ پہلے سے اطلاعات دی جائیں، بیمار بھی اگر آدمی ہوتا ہے تو یہ اس کو اندازہ نہیں ہوتا کہ اگلے منٹ میں موت آجائے گی، چل رہا ہے بیماری جب آتی ہے تو ایک دم نزع شروع ہو گیا، لوگ بھی سمجھ گئے کہ بھئی مرنے کا وقت آ گیا تو شخصی قیامت بھی اچانک آتی ہے، کلی قیامت بھی اچانک آئے گی۔ اس کا علم دے دیا گیا۔

عمل کے لیے جتنا قیامت کا علم ضروری تھا وہ دے دیا گیا...... تو فرمایا: **انما العلم عند الله** اس کے دن تاریخ کا علم تو اللہ کو ہے ہمیں نہیں ہے۔ ہمیں تو اتنا علم ہے کہ وہ آئے گی اور وہ ہی کافی ہے ہمارے عمل کے لیے وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ . اور تم جو سہولت سے کہہ رہے ہو کہ لے آؤ اس قیامت کو تو فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا جب وہ آجائے گی اچانک تو تمہارے حلیے بگڑ جائیں گے، چہرے بگڑ جائیں گے، تم اس حالت میں نہیں ہوگے جس حالت میں آج ہو کہ سہولت سے مانگ رہے ہو، قیامت کو تم سمجھ نہیں رہے کہ ہے کیا قیامت؟ اس واسطے بڑے اطمینان سے مانگ رہے ہو۔ جیسے آدمی گھبرا کر بعض اوقات کسی مصیبت سے تنگ آکر موت کی دعا کرنے لگتا ہے تو یہی جواب اس کا ہوتا ہے کہ بیوقوف پتہ نہیں ہے کہ موت کیا چیز ہے۔ وہ یوں سمجھ رہا کہ یہ مصیبت تو ہے بہت بری اور موت بڑی معمولی چیز ہے کہ موت آجائے گی تو مصیبت ٹل جائے گی۔ موت تو سب مصیبتوں کا پیش خیمہ ہے۔ سب سے بڑھ کر مصیبت ہے یہ تیری حماقت اور غلطی ہے کہ اس مصیبت سے تنگ آکر موت مانگ رہا ہے غالب شاعر نے کہا ہے ناں کہ:

اب تو گھبرا کر یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے ۔۔۔ اور مر کر بھی چین نہ آیا تو کدھر جائیں گے

تو یہ سمجھ لینا کہ موت ہلکی چیز ہے یہ دنیا کی مصیبتیں بڑی ہیں یہ غلط ہے یہ ساری مصیبتیں اولین آخرین کی جمع کر دی جائیں تب ایک موت بنتی ہے، تو موت سرچشمہ ہے سارے مصائب کا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا موت کی کیفیت کے بارے میں سوال...... حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوال کیا ملک الموت سے کہ موت کی کیا کیفیت ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ میں کیفیت کیا بتلاؤں جو جس پہ گزرے گی وہ جانے گا مگر میں ایک مثال کے ذریعے کچھ فہم کے قریب کر دوں گا،

اصلیت نہیں سمجھا جا سکتا وہ تو گذرنے کی چیز ہے۔

تو انہوں نے فرمایا کہ یہ سمجھو کہ انسان کے بدن میں تار ڈالا جائے ایڑی سے لے کر چوٹی تک اور جتنی رگیں ہڈیاں ہیں اتنی شاخیں ہوں اس تار میں اور ہر ہر شاخ ایک ایک رگ میں پیوست کی جائے اور ان شاخوں میں کانٹے بھی ہوں لوہے کے، وہ کانٹے دار تار ہر ہر رگ کے اندر پیوست (ہو) تو اب گویا ایک تار انسان کے اندر گیا ہوا ہے اور اتنی شاخیں ہیں جتنی رگیں ہیں، پٹھے ہیں اور ہر تار میں ہر شاخ میں کانٹے ہیں اور وہ پھٹ گیا، اس کے بعد اس کو کھینچنا شروع کر دو تو یوں معلوم ہوگا کہ رگ رگ درد سے بھر پور ہے بھری ہوئی ہے۔

اور گویا ساری رگیں کھنچ آئیں گی اوپر، فرمایا کہ یہ ادنیٰ سی مثال ہے موت کی اور جان کنی کی اور جیسے رگ رگ کے اندر کانٹوں دار تار ڈال کر اسے کھینچا جائے اوپر تو جو اذیت ہے۔ محسوس کر سکتا ہے آدمی وہ ادنیٰ سی مثال ہے موت کی اذیت کی، تو موت کوئی آسان چیز تھوڑا ہی ہے کہ ذراسی مصیبت میں گھبرا کر آدمی موت مانگنے لگے موت کوئی آسان بات نہیں ہے عظیم چیز ہے۔

مؤمن و کافر کی روح قبض کرتے وقت ملک الموت کی صورت...... حدیث میں فرمایا گیا کہ ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا ملک الموت سے کہ تم کس شکل میں آکر روح قبض کرتے ہو۔ فرمایا کہ مؤمن کے آگے تو نہایت اعلیٰ اور با جمال صورت ہے اس میں میں آتا ہوں۔ اس سے بڑھ کر جمال نہیں ہوسکتا، اور کفار کے آگے انتہائی بھیانک شکل میں آتا ہوں کہ جس سے بڑھ کر ڈراؤنی صورت نہیں ہوسکتی، کہا مجھے دکھلا دو وہ صورت، کہا آپ تحمل نہیں کر سکیں گے مگر اصرار کیا تو حدیث میں ہے کہ اس شکل میں آئے جس سے مؤمن کی روح قبض کرتے ہیں ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ اگر اللہ کوئی بھی نعمت نہ دے مؤمن کو صرف یہ شکل دکھلا دے تمہاری تو سب نعمتوں سے بڑھ کر یہ نعمت ہے، اس کو دیکھ کر قلب میں فرحت اور سرور بھر جاتا ہے، اس کے بعد کہا کہ اب وہ شکل بھی دکھلاؤ، کہا آپ تحمل نہیں کریں گے، کہا نہیں دکھلاؤ۔ اس شکل میں آئے تو دیکھتے ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام بے ہوش ہوگئے۔ برداشت نہیں کر سکے۔ اس کے بعد ہوش آیا تو کہا کہ اگر کوئی بھی مصیبت نہ آئے کافر پر، فقط یہ شکل دکھلا دی جائے تو ہزار مصیبتوں کی یہ ایک مصیبت ہے۔

اس کی کچھ شکل حدیث میں فرمائی گئی ہے کہ ملک الموت جس شکل میں آتے ہیں، کفار کے آگے وہ ایک عجیب بھیانک شکل ہے، ایک شخص کی، سیاہ فام اور ہر بدن پر جو رواں ہے وہ مثل نیزوں کے ہے اور ہر نیزے میں ایک شکل بنی ہوئی ہے انسان کی شکل یا جانور کی۔

تو اس طرح سے گویا لاکھوں شکلیں صورتیں ایک شخصیت میں نمایاں ہوتی ہے جتنی گویا ڈراؤنی شکلیں ہیں ہیبت ناک وہ سب سامنے ہوتی ہیں۔ تو وہ دیکھ کر خود ہی خون خشک ہو جاتا ہے وہ مستقل مصیبت ہے۔

تو بہر حال موت کوئی سہل چیز نہیں الا یہ کہ حق تعالیٰ ہی سہل فرما دیں کسی کے لیے، اسے سب کچھ قدرت ہے۔

ساری شدت بھی گزرے اور محسوس بھی نہ ہونے دے۔

موت کے آسان ہونے کی صورت...... جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کی صورت فرمائی، فرمایا کہ حدیث میں ہے کہ "مَنْ اَحَبَّ لِقَآءَ اللّٰہِ اَحَبَّ اللّٰہُ لِقَآئَہٗ" (1) جو شخص اس کا خواہش مند ہے کہ میں کب ملوں اپنے اللہ سے ہر وقت منتظر ہے شوق لگ رہا ہے عالم آخرت میں جانے کا اور:۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم ۔۔۔ تا در میکدہ شاداں وغزل خواں بروم

ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ وہ کون سا مبارک دن ہوگا کہ ہم غزل خواں، شاداں وفرحاں اپنے پروردگار سے ملیں گے اور اس اجڑے ہوئے عالم کو چھوڑیں گے تو جن لوگوں کے دلوں میں شوق ہے اللہ سے ملنے کا۔فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے یہاں بھی شوق ہے، وہ بھی منتظر ہیں کہ یہ بندہ کب ملے مجھ سے آ کے تو ادھر سے بھی شوق ادھر سے بھی شوق، مرنے کا جب وقت آتا ہے اس مؤمن پر وہ شوق وغلبہ کے ساتھ قلب پر ہجوم کرتا ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح جلدی پہنچوں، لگا ہوا ہے اس شوق میں، اس شوق کے اندر اتنا منہمک ہوتا ہے کہ ساری تکلیفیں بھی گزر رہی ہیں اور کچھ بھی نہیں گزر رہیں، اسے پتہ بھی نہیں چلتا سب کچھ گزر رہا ہے مگر وہ اتنا شوق میں غرق ہے کہ اسے محسوس ہی نہیں ہوتا کہ کیا تکلیف گزر رہی ہے اور کچھ محسوس بھی ہوتا ہے تو نعمتیں سامنے اتنی ہیں کہ وہ کہتا ہے اس سے دوگنی بھی مصیبت گزر جائے یہ سامنے نعمتیں موجود ہیں، اب میرے پاس آنے والی ہیں پل بھر کی بات ہے۔

اخروی نعمتوں کے حصول میں دنیوی مصائب کو روح ازخود قبول کر لیتی ہے...... مثلاً آپ کو ایک گورنمنٹ یہ کہے کہ یہاں سے پانچ میل پر جو اسٹیشن ہے وہاں ایک پانچ لاکھ کا بنگلہ آپ کے لیے گورنمنٹ نے تیار کیا ہے اور اس میں خزانہ بھی ہے دس لاکھ روپے کا، ابھی پہلی گاڑی سے جاؤ اور اس پر جا کر قبضہ کر لو، آپ خوشی خوشی چلے ریل میں گئے تو وہاں بیٹھنا تو بجائے خود کھڑے ہونے کی جگہ نہیں، تھرڈ کلاس میں جا کر کھڑے ہوئے اور اتنا ہجوم کہ ہڈی اور پسلی چور ہو جائے تو انتہائی تکلیف میں ہے مگر شوق لگا ہوا ہے کہ پانچ منٹ کی بات ہے، اب گئے اور دس لاکھ کے بنگلے پر قبضہ ہو گیا تو ذرہ برابر آپ کو تکلیف کا احساس نہیں ہوگا، کہیں گے چاہے اس سے دوگنی آجائے بس پانچ منٹ کی تو بات ہے، اب گئے اور جائیداد ملی لاکھوں کی۔تو جیسا کہ ایک دنیا کی ایک معمولی جائیداد کے شوق میں بڑی سے بڑی تکلیف آپ بھگت جاتے ہیں اور احساس تک نہیں ہوتا تو ابدالآباد کی نعمت اور وہ نعمتیں جن کا یہاں کبھی تصور نہیں ہو سکتا، وہ سامنے کی جائیں تو لاکھوں من بھی اگر تکلیف کا بوجھ پڑا ہوا ہوگا بھاری نہیں ہوگا کہ منٹ بھر کی بات ہے، اب یہ نعمتیں مل رہی ہیں۔

---

(1) الصحیح لمسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، باب من احب لقاء اللہ احب اللہ لقائہ، ج:۴ ص:۲۰۶۵ رقم:۲۶۸۳۔

اسی واسطے فرمایا گیا ہے کہ مؤمن کی قبض روح کے وقت ملائکہ علیہم السلام جنت کے کچھ تحائف لے کر آتے ہیں، وہاں کے پھل اور وہاں کے کپڑے اور وہاں کے کفن اور خوشبوئیں، ایک دم روح اس طرح سے گذر جاتی ہے کہ بس یوں کہتی ہے کہ میں پہنچ جاؤں پل بھر میں چاہے ہزار کانٹوں میں سے گزرنا پڑے۔

تو خود قبول کرتی ہے اس تکلیف کو کہ جتنی بھی تکلیف آئے مجھے بھگتنی ہے اس لیے کہ سامنے وہ نعمت موجود ہے، تو اس وقت مشاہدہ ہوتا ہے نعمت کا، انبیاء علیہم السلام اور اکمل اولیاء اللہ ان کو آنکھ سے دیکھنے سے زیادہ یقین ہوتا ہے اللہ کے وعدوں پر، ہر وقت ان کے سامنے وہ نعمتیں ہیں۔اس واسطے کوئی تکلیف ان کے یہاں تکلیف نہیں ہوتی ،ہزاروں ابتلاءات، ہزاروں مصیبتیں انبیاء علیہم السلام پر گزرتی ہیں اور ان کے قلوب مبارکہ پر ذرہ برابر اثر نہیں ہوتا۔اس لیے کہ اللہ کے وعدہائے حق سامنے ہیں اس لیے کہ یہ چند دن کی تکلیف ہے اب وہ نعمتیں آ رہی ہیں۔

تو انبیاء اپنی ایمانی قوت سے وہ کچھ دیکھتے ہیں جو ہم اپنی آنکھوں سے بھی نہیں دیکھتے اور ہم آنکھ سے دیکھ کر جتنا یقین کرتے ہیں اس سے زیادہ قوی یقین انبیاء کا اللہ کے وعدوں پر ہوتا ہے۔اس لیے وہ ساری تکالیف جھیل جاتے ہیں، ورنہ انبیاء علیہم السلام سے زیادہ کون ہے تکلیفیں اٹھانے والا ،لیکن ان کے قلوب پر ذرہ برابر اثر نہیں، قلب مگن اور مطمئن، اس لیے کہ وعدہ ہائے خداوندی اندر موجود ہیں۔تو بہر حال مؤمن باوجودیکہ موت اتنی شدید ہے باوجودیکہ اتنی ایذاءدہ ہے لیکن مؤمن اس سے گھبرانے کا نہیں، خوشدلی سے برداشت کرے گا، اگر خدانخواستہ کوئی وعدہ سامنے نہ ہوتا تو مرنا بھی موت ہو جاتا۔لیکن چونکہ نعمتیں موجود ہیں اب تو آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اس واسطے وہ کہتا ہے کہ کوئی پرواہ نہیں چلو، چاہے مصیبتوں میں کانٹوں میں جائیں مگر وہ نعمت ہے ابھی میں پہنچ جاؤں گا دو منٹ بعد، اس لیے ہوتی بھی ہے تکلیف اور نہیں بھی ہوتی، بالکل ایسی مثال ہے جیسے کوئی شدید قسم کا آپریشن کیا جائے کسی کا تو پہلے کلوروفارم سونگھا کر بے ہوش کر لیتے ہیں اس کے بعد اس کا سر کاٹ دو، پیر کاٹ دو، اسے کچھ خبر نہیں، تو گزر رہی ساری تکلیف مگر احساس باطل ہو گیا کہ جس سے اس کی اذیت محسوس نہیں ہوتی۔اسی طرح سے موت کی اذیت جب گزرے گی تو محبت خداوندی کا کلوروفارم سونگھا دے گی اس میں وہ اتنا مؤثر و مگن ہو گا کہ اس تکلیف کا ادنیٰ برابر اسے احساس بھی نہیں ہو گا اور محسوس بھی ہو تو بھاؤ یں بھی نہیں ہوں گی تو نعمتوں کے آگے کیا چیز ہے تکلیف تو پھر ان شاء اللہ مؤمن کے لیے راحت ہے باوجود اذیت کے۔

کیفیت موت اور قوت ایمانی کا سہارا...... حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ موت کی کیا کیفیت ہے؟ فرمایا کہ یہ کیفیت ہے کہ آدمی کو بیچ میں رکھ کر دو پہاڑوں کو ملا دیجئے۔اس میں جو اذیت ہے بس وہ موت میں ہے۔اور بعض انبیاء نے مثال دی کہ جیسے ایک نہایت ہی جابر قسم کا قصائی ہو ذبح کرنے والا اور بھی بڑا قوی اور ایک بکری کا بچہ اس کے ہاتھ میں ہو اور وہ کانٹ چھانٹ کے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔بس یہ حالت ہے موت کی ملک الموت کے سامنے، اس طرح سے ہو گا اس وقت آدمی، تو باوجود اس اذیت کے وہ جو قوت ایمانی ہے وہی

سنبھالتی ہے۔ بھروسہ اللہ پر ہوتا ہے تو تکلیف معلوم بھی نہیں ہوتی وہی قوت ایمانی وہاں سنبھالے گی اور وہی قوت ایمانی قبر میں سنبھالے گی اور وہی قوت ایمانی حشر کے اندر سنبھالے گی، ہر جگہ تکلیف آدمی جھیل جائے گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف رکھتے تھے مجلس نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبر کے ہولناک حالات بیان فرما رہے تھے، تو لوگ لرز رہے تھے، کانپ رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ تمام لوگ لرزاں، ترساں اور آپے سے باہر ہو گئے ہیں۔ عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہماری عقل بھی صحیح سالم ہوگی قبر میں، فرمایا ہاں عقل رہے گی، کہا تو اب کوئی فکر کی بات نہیں بس نمٹ لیں گے۔ تو عقل سے مراد یہ عقل معاش نہیں تھی جو موٹر بنانے کی عقل ہے، ہوائی جہاز بنانے کی عقل ہے عقل معاد تھی جو آخرت کی عقل ہے جس کا دوسرا نام ایمان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارا ایمان بھی رہے گا، فرمایا رہے گا۔ تو بس اب جھیل جائیں گے۔

قوتِ ایمانی سب چیزوں کو ہلکا کر دیتی ہے تو اصل چیز ایمان ہے، دنیا کی مصیبتوں میں بھی جب آدمی اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے، توکل اور صبر سے تو مصیبتیں ہیچ معلوم ہوتی ہیں۔ یہ اللہ جانے جو کچھ ہوگا، ہو رہے گا، مجھے تو خدا پر بھروسہ ہے تو دنیا کی مصیبتیں بھی اللہ ہی کا یقین اور ایمان سہل کرتا ہے۔ موت کی مصیبت یہی ایمان سہل کرے گا قبر کے مصائب یہی ایمان سہل کرے گا حشر کے مصائب یہی ایمان سہل کرے گا۔ اوران سب سے گزر کے اپنے ٹھکانہ پر پہنچ جائے گا وہی جو راحتوں کا ٹھکانہ ہے جس کا نام جنت ہے۔ تو کافر کے لیے یہاں سے لے کر وہاں تک اور ابد تک مصیبت ہی مصیبت ہے اس لیے کہ وہ جو مصائب میں ڈھارس دینے والی چیز ہے وہ اس نے کھودی، وہ ایمان ہے جب وہ نہ رہا تو اب سہارا کوئی باقی نہیں اس واسطے اس کے لیے ہر تکلیف تکلیف ہے مؤمن کے لیے کوئی تکلیف تکلیف نہیں اس کو فرمایا کہ جو قیامت مانگ رہے ہو تم جب وہ آئے گی تو چہرے بگڑ جائیں گے ہوکس ہوا میں اس واسطے کہ وہ قوت تو ہے نہیں جس سے سہارا لیتے تم۔

یعنی ایمان کی قوت وہ تو ہے نہیں اور جب وہ نہیں ہے تو مصیبتیں ہی مصیبتیں ہیں حلیے بگڑ جائیں گے، کہاں مانگ رہے ہو اور جس میں ایمان ہے وہ کبھی نہیں مانگے گا قیامت کو۔ وہ کہے گا جب آئے گی آئے گی میں تو اللہ کے وعدے کو سچا جانتا ہوں کہ آنے والی ہے، مجھے تو عمل صالح کرنا ہے، وہ نہ مانگے گا قیامت، فرمایا کہ جب وہ آ جائے گی تو "سِيْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" کفار کے حلیے اور چہرے بگڑ جائیں گے...... اوراس وقت کہا جائے گا کہ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ وہ جو مانگتے تھے یہ ہے، اب اسے بھگتو، وہ آ گئی قیامت، لے لو اسے۔

اپنی فکر اوّل ہے...... قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ تو مختلف سوالوں سے کفار لانا چاہتے تھے عقائد تو پہلا تو یہی سوال کر دیا مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ. کہاں ہے صاحب وہ وعدہ؟ اس کا تو جواب دے دیا گیا تو اس کے بعد جب اس میں چپ ہوئے تو ایک دوسرا سوال شروع کر دیا وہ یہ کہ صاحب! جب قیامت آئے گی نہ تم رہو گے نہ ہم رہیں گے، تو فکر کی کیا بات ہے تم بھی ہلاک ہو گے اگر تم پر قیامت آئی، تو تم ہی ہو گئے تو کیا......

اس کا جواب دیا حق تعالیٰ نے فرمایا پیغمبر سے کہ تم کہہ دو کہ بھئی! مجھے یا میرے ساتھیوں کو اگر اللہ ہلاک کریں یا مجھ پر رحم کریں اور ہلاک نہ کریں کوئی بھی صورت ہو تمہیں کیا فائدہ اس سے؟ میں اور میرے ساتھی ہلاک ہوں یا میں اور میرے ساتھی نجات پائیں تو تمہیں کیا فائدہ پہنچا تم پر جو گذرنی ہے گزرے گی اپنی فکر کرو، ہماری فکر میں کیوں پڑے ہوئے ہو، تم ہم چاہے ہلاک ہوں چاہے نجات پائیں تم تو اپنی فکر کرو...

اس لیے کہ قیامت تو آنے سے ٹلے گی نہیں اور جب وہ آئے گی تو ہم پر بھی آئے گی تم پر بھی آئے گی۔ تو اب کوئی شخص یوں کہے کہ چونکہ تم پر آئے گی اس واسطے مجھے کوئی فکر نہیں اس سے زیادہ کون احمق ہے۔ بھئی تیرے اوپر بھی آئے گی، دوسرے پر کچھ بھی گزرے تو فرمایا قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَهْلَکَنِیَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِیَ بھلا بتلایئے کہ اللہ مجھ کو اور میرے ساتھیوں کو یا ہلاک کرے اَوْ رَحِمَنَا یا ہم پر رحم کرے فَمَنْ یُّجِیْرُ الْکٰفِرِیْنَ. کفار کو عذاب سے بچانے والی کون سی چیز ہے؟ اگر ہمیں ہلاک ہی کر دیا تو تم بچ گئے عذاب سے؟

تو تم نے اپنی فکر کرنے کے بجائے ہماری فکر شروع کر دی کہ نہ تم رہو گے نہ ہم رہیں گے، بھئی ہم رہیں نہ رہیں تو تمہارا کیا بنے گا، تم اپنی فکر کرو تو مطلب یہ ہے کہ یہ بھی سوال مہمل ہے اور یہ سارے سوال اسی لیے ہوتے ہیں کہ عقیدہ کو رلا ملا کر ختم کر دیں، ادھر ادھر کی باتوں میں ٹال کر اور ضائع کر دیں، اس چیز کو قرآن میں ایک ایک چیز کو پکڑتے ہیں۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو کہہ دیجئے کہ.....

اعتقادِ صحیح اور عملِ صحیح ہی کارآمد ہے..... قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَیْهِ تَوَکَّلْنَا. ہم تو رحمٰن پر ایمان لے آئے ہیں اور اس پر بھروسہ کر لیا ہے اور اس کی وجہ سے ہم عمل صالح کر رہے ہیں.....اور ہمیں اللہ کی ذات سے یقین ہے کہ راحتیں ملیں گی اس عالم میں، تو ہم مطمئن ہیں، تم اپنی فکر کرو تم کس چیز پر اطمینان رکھتے ہو، نہ ایمان نہ تم میں توکل اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَیْهِ تَوَکَّلْنَا. ہم تو ایمان بھی لے آئے، عقیدہ بھی درست ہو گیا، توکل کیا تو عمل درست ہو گیا تو ہمارا ایمان بھی درست، عمل بھی درست، ہمیں یقین ہے کہ انجام ہمارا نیک ہو گا، اب تم اپنی فکر کرو نہ ایمان، نہ توکل تو تم کہاں جاؤ گے؟ باتیں بنانے سے عذاب ٹلنے والا نہیں، ایمان لانے سے ٹلنے والا ہے اور تم باتیں بنا بنا کے چاہے ٹلا دو عذاب کو، اس طرح نہیں ٹلا کرتا "فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ" عنقریب تم جان لو گے کہ کون گمراہی میں تھا اور کون حق پر تھا... جب نتائج سامنے آئیں گے تو پتہ چل جائے گا تو دنیا میں تو ہم نے تمہیں عقل سے بھی سمجھا دیا۔ مشاہدہ سے بھی سمجھا دیا، عقل صحیح سے بھی سمجھا دیا، اب اگر نہیں سمجھتے مشاہدہ ہی چاہتے ہو تو عنقریب وقت آنے والا ہے، تمہیں پتہ چل جائے گا کون ہدایت پر تھا، کون ضلالت پر، جب برے نتائج آئیں گے سامنے تو سمجھ میں آ جائے گا کہ تم گمراہی میں تھے اور جب ہمارے سامنے اچھے نتائج آئیں گے تو ہم بھی سمجھ جائیں گے کہ ہم ہی حق پر تھے.....

دنیا کے ساز و سامان کی حیثیت..... اب آگے تمہیں زیادہ سے زیادہ بھروسہ اس دنیا کے سامانوں پر ہے،

اول تو یہ وہاں نہیں جائیں گے لیکن اگر وہاں نہ بھی جائیں یہ تو بعد کی بات ہے۔ دنیا میں بھی رہنا تو کوئی لازمی بات نہیں ہے۔ سامان ہوتے ہیں اور پھر چھین لیے جاتے ہیں ہزاروں امیر غریب بنتے دیکھے گئے، ہزاروں غریب امیر بنتے دیکھے ہیں، ہزاروں امراء ہیں کہ دولت کے انبار لگے ہوئے ہیں اور چین میسر نہیں، حالانکہ دولت کا مقصد یہ ہے کہ چین ہو تو بہت سے دولت مند ہیں چین نصیب نہیں ہیں، کوئی گھن لگ گیا قلب پر، کوئی فکر لگ گئی تو لاکھوں روپیہ رکھا ہوا ہے مگر وہ جو گھن لگا ہوا ہے ساری زندگی کری کری ہو گئی۔

اس سے تو جن سامانوں پر تم بھروسہ کر رہے ہو، آخرت تو بعد کی چیز ہے دنیا میں بھی نفع دینے والے نہیں کہ سامان ہوتے ہیں اور چین میسر نہیں ہوتا۔

سکون کا راستہ ایک ہی ہے...... چین اگر آتا ہے تو پھر وہی ایک رستہ ہے کہ اللہ پر بھروسہ کرے آدمی، توکل اور اعتماد اور ایمان، چین اسی سے ملے گا۔ ’’اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ‘‘ ① اللہ کے ذکر سے ہی دل چین پاسکتے ہیں۔ سامانوں سے چین نہیں پاسکتے۔ سامان ہیں وہ خود بے چینی کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ جتنا زیادہ ہوگا سامان، زیادہ مصیبت پڑے گی وہ کسی عربی کے شاعر نے کہا ہے ؎

زیادہ دولت، زیادہ مصائب......

اِذَا اَدْبَرَتْ کَانَتْ عَلَی الْمَرْءِ حَسْرَةً　　　وَاِنْ اَقْبَلَتْ کَانَتْ کَثِیْرًا هُمُوْمُهَا

’’دنیا جب جاتی ہے تو حسرتیں چھوڑ کر جاتی ہے برسوں روتا ہے آدمی اور جب آتی ہے تو سینکڑوں مصیبتیں ساتھ لاتی ہے‘‘ کہیں محافظ کی فکر، کہیں سنتری کی فکر کہیں چور کی کہیں ڈاکو کی ایک مصیبت میں مبتلا اور ایک وہ ہے کہ بقدر ضرورت ہے کھانے پینے کو تو؟ ’’کس نیاید بخانہ درویش کہ خراج زمین و باغ بدہ‘‘ درویش کے گھر کوئی نہیں آتا کہ بھئی ٹیکس ادا کرو، خراج ادا کرو، وہ اپنا بادشاہ بنا بیٹھا ہے۔

تو جہاں دولت زیادہ ہے مصائب بھی زیادہ ہیں اور ہمیشہ رہنے والی نہیں بیچ میں جواب دے جاتی ہے بے وفائی کرتی ہے تو ایسی بے وفا پر تم بھروسہ کیے ہوئے ہو آخرت کے بارے میں، آخرت تو بعد میں ہے تم دنیا تو سنبھال لو وہ سنبھلنی لازمی نہیں ایک چیز چھن جائے اللہ کی طرف سے تو ساری زندگی ختم۔

اللہ کے مقابل دعویٰ بڑی نادانی ہے...... وَمَنْ مَّعِیَ اَوْرَحِمَنَا، فَمَنْ یُّجِیْرُ الْکٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ○ قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَیْهِ تَوَکَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ○ قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُکُمْ غَوْرًا فَمَنْ یَّاْتِیْکُمْ بِمَآءٍ مَّعِیْنٍ ○

فرمایا کہ ہم مثال دیتے ہیں پانی کی، پانی کنوؤں میں ہے لیکن اللہ تعالیٰ پانی کو نیچے کر دیں، خشک سالی کے زمانے میں ایسا ہوتا ہے کہ کنوئیں خشک ہو جاتے ہیں، پانی نیچے چلا جاتا ہے، ’’اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُکُمْ غَوْرًا‘‘۔ اگر

① پارہ: ۱۳، سورۃ: الرعد، الآیۃ: ۲۸۔

گہرائیوں میں پانی چلا جائے تو تم کھدائی کر کے نہیں پہنچ سکتے۔ " فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ" پھر پانی لانے والا تمہارے واسطے کون ہے، یہ سامان تھا اس پر بھروسہ تھا، اللہ نے ذرا پچاس گز نیچے کر دیا اب بیٹھے ہوئے ہیں، نہ کھدائی کر سکتے ہیں، اور اگر کھودیں گے اور نیچا ہو جائے گا، اور نیچا تحت الثریٰ تک، تو کھودنے سے رہے وہ کھودے جاؤ تو کھودتے رہو گے، مرتے رہو گے زندگی دینے والا کوئی نہیں۔ تو ایک پانی کی مثال دی کہ اسے اگر گہرائیوں میں اتار دے تو زندگی کا کوئی سامان نہیں دریا خشک ہو جائیں اور قحط سالیوں کے زمانے میں ہوتا ہے کہ آسمان تو برسانا بند کر دیتا ہے، دریاؤں میں خشکی آجاتی ہے، کنوئیں نیچے اتر جاتے ہیں تو ہزاروں آدمی مرجاتے ہیں تو ایک پانی پر جب اس کا قبضہ نہیں ہے .... وہ آدمی بھروسہ کرے گا کہ قیامت میں اچھی طرح سے ہوں گا اور قیامت آجائے تو میں نمٹ لوں گا، تم ان چیزوں سے نمٹو گے جو تمہارے ہر وقت موجود، اگر آفتاب کے اندر گرمی نہ رکھی جائے تو ساری دنیا برف کی طرح جم کر رہ جائے۔ اس کی حرارت ہے جس نے پگھلا رکھا ہے۔ ہوا اگر منٹ بھر کے لیے روک دی جائے سانس لینے بند ہو جائیں تو زندگی ختم ہو جائے۔ تو آگ نہ رہے جب ختم آدمی، پانی نہ ہو جب ختم، ہوا نہ رہے جب ختم، مگر اور چیزیں تو خیر اوپر کی ہیں پانی تو ہر وقت کا ہے جس کو کھودا اور نکال لیا اس کو نیچے اتار دیں تب اس پر قبضہ نہیں تو آخر کون سی چیز پر تمہارا قبضہ ہے کہ اتنے بڑے بڑے دعوے کر رہے ہو کہ صاحب لے آؤ قیامت کو جیسے معلوم ہو بڑا لشکر جرار ان کے ہاتھ میں ہے کہ قیامت آئے گی یہ مقابلہ کریں گے اسے دھکیل کر پرے کر دیں گے تم اپنی عمر کے ایک سال کو دھکیل سکتے نہیں، زندگی جاتی ہوئی روک نہیں سکتے۔ آتی ہوئی تو نہیں روک سکتے تو کون سی طاقت ہے کہ اتنے بڑے بڑے دعوے دو اللہ سے لڑنے کا ارادہ کیا تو "قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ"

فرما دیجئے کہ اگر اس حالت میں تم صبح کرو کہ پانی کنوؤں کے نیچے اتر جائے تو پانی لانے والا کون ہے تمہارے پاس، تو یہ ایک مثال ہے سارے عناصر کو اس پر قیاس کر لو اور پانی پر آگ کو بھی ہوا کو بھی مٹی کو بھی جب ہاتھ پلے کچھ نہیں تو دعوے مت کرو، غالب اور قوی خدا کے سامنے جھک جاؤ یہی پناہ کی صورت ہے لڑنا صورت پناہ کی نہیں۔ بس دعا کیجئے، ایک سورت ختم ہوگئی، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ۔

حررہٗ

۱۱/۱۲/۱۶

وقت اشراق۔

افادات علم وحکمت

از: حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز مدارس کی صورت حال پر ایک فکر انگیز انٹرویو، پس منظر

آج سے بیس سال قبل ۱۳۹۴ھ (مطابق ۱۹۷۴ء) میں جب احقر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں زیر تعلیم تھا، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالیٰ مدینہ پاک تشریف لائے تو احقر کو بحمد للہ ان کی خدمت میں حاضری اور صحبت کی سعادت میسر آئی، اس موقع پر محترم ومکرم جناب قاری بشیر احمد صاحب دام مجدھم کے مکان پر (جواس زمانہ میں پاک وہند کے بزرگوں کی اقامت گاہ تھی) حضرت رحمہ اللہ سے مدارس عربیہ کی موجودہ صورتحال پر مجھے ایک انٹرویو ٹیپ کرنے کی سعادت بھی نصیب ہوئی، خیال تھا کہ اسے کاغذ پر منتقل کر کے ''البلاغ'' میں اشاعت کے لیے دوں گا، مگر تقدیر خداوندی کہ یہ انٹرویو کاغذ پر پوری طرح منتقل نہ کیا جاسکا اب بیس سال گزر جانے کے بعد یہ کیسٹ دوبارہ ہاتھ میں آئی اور اسے سننے کا موقع ملا تو اس کی اہمیت اور افادیت کا کچھ اندازہ ہوا۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ، بانی دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم نالوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز ہی نہیں بلکہ جملہ اکابرین دیوبند کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور ان کے مزاج اور مذاق کے امین بھی تھے، اور تقریباً ساٹھ سال تک وہ دارالعلوم دیوبند جیسی نامور دینی درس گاہ کے مہتمم اعلیٰ کے منصب پر فائز رہے ہیں۔ اس لیے مدارس کی صورت حال اور ان سے متعلق اصلاحی تدابیر پر حضرت قاری صاحب کی رائے گرامی انتہائی اہمیت کی حامل ہے اور بیس سال کی مدت گزرنے کے باوجود اس انٹرویو کی تازگی، نافعیت اور شفا بخشی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا، بلکہ مدارس کی موجودہ فضا میں اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔

اس انٹرویو کو کیسٹ سے کاغذ پر منتقل کرتے وقت تحریری انداز اختیار کرنے کے بجائے کوشش کی گئی ہے کہ حتی الامکان حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ اور فقرے بعینہ نقل ہوں تا کہ ان کے مفہوم اور تاثر میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔

امید ہے کہ متعلقہ حلقوں میں اسے پوری توجہ سے پڑھا جائے گا اور اساتذہ وتلامذہ اس کی روشنی میں اپنے لیے لائحہ عمل طے کرسکیں گے۔ (واللہ الموفق)

احقر: محمود احمد عثمانی

۵-۵-۱۴۱۵ھ

نصاب تعلیم

س: کیا جناب مدارس کی موجودہ صورتحال سے مطمئن ہیں؟

ج: جہاں تک نصاب کا تعلق ہے وہ تو بالکل قابل اطمینان ہے یہ وہی نصاب ہے جس سے بڑے بڑے اکابر علماء تیار ہوئے، جزوی ترمیم اور تغیر البتہ پہلے بھی ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا، البتہ اصول وہی ہیں جو نہیں بدل سکتے، جیسے صحاح ستہ، قرآن کی تعلیم، باقی جتنے فنون آلیہ ہیں، مبادی ہیں ان میں جزوی طور پر تغیر وتبدل ہوتا رہا ہے۔ نوعی طور پر نصاب وہی باقی رہا، اس لیے جہاں تک نصاب کا تعلق ہے وہ تو بالکل قابل اطمینان ہے۔

طرز تعلیم...... دوسری چیز ہے اصل میں طریقہ تعلیم وہ تھوڑا سا بدل گیا ہے۔ اور میں سمجھ رہا ہوں کہ اس کا اثر استعدادوں پر اچھا نہیں پڑ رہا ہے، وہ یہ کہ قدیم زمانے کے حضرات اساتذہ ایجاز اور اختصار کے ساتھ نفس مطلب عبارت پر منطبق کر کے دلوں میں ایسا ڈال دیتے تھے کہ کتاب ذہن نشین ہو جاتی تھی، اور جب طالب علم نے کتاب دیکھی مطلب سامنے آ گیا، اب لوگ اس مسئلہ کو حیلہ بنا کے اپنی معلومات پیش کرتے ہیں، لمبی لمبی تقریریں، اس سے استعداد خراب ہوتی ہیں، ایک تو یہ فرق پڑ رہا ہے جن سے استعدادیں کمزور ہو رہی ہیں اور دوسری چیز یہ ہے کہ جب سے یہ عوامیت کے نام پر جمہوریت چلی اس میں سارے عوام الناس آزاد ہو گئے، طلبہ بھی بہر حال جوان ہیں، لڑکے ہیں ان پر بھی اثر پڑا، وہ جو عوام کا یا خوردوں (چھوٹوں) کا بزرگوں سے ربط تھا اس میں کمی ہو گئی۔ اس سے علمی قوت میں کمی ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی چیز یہ ہے کہ خورد کا تلمیذ کا تعلق استاذ سے قوی ہو، اس میں ادب بھی ہو، تعظیم بھی ہو، اعتماد کامل بھی ہو، اس میں جتنی کمی پڑے گی، استعداد میں اتنی ہی کمی پڑے گی۔

تو موجودہ حالات کی وجہ سے ایک اخلاقی کمی ہو رہی ہے اور ایک طرز تعلیم کے بدلنے سے نفس تعلیم (اصل تعلیم) میں کمی ہو رہی ہے تو اس کا استعدادوں پر خراب اثر پڑ رہا ہے، باقی جہاں تک نصاب کا تعلق ہے وہ بحمد اللہ قابل اطمینان ہے، اور مدارس میں عامۃً جو بڑے مدارس ہیں ان میں اساتذہ بھی ذی استعداد ہیں اور چھوٹے مدارس میں تو ہر طرح کے ہوتے ہیں۔

معلم کا اثر...... س: بعض حلقوں کی جانب سے کہا جا رہا ہے کہ مدارس کے نصاب میں جدید علوم کو بھی شامل کیا جانا چاہیے، اس کے بارے میں جناب کی کیا رائے ہے؟

ج: یہ ایک حد تک صحیح بھی ہے اور ہم نے اس پر عملدرآمد بھی کر لیا ہے جدید قسم کے جو علوم وفنون جن سے

عقائد کے اوپر اثر پڑ رہا ہے خواہ وہ غلط فہمیوں کی وجہ سے پڑے مگر پڑ رہا ہے۔ جیسے مبادیات سائنس ہیں ،فلسفۂ جدید ہے، ہیئت جدیدہ ہے اس کو لوگ ذریعہ بناتے ہیں دینیات کی تردید کا، حالانکہ وہ ذریعہ ہیں تقویت دین کا، سائنس جتنی بڑھے گی میں سمجھتا ہوں اسلام کو اتنی تقویت ملے گی ،اس لیے کہ اسلام نے عقائد ونظریات کے لحاظ سے جو دعوے کیے ہیں ان کے دلائل سائنس مہیا کر رہی ہے،تو دعویٰ ہم کرتے ہیں مگر دلائل وہ لوگ مہیا کرتے ہیں جو اس کے منکر ہیں، اللہ تعالیٰ انہی کے ہاتھ سے دلائل مہیا کرتے ہیں۔ اس لیے سائنس ''منافی تو کیا ہوئی'' معین ومددگار ہے......خرابی درحقیقت ماحول کی ہے، کیوں کہ اس کے پڑھانے والے وہ ہیں جو غلط نظریات اور غلط فکر لیے ہوئے ہے اس لیے ان فنون کا اثر بڑا برا پڑتا ہے لیکن اگر صحیح پڑھانے والے ہوں ،تو وہی ذریعہ بن جائیں تقویت دین کا....آخر یہ قدیم فلسفہ منطق ہیئت ریاضی پڑھاتے ہیں اس کا برا اثر کیوں نہیں پڑا اور موجودہ فنون کا کیوں پڑ رہا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پڑھانے والے وہ ہیں کہ دین ان میں پہلے سے راسخ ہوتا ہے اس لیے عقائد پر ذرا برابر برا اثر نہیں پڑتا اور موجودہ زمانے میں عموماً پڑھانے والے وہ ہیں کہ نہ ان کی اخلاقی حالت درست، نہ ماحول درست، اس کا اثر برا پڑتا ہے،لوگ سمجھتے ہیں کہ علم کا اثر برا ہے حالانکہ وہ دراصل عالم کا اثر ہے جو برا پڑ رہا ہے ورنہ اسلام میں تنگی نہیں، اسلام نے تو ہر علم وفن کی تحقیق کی اجازت دی ہے سوائے مخصوص چند علوم کے کہ جن سے روکا ہے کیوں کہ وہ علوم نافع نہیں ہے۔ عام طور سے فرمایا گیا ہے: كَلِمَةُ الْحِكْمَةِ ضَآلَّةُ الْحَكِيْمِ حَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا . ① ''کہ حکمت کی بات دانا کی گمشدہ چیز ہے، جب وہ اسے پالے تو وہی اس کا زیادہ حقدار ہے''۔ ان جیسی روایتوں نے بتلایا ہے کہ علم بہرحال جہل سے بہتر ہے۔ سوائے ان علوم کے کہ جو مضر ہیں کہ ان کا عام علم ہی رکھنا فضول ہے کیوں کہ وہ فی الحقیقت ضائع ہیں۔

تو علم کسی بھی فن کا ہو وہ برا اثر نہیں ڈالتا، وہ معلم کا اثر پڑتا ہے۔ معلم اگر صاحب قال، صاحب حال، صاحب اخلاق ہے تو اسی سے اخلاق پیدا کردے گا اور اگر خود بداخلاق ہے، بدفکر ہے تو وہ قرآن وحدیث سے بھی بدفکری ذہن میں ڈالے گا،اس لیے نئے علوم میں سے اگر اس حد تک کے لیے جائیں کہ جس حد تک وہ معین بنتے ہوں دین کے حق میں یا جو ذریعہ بنے ہوئے ہیں دین پر اعتراضات کا تو میں اصولی طور پر سمجھتا ہوں کہ، انہیں ضرور حاصل کرنا چاہیے۔

طلبہ کی اخلاقی حالت ......س: حضرت! ابھی آپ نے طلبہ کی اخلاقی حالت کا ذکر فرمایا ہے تو ہم یہ بات اپنے بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ مدرسہ اور خانقاہ کوئی علیحدہ علیحدہ چیز نہیں ہوتی تھی بلکہ ایک ہی چیز ہے، مدرسہ خانقاہ بھی بنا تھا، طلبہ کو تعلیمی طور پر بھی تعلیم دی جاتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اخلاق بھی درست کیے جاتے تھے،تو اب یہ صورتحال کیوں بدل گئی اور اس کی اصلاح کی کیا تدابیر ہیں؟

ج: یہ چیز بالکل صحیح ہے کہ قدیم زمانہ میں مدرسہ ہی خانقاہ ہوتا تھا جس کے اوپر تعلیم کا پردہ تھا.....نام تو نہیں آتا تھا کہ ہم تصوف سکھلا رہے ہیں یا طریقت سکھلا رہے ہیں، لیکن ان بزرگوں کا طرز عمل، ان کا کردار، کریکٹر وہ

تھا کہ ان کی مجلسوں میں بیٹھ کر خود بخود اخلاق درست ہو جاتے تھے۔ تو اب ظاہر بات ہے کہ کچھ تو اساتذہ میں بھی کمی ہے، اور کمی کی بناء پر جو کچھ بھی ہو، مگر صورتحال یہ ہے کہ عام طور پر اساتذہ کی تکمیل اور تزکیۂ اخلاق کی طرف توجہ نہیں ہے۔ جتنے نئے اساتذہ ہیں ان کی توجہ ادھر نہیں ہے۔

رابطہ کا فقدان...... س: حضرت کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ اساتذہ اور طلبہ کے درمیان اب ربط نہیں رہا؟.....

ج: میں تو سمجھتا ہوں کہ فتن اس کی بنیاد ہیں، حالات اتنے بگڑ چکے اور مزاج اتنے فاسد ہو چکے ہیں کہ وہ جو ایک رجحان اور ایک عقیدت اور ایک محبت اساتذہ سے ہوتی تھی وہ نہیں ہے، کچھ تو حالات کا اثر ہے۔

اور مثل مشہور ہے ''کچھ لوہا کھوٹا، کچھ لوہار کھوٹا'' کی تھوڑی بہت اساتذہ میں بھی آئی ہے، ان کو جس درجہ کا معیاری ہونا چاہیے نئے اساتذہ میں وہ چیز کم ہے تو طلبہ پر اثر پڑنا لازمی ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہ اساتذہ چند سالوں کے بعد پرانے بن کر کسی اونچے مقام پر پہنچ جائیں، لیکن ابتدائی حالت اساتذہ کی، نوجوان اساتذہ کی وہ نہیں ہے جو ان کے اساتذہ کی تھی۔

اساتذۂ کرام کا معیار...... ہم لوگوں نے تعلیم پائی، اس وقت اساتذہ علمی اعتبار سے بھی معیاری تھے اور تقویٰ وطہارت کے لحاظ سے بھی معیاری تھے، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ (مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ) پر اتباع سنت کا اتنا غلبہ تھا کہ ان کے طرز عمل کو دیکھ کر ہم مسئلہ معلوم کر لیتے تھے، اور وہی مسئلہ نکلتا تھا جو ان کا طرز عمل تھا، اس درجہ گویا وہ منہمک تھے اور ہمہ وقت انہیں فکر آخرت ضرور رہتا تھا۔

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دوپہر کو چھوٹی مسجد میں آ کے قیلولہ کرتے تھے تو عموماً گھٹنے پیٹ میں دے کر لیٹا کرتے، یعنی سکڑ کے، یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ پیر پھیلا کے لیٹے ہوں، تو میرے خسر مولوی محمود صاحب رامپوری مرحوم، طالب علمی کے زمانہ میں مفتی صاحب کے ساتھ چھوٹی مسجد ہی میں رہتے تھے تو ابتداء میں وہ یہ سمجھے کہ امر اتفاقی ہے۔ لیکن جب دیکھا کہ عادت ہی یہ ہے تو انہوں نے ایک دن پوچھا کہ آپ پیر پھیلا کے کبھی نہیں سوتے فرمایا کہ ''بھائی پیر پھیلا کے سونے کی جگہ قبر ہے، دنیا نہیں۔'' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اوپر ہر وقت فکر آخرت سوار تھا۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کا واقعہ ہے، جلالین شریف ہم نے ان کے یہاں پڑھی آیت یہ آئی کہ ''لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی'' آدمی کو وہی ملے گا جو اس نے سعی کی ہے، یہ نہیں کہ کسی غیر کی سعی اس کے کام آجائے...... ادھر تو یہ آیت اور ادھر روایت میں ایصال ثواب ثابت، جس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے کی سعی کام آگئی، اب آیت اور روایت میں ایک قسم کا تعارض، جب یہ آیت پہنچی تو حضرت مفتی صاحب نے کتاب میں مثبت پہلو میں مطلب سمجھا دیا اور بعد میں یہ فرمایا کہ میں اس میں الجھا ہوا ہوں اور ابھی رفع تعارض کی صورت سمجھ

① السنن للترمذی، کتاب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقه علی العبادة، ج:۵ ص: ۵۱ رقم: ۲۶۸۷۔

میں نہیں آئی کہ حدیث بتلاتی ہے کہ دوسرے کی سعی کار آمد ہے اور آیت بتلاتی ہے کہ قطعاً کار آمد نہیں، تو فرماتے تھے کہ کتابیں دیکھیں، رجوع کیا کتابوں کی طرف، مگر تشفی نہیں ہوئی، ایک دن گھر تشریف لائے، رات کا وقت، گرمی کا زمانہ، چار پائی پر لیٹے تو خیال یہ بندھ گیا کہ تجھے ایک آیت میں شک ہے، اگر اسی حالت میں موت آ گئی تو آیتِ خداوندی میں شک لے کر جائے گا تو تیرا ایمان کہاں رہے گا؟ یہ تو ''ریب'' کی کیفیت ہے۔ پس یہ جذبہ آنا تھا کہ اسی وقت کھڑے ہو گئے اور پیدل سفر شروع کر دیا گنگوہ کا کہ حضرت (مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ) کے پاس، یہ کہ تحقیق کروں کا پہلا جذبہ تو اس سے معلوم ہوا فکر آخرت کہ وہ (اس علم کو) محض ریسرچ یا تحقیق نہیں سمجھتے تھے بلکہ اپنی آخرت سمجھتے تھے، جب آیت میں ایک قسم کا شک ہے تو وہ ریب ہوا، اور اگر ایمان میں ذرا سا بھی ریب ہو تو ایمان کی بقاء مشکل ہے۔ یہ جذبہ تھا اصل میں محض علمی تحقیقات نہیں تھیں، پیدل سفر کر لیا گنگوہ کا، ساری رات پیدل چلتے رہے، حالانکہ پیدل سفر کرنے کی عادت نہ تھی، آخر شب میں گنگوہ پہنچے، صبح کی نماز کا وقت تھا، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ وضو فرما رہے تھے، انہوں نے سلام کیا فرمایا: کون؟...

عرض کیا کہ عزیز الرحمٰن، فرمایا کہ اس وقت! کیا رات آئے تھے؟ کہا کہ رات بھر سفر کیا بس ابھی پہنچا ہوں، فرمایا ایسی کیا ضرورت پیش آئی جو ساری رات سفر کیا۔ انہوں نے کھڑے کھڑے وہ اشکال پیش کر دیا کہ حضرت، یہ ایک اشکال ہے کہ آیت میں نفی ہے کہ کسی کی سعی کسی کے کام نہیں آئے گی اور احادیث میں اثبات ہے کہ ایک کا عمل دوسرے کے کام آ جائے گا ایصالِ ثواب کی صورت میں۔ یہ تعارض رفع نہیں ہو رہا۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے وہیں کھڑے کھڑے فرمایا کہ ''لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ''۔ میں سعی ایمانی مراد ہے۔ یعنی ایک کا ایمان دوسرے کے کام نہیں آئے گا یعنی نجات کا ذریعہ نہیں بنے گا، عمل کی نفی نہیں، تو حدیث ثابت کر رہی ہے عمل کو کہ عمل کا فائدہ پہنچے گا اور آیت نفی کر رہی ہے سعی ایمانی کی کہ ایک کا ایمان دوسرے کے کام نہیں آئے گا، اس میں کوئی تعارض نہیں تو یہاں ایمان مراد ہے وہاں عمل مراد ہے۔ آیت میں جس چیز کی نفی کی جا رہی ہے حدیث میں اس کا اثبات نہیں اور حدیث جسے ثابت کر رہی ہے قرآن میں اس کی نفی نہیں تو تعارض کہاں سے آ گیا؟......

تو مفتی صاحب یہ کہتے تھے کہ کھڑے کھڑے یہ معلوم ہوا کہ جیسے علم کا ایک دریا میرے اندر سے پھوٹ گیا، تو یہ غزیر (وسیع) اور گہرا علم تھا ان اکابر کے ایک ایک لفظ میں۔

کیا مدارس کا موجودہ نظام بدعت ہے؟......حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت حدیث میں بدعت کی ممانعت فرماتے ہوئے کہا گیا ہے کہ **من احدث فی امرنا هذا ما ليس منه فهو رد.** ① جو ہمارے دین میں احداث کرے اور دین کے ذوق کی چیز نہ ہو تو وہ چیز مردود ہے۔''

① الصحيح لمسلم، كتاب الاقضية، باب نقض احكام الباطلة ورد محدثات الامور ج: ۳ ص: ۳۴۳ رقم: ۱۷۱۸.

اس پہ کسی نے کہا کہ پھر یہ مدارس بھی مردود ہونے چاہئیں، یہ قرن اول میں کہاں تھے؟ اور یہ مدرسوں کے لیے گھنٹوں کا تعین اور گھنٹا بجانا یہ کہاں تھا؟ اور یہ جماعت بندی (کلاس بندی) یہ سارے بدعات ومحدثات ہیں تو حدیث کی رو سے ممنوع ہونے چاہئیں حضرت نے ایک مختصر سا جواب دیا، فرمایا کہ: ''اِحْدَاثٌ فِی الدِّیْنِ کی ممانعت ہے، ''اِحْدَاثٌ لِلدِّیْنِ کی ممانعت نہیں'' ان دولفظوں میں (مسئلہ) کھول دیا، یعنی یہ احداث جو ہے، لِتَقْوِیَةِ الدِّیْنِ، لِاِعَانَةِ الدِّیْنِ، لِنُصْرَةِ الدِّیْنِ '' ہے عین دین کے اندر اضافہ نہیں ہے کسی مدرسہ میں صبح کے گھنٹے مقرر ہیں کسی میں شام کے، یہ نہیں ہے کہ اس کو دین سمجھ رہے ہیں کہ یہی چار گھنٹے ہونے چاہئیں، دوسرے نہ ہوں۔ ایک تدبیر ہے، ایک معالجہ ہے، تو احداث للدین اور فی الدین کے فرق سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے سارے اشکالات رفع فرمادیئے۔

اکابر کے علوم کی گہرائی جس کا اب فقدان ہے...... اسی پر مجھے یاد آیا کہ مولانا شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں کوئی عرب ہندوستان پہنچ گئے، تو ہندوستان میں عربوں کی آمد و رفت اس زمانہ میں نہیں تھی، کوئی عرب آ گیا تو لوگ چیلوں کی طرح سے اس کے پیچھے دوڑتے تھے کہ عرب صاحب، عرب صاحب! اور عقیدت ومحبت سے ہر ممکن طرح مدارت کرتے تھے، ان عرب صاحب کا بھی خیر مقدم ہوا، شافعی تھے، اتفاق سے کسی مسجد میں جہاں سارے جاہل جمع تھے، انہوں نے نماز پڑھی اور رفع یدین کیا جیسا شوافع کرتے ہیں، وہاں سارے جاہل جمع تھے، وہ سمجھے کوئی بددین ہے اسے نماز پڑھنی نہیں آتی، تو نماز کے بعد تو تو میں میں شروع ہوئی حتیٰ کہ ان عرب پر ہاتھ ڈالا اور انہیں پیٹ دیا اب وہ مہمان تھے، مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ کو خبر ہوئی ہے، غصہ آیا، فرمایا کہ اول تو زدوکوب! پھر عرب سے آیا ہوا مہمان جو واجب التعظیم ہے، حکم دیا کہ آج سے ہماری ساری مسجدوں میں رفع یدین ہوا کرے گا، ترک رفع ختم، اب صاحب، تمام مسجدوں میں رفع یدین شروع ہو گیا، کئی دن گذرے تو کہیں رفع یدین اور کہیں ترک رفع، ایک عجیب فتنہ بپا ہوا۔ (ہنس کر فرمایا) اور حقیقی معنی میں رفع یدین شروع ہو گیا، ہاتھا پائی، مارکٹائی میں بھی رفع یدین ہی ہوتا ہے۔ غرض بہت فتنہ ہوا تو لوگ گئے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کہ حضرت! وہ آپ کے بھتیجے نے بڑا فتنہ برپا کر دیا اور حکم دے دیا ہے کہ ہر مسجد میں رفع یدین ہوگا تو بڑی مصیبت ہو گئی اور فتنہ پھیل گیا ہے، آپ انہیں سمجھائیں۔

شاہ صاحب نے فرمایا کہ بھائی! اسمٰعیل کی ذہانت اور ذکاوت سے تم واقف ہو، وہ میرے سے زیر نہیں ہو سکے گا، وہ ذہین اور طباع ہے، میں ایک چیز بیان کروں گا وہ بیس احتمال نکال کر مجھے ہی بند کر دے گا، خود اس کی اصلاح کیا ہو گی۔ اس کی مناسب صورت یہ ہے کہ خاندان میں شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سب عظمت کرتے ہیں، چھوٹے اور بڑے، حالانکہ وہ سب سے چھوٹے بھائی تھے، مگر بڑے بھائی بھی ان کے تقویٰ اور طہارت کی وجہ سے ان کی عظمت کرتے تھے، چالیس برس اعتکاف کیا ہے اکبری مسجد میں اور سوائے قرآن کے اور

کوئی شغل نہیں تھا، اور جس دن ان کی وفات ہوئی ہے تو شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر منکشف ہوا کہ دلی کے سارے قبرستانوں سے آج عذاب قبر اٹھالیا گیا ہے، ان کی آمد کے احترام میں، تو اس درجہ کے تھے شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

تو شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے لوگوں نے کہا کہ آپ کے بھتیجے نے فتنہ برپا کر دیا ہے، کہا بلاؤ اسمٰعیل کو۔ خیر مولانا اسمٰعیل شہید حاضر ہوئے، فرمایا: میاں اسمٰعیل! تم نے حکم دیا ہے کہ رفع یدین ہوا کرے؟ کہا جی حضرت! فرمایا کیوں؟ کہا حضرت یہ سنت اتنی مردہ ہوچکی تھی کہ اس کے عمل درآمد کرنے پر لوگ پیٹے جانے لگےاور حدیث میں ہے: مَنْ اَحْیَا سُنَّتِیْ عِنْدَ فَسَادِ اُمَّتِیْ فَلَهٗ اَجْرُ مِائَةِ شَهِیْدٍ. (1) جس نے میری امت کے فساد کے وقت میری سنت کو زندہ کیا تو اسے سو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔ تو میں نے احیائے سنت کیا ہے، اس درجہ مردہ ہوگئی یہ سنت کہ عمل کرنے پر لوگ مارے پیٹے جانے لگے، اس لیے میں نے حکم دیا کہ یہ سنت زیرعمل آجائے۔ فرمایا کہ میاں اسمٰعیل! ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ تم نے حدیث کچھ سمجھ کر پڑھی ہوگی، تمہیں تو مس بھی نہیں فہم حدیث سے، کیا مطلب ہے احیاءِ سنت کا؟

فرمایا کہ احیاءِ سنت کا مطلب یہ ہے کہ سنت ختم ہوکر بدعت اس کی جگہ لے لے گا، وہ احیاءِ سنت ہے جو مائۃ شہید کے برابر ہے، اور یہاں تو سنت کے مقابلہ میں خود سنت موجود ہے، رفع یدین اگر سنت ہے تو ترک رفع بھی سنت ہے اگر ایک امام ادھر گیا ہوا ہے، ایک ادھر، احیاءِ سنت کا یہ موقعہ کون سا ہے؟ احیاءِ سنت وہاں ہے کہ سنت ختم ہو اور بدعت اس کی جگہ آجائے، یہاں کون سی بدعت ہے؟ کہا حضرت! مجھ سے غلطی ہوئی، پھر ساری مسجدوں میں خود کہتے پھر رہے تھے کہ مجھ سے غلطی ہوئی، لوگ اسی طرح ترک رفع کے ساتھ نماز پڑھیں...

تو یہ بات مجھے اس پر یاد آئی تھی کہ ان اکابر کے یہاں لمبی تقریریں نہیں ہوتی تھیں ایک جملہ سے مسائل کا فیصلہ ہوتا تھا اور یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ استعداد نہایت قوی اور استحضار ہو علوم کا......... اب محنتیں تو ہیں نہیں قوی بھی ویسے نہیں، استحضار وہ نہیں ہے علوم کا، جو کچھ کتاب میں دیکھا وہ صبح کو بیان کر دیا، وہ نقل اور سرد روایت ہوتا ہے جو وہ قلبی کیفیت ہے وہ شامل نہیں ہوتی، اس لیے استعدادوں پر برا اثر پڑا ہے، تو نہ تو نصاب میں خرابی ہے اور نہ کسی اور چیز میں، بلکہ کچھ طرز تعلیم کی، اور کچھ اساتذہ کے ترقی نہ کرنے کی، کہ وہ پڑھ رہے ہیں کہ بس پڑھا دیں گے، پیشہ سا سمجھ لیا ہے، یہ وجہ ہو رہی ہے استعدادوں کی کمی کی۔

طلبہ کی سیاسیات میں شرکت کے آثار...... اور ادھر طلبہ، کہ ملک کے حالات جمہوریت کے نام پر ایسے ہوگئے ہیں کہ وہ جو یکسوئی تھی وہ باطل ہوگئی، ہر طالب علم کو فکر کہ تھوڑا سا سیاسیات میں شریک ہو اور تھوڑا سا اجتماعیات میں۔ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: "اَلْعِلْمُ لَا یُعْطِیْکَ بَعْضَهٗ حَتّٰی تُعْطِیَهٗ

(1) المعجم الاوسط للطبرانی، باب المیم، من اسمه: محمد ج: ۱۲ ص: ۱۵۰.

کُــلَّکَ ‘‘ علم اپنا بعض اس وقت تک نہیں دے گا جب تک تم اپنا کل اسے نہ دے ڈالو، اب تو تم جز ودو اور اس کا کل لینا چاہو تو یہ ہوگا کیسے تو طالب علم کہیں ادھر متوجہ، کہیں ادھر متوجہ، کہیں معاش اور کیا کیا، اسی میں ضمناً اس نے علم کی طرف بھی توجہ کرلی تو استعداد بنے گی کہاں سے؟.....

اس لیے میں نے عرض کیا کہ ’’ کچھ لوہا کھوٹا کچھ لوہار کھوٹا‘‘ کچھ اساتذہ آگے نہیں بڑھنا چاہتے ، کچھ طالب علموں میں محنت کی کمی ،اب وہ قصور بتادیتے ہیں نصاب کا ......حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب ہمارے استاذ رحمۃ اللہ علیہ بہت مختصر گو تھے، کسی نے ان سے ذکر کیا کہ حضرت !نصاب میں کچھ تغیر تبدل ہونا چاہیے،تو جیسے ان کی عادت تھی ،ایک لمبی سی ’’ہوں‘‘ کرکے فرمایا: دیکھو تعلیم کے سلسلہ میں تین چیزیں ہیں ۔ 1 ایک اساتذہ 2 ایک تلامذہ 3 ایک نصاب تعلیم تو اساتذہ کی جماعت تو ہے بڑوں کی جماعت ، چھڑی ہاتھ میں،کوئی بولے تو اس وقت گردن زدنی قرار پائے اور طلبہ اس زمانے کے، بھائی وہ بھڑوں کا چھتہ ہیں،کوئی انہیں چھیڑے گا تو وہ آکے لپٹ جائیں گے،آدمی ڈرتا ہے،بس صاحب اب بے چارہ بے زبان نصاب رہ گیا ہے،اسی میں کتر بیونت کرتے رہو، نصاب میں یہ کمی ہے، یہ کمی ہے۔

کمی ہے استاد میں اور طالب علم میں، نصاب میں کمی نہیں ہے، مگر بے زبان چیز ہے،اسی پر سب مشق آزمائی کرتے رہتے ہیں،تو یہ ہے اصل میں بنیاد.....بہرحال کچھ جدید معلومات کی تو ضرورت ہے کہ طلباء نابلد نہ رہیں۔

فکر معاش نے علمی ترقی روک دی ......س: حضرت !تیسرا سوال یہ تھا کہ محسوس یہ کیا جارہا ہے کہ جو طلباء مدارس سے فارغ ہوتے ہیں ان میں کام کرنے کا وہ جذبہ نہیں جو پہلے موجود ہوتا تھا باطل سے ٹکرانے ،خود اعتمادی اور خود آگے بڑھ کر کام کرنے کی جو صلاحیت تھی وہ اب نظر نہیں آتی ،اس کی کیا وجوہات ہیں؟

ج: اول تو یہ ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے: اَلنَّاسُ کَابِلٍ مِائَةٍ لَاتَکَادُ تَجِدُ فِيْهَا رَاحِلَةً. ①
سو اونٹوں کی ایک جماعت ہے، دانتوں ہیں سارے،تو سواری کے قابل ایک ہی نکلتا ہے۔

تو ان پچاس ہزار طلبہ میں یہ تو ناممکن ہے کہ کوئی جوہر قابل نہ ہو،لیکن سو میں سے ایک آدھ نکلے گا تو وہ نہ ہونے کے برابر دکھائی دے گا تو اب بھی ایسے نکلتے ہیں جو اپنی استعداد پر کام کرتے ہیں ،لیکن ہمارے سامنے چونکہ وہ ننانوے ہیں جو اپاہج بن کر پھوہڑ رہتے ہیں،تو ان کی قدر ومنزلت بھی جاتی رہتی ہے جو کام کرنے والے ہیں،مگر ہیں ،اگر نہیں ہیں تو اس وقت (دین کا) یہ کام کیسے چل رہا ہے، بحثیں بھی ہیں، مناظرے بھی ہیں، باطل پرستوں کا مقابلہ بھی ہے،لوگ کام کررہے ہیں اور اس میں نوجوان بھی کرنے والے ہیں،مگر بہت کم ہیں، گنے چنے۔

زیادہ تر اس کی بنا یہ ہے کہ معاشی حالات ایسے کمزور ہو چکے ہیں کہ طالب علم کو پڑھنے کے زمانے میں فکر یہ

---

① الصحیح لمسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب قول النبی ﷺ الناس کابل مائة لاتجد فیها راحلة ج:۴ ص:۱۹۷۳ رقم:۲۵۴۷.

ہے کہ جلدی سے پڑھوں تاکہ گھر کا بندوبست کرسکوں باپ ضعیف ہوگیا، ماں کا انتقال ہوگیا، فلاں گزر گیا، چار پیسے کماؤں تو بچوں کو کھلاؤں، فکر تو یہ رہتی ہے تو وہ ترقی کہاں سے کرے؟ اکثر و بیشتر اسی میں مبتلا ہیں۔

پست فکر بھی علمی ترقی نہیں کرسکتا...... اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ان مدارس میں آنے والے بلند فکر کم ہیں، زیادہ تر وہ ہیں جن کی فکر کی حالتیں پست ہیں، انہوں نے دیکھا کہ روٹیاں ادھر بھی ملتی ہیں آٹھ نو برس یہاں کچھ مل جائے گا۔ وہ نصاب پر عبور تو کرلیتے ہیں مگر جتنی دماغ کی افتاد ہے، ساخت ہے اس سے باہر تو نہیں جاسکتے، وہ جو، ان کی پست فکری ہے وہ علم کو بھی پست بنادیتی ہے۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ فرمایا کہ میں بتلاؤں کہ اس علم کی ذلت کا کون سا وقت ہوگا؟ عرض کیا گیا، فرمایئے فرمایا کہ جب اراذل ناس اس کو حاصل کرنے لگیں جو خود پست ہیں اور پست فکر ہیں، وہ جب عمل کی طرف متوجہ ہوں گے تو ان کی پستی علم میں نمایاں ہوگی اور علم بھی پست نظر آئے گا، ورنہ بلند فکر اور اونچے طبقہ کے لوگ اگر علم حاصل کریں تو وہ آج بھی وہ کام کریں گے جو پچھلے کرتے تھے۔

علم کوئی نئی چیز نہیں پیدا کرتا، پیدا شدہ بلندیوں کو اونچا کردیتا ہے......س: حضرت! جو بلند فکر ہیں اور اچھی سمجھ والے ہیں اور اونچے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں وہ اپنے بچوں کو ادھر نہیں بھیجتے، ان طلبہ کے حاصل کرنے کی کیا صورت ہے......؟

ج: بات یہ ہے کہ دنیا غالب آچکی ہے، پہلے فکر آخرت غالب تھی اب جو بلند فکر ہیں وہ یہ چاہتے ہیں حکومت میں کرسی ملے، عہدہ ملے، وہ سارے ادھر متوجہ ہیں، ادھر آتے ہیں کم، ادھر وہ لوگ آتے ہیں جو ادھر کی استعداد نہیں رکھتے انہوں نے سوچا کہ چلو دین ہی استعداد بناؤ، مدارس میں تو بھائی دین ہے جو آئے گا ہم سکھادیں گے، وہ جس درجہ کا بھی ہے، لیکن سلف کے زمانہ میں پرکھتے تھے کہ اسے کس علم سے مناسبت ہے، جس فن سے مناسبت ہوتی تھی اس میں ترقی دیتے تھے تو وہ طبعی رفتار ہوتی تھی اس لیے اس علم و فن کے اندر وہ ماہر ہوجاتے تھے۔

میں جب افغانستان گیا تو سردار نعیم وزیر معارف (تعلیم) تھے، انہوں نے مجھ سے شکایت کی کہ صاحب، ہم نے یہ کیا، ہم نے وہ کیا، مگر ہماری تمنائیں پوری نہیں ہوتیں، میں نے کہا صاحب! وہ کیا؟

انہوں نے کہا کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کسی عالم دین کو وزیر خارجہ بنائیں، وزیر داخلہ بنائیں، وہ چلتا نہیں۔

میں نے کہا کہ اس کا جواب تو میں بعد میں دوں گا لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کی یہ تمنا کبھی پوری نہیں ہوگی۔ میں نے جواب میں دوسری لائن اختیار کی ورنہ سیدھا جواب یہ تھا کہ بھائی آج کل کی سیاست تو مستقل فن ہے، جو اسے حاصل کرے گا وہ چلے گا، مگر میں نے یہ جواب اختیار نہیں کیا،...... میں نے کہا آپ کی یہ تمنا میرے خیال میں کبھی پوری نہیں ہوگی۔ ''کیوں؟'' میں نے کہا اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ جو افغانستان سے طلبہ بھیجتے ہیں وہ معلوم نہیں کون سے جنگل سے پکڑ کے بھیجتے ہیں، کھٹل دماغ کے، کہ دس برس چاہئیں ان کا ذہن بدلنے کے لیے پھر دس

برس چاہئیں انہیں پڑھانے کے لیے، اگر آپ وزارت کے خاندان، شاہی خاندان اور شاہی کنبہ کے افراد بھیجتے تو ہم آپ کو دکھلاتے کہ علم کیا چیز ہے؟ اب آپ نے جنگل سے پکڑ کر بھیج دیئے جنگلی اور پہاڑی لوگ، ان پر علم کیا اثر کرے گا؟ صدر عالم کہنے لگے۔ جناب مولانا حق می فرمائید، حق می فرمائید۔

اس کے بعد میں نے کہا، میں مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ مفتی کفایت اللہ صاحب کیسے ہیں آپ کی نظر میں؟ کہنے لگے نہایت بلند فکر اور ہندوستان میں انہوں نے وہ وہ کام کیا، میں نے کہا کہ وہ دارالعلوم کے فاضل ہیں کسی یونیورسٹی سے گریجویٹ نہیں. میں نے کہا کہ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کیسے ہیں؟ کہنے لگا سبحان اللہ! بہت اونچا مقام ہے، میں نے کہا دارالعلوم کے طالب علم ہیں کسی یونیورسٹی کے فاضل نہیں ہیں. مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ جو پاکستان چلے گئے؟ کہنے لگے نہایت بلند فکر ہیں میں نے کہا وہ کسی یونیورسٹی کے گریجویٹ نہیں، میں نے دس بیس نام گنوا دیئے تو میں نے کہا کہ یہ لوگ بلند فکر تھے، تو علم نے ان کی فکر کو اور زیادہ بلند کر دیا، تو علم کوئی نئی چیز پیدا نہیں کرتا، جو پیدہ شدہ چیز ہے انہیں اجاگر کر دیتا ہے...... اب اگر کسی میں پستیاں ہی بھری ہوئی ہوں۔ وہ اجاگر ہو جائیں گی بلندیاں بھری ہوئی ہوں وہ اجاگر ہو جائیں گی، علم کوئی نئی چیز پیدا نہیں کرے گا، تو صدر عالم نے کہا بالکل حق بات ہے۔

اور اس کے بعد کہنے لگے کہ اب ہم وعدہ کرتے ہیں کہ شاہی گروپ اور وزارتی گروپ کے ہر سال گیارہ طلبہ بھیجیں گے، میں نے کہا پھر ہم آپ کو دکھلائیں گے کہ ان پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

مگر اب مجھے فکر یہ ہوئی کہ وہ جو بادشاہی خاندان کے آئیں گے ان کی خادمی کون کرے گا؟ ان کا تمدن، ان کی معاشرت علیحدہ اور یہاں غریب طلبہ کی جگہ ہے تو ان کی مہمانداری کے لیے سینکڑوں روپیہ چاہئے، کوئی وزیر کا بیٹا ہوگا کوئی بادشاہ کا بیٹا...... یہ فکر پڑی تو میں نے یہ فقرہ کہا کہ ہم ان کو اپنے خرچ پر تعلیم دیں گے؟ کہنے لگے نہیں نہیں آپ کو خرچ اٹھانے کی ضرورت نہیں حکومت برداشت کرے گی۔ مین نے دل میں کہا اور مجھے کیا چاہیے تھا میں نے اسی لیے کہا تھا...... اس کے بعد میں نے کہا نہایت مبارک خیال ہے، ہم ان کو تعلیم دیں گے اب ہماری ایک اور درخواست ہے، گیارہ لڑکے ہم آپ کے یہاں بھیجیں گے، اس لیے کہ آپ کے یہاں مختلف زبانوں کے مختلف کالج ہیں، افغانستان میں نجات کالج خالص جرمنی زبان کا کالج ہے، استقلال کالج یہ خالصی فرانسیسی زبان کا کالج ہے، کاکول پے طب یہ خالص ترکی زبان کا کالج ہے، اور انگریزی زبان کا مستقل کالج ہے، تو میں نے کہا ہم یہ چاہتے ہیں کہ جب مبلغ تیار ہوں تو غیر ممالک میں جا کر تبلیغ کریں مگر زبان سے عاجز ہیں آپ کے یہاں کالج ہیں تو گیارہ لڑکے آپ بھیجیں گے اور گیارہ لڑکے ہم بھیجیں گے آپ انہیں زبان سکھلائیں گے، کہنے لگے ہم مستقل بندوبست کریں گے اور اپنے خرچ پر تعلیم دیں گے اور نصاب بھی مختصر مقرر کر دیں گے کہ زیادہ وقت بھی نہ لگے اور زبان میں مہارت پیدا ہو جائے، یہ ہمارا اور ان کا معاہدہ ہو گیا مگر وہ جنگ چھڑ گئی تو سب الٹ پلٹ ہو گیا۔

طبعاً ہی فکری قوت کمزور ہوتو اس کا کوئی علاج نہیں ......تو بات مجھے اس بات پر یاد آئی تھی کہ ذی استعداد تو پیدا ہوتے ہیں مگر استعداد ہی گھٹی ہوئی ہوتو اس کا کیا علاج ،فکری طاقت ہی کمزور ہوتو اس کا کوئی علاج نہیں ،تو زیادہ تر وہ آتے ہیں جو فکر کے پست ہیں ،اور جو بلند فکر ہے وہ ہزار میں ایک دو آتا ہے مگر جو آجائے تو وہ بلند ہو کر چل پڑتا ہے ۔جیسے حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خِيَارُكُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُكُمْ فِي الْإِسْلَامِ. ① ”جو جاہلیت میں اونچا تھا وہ اسلام میں بھی آکر اونچا رہے گا“ ۔جو وہاں نیچا تھا وہ یہاں بھی پست رہے گا ،دین سب میں آجائے گا ،مگر بلند فکری وہ خلقی چیز ہے ،یہی صورت یہاں بھی ہو رہی ہے ،اب سوائے اس کے کہ لوگ محنت کریں ،وعظ اور ترغیب ترہیب سے ہوتا نہیں ،آپ لاکھ وعظ کریں کہ بھائی تم آؤ نہیں آئیں گے ،ایسی تدابیر اختیار کی جائیں کہ وہ مجبور ہو کر علم دین سیکھنے کے لیے آئیں اور ادھر جھلکیں جیسے عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے کیا تھا۔

فضلاء کرام کی اپنی مادرِ علمی سے وابستگی کی ضرورت...... عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں عام طور سے علماء بے چارے بے کس تھے ،کوئی پوچھنے والا نہیں تھا ،لوگ دنیا داری کی طرف ،عہدوں کی طرف متوجہ ہو گئے تو علم دین کوئی حاصل نہیں کرتا تھا ،حکومت کے عہدے اور اقتدار نگاہوں میں تھے ،رہ گئے بے چارے علماء۔ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ چونکہ خود عالم تھے ،انہیں احساس ہوا ،انہوں نے نہ ایک فرمان جاری کیا نہ کوئی نصیحت نامہ لکھا ،ایک دن حکم دیا کہ ہم وضوء کریں گے ،فلاں والی ملک ہمیں وضو کرائے ۔تو ان صاحب نے سات سلام کئے کہ بڑی عزت افزائی ہوئی ،بادشاہ کو وضوء کرائیں گے ،وہ آفتابہ لے کر پہنچے۔ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ،وضو میں کتنی سنتیں ہیں؟ واجبات کتنے ہیں؟ اب انہوں نے کبھی وضو کیا ہو تو بتائیں ،عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا. حیرت ہے ،آپ ایک بڑے والی ملک ہیں ،ہزاروں پر حکمرانی کر رہے ہیں اور مسلمان ہیں آپ کو یہ پتہ نہیں کہ وضو میں فرائض کتنے ہیں۔؟ بس صاحب اتنا ان سے کہہ دیا...... اگلے دن کہا فلاں امیر ہمارے ساتھ روزہ افطار کریں ،وہ افطار میں شریک ہوئے تو اورنگ زیب نے کہا روزہ میں مفسدات کتنے ہیں؟ مکروہات کتنے ہیں؟ انہیں کچھ پتا نہیں ،تو کہا بڑے افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں کے والی اور تمہیں یہ پتہ نہیں؟......

کسی سے کچھ اور پوچھا ،نتیجہ یہ ہوا کہ اب مولویوں کی تلاش شروع ہوگئی کہ مسئلے معلوم کرو ،اگر بادشاہ سلامت یونہی پوچھتے رہے تو بڑی تذلیل ہو جائے گی ہماری ،صاحب مولوی کسی قیمت پر نہیں ملتے ،مولویوں نے نخرے شروع کر دیئے صاحب ہم پانچ سو سے کم تنخواہ نہیں لیں گے ،ایک نے کہا ہزار سے کم نہیں لیں گے انہوں نے کہا کہ بھائی دو ہزار دیں گے مگر تم آؤ تو ،سارے مولوی لگ گئے ،تو وعظ وتلقین سے کچھ نہ ہوتا ،تدبیر تھی ارباب اقتدار کی ،تو اگر کوئی صورت ایسی بن جائے کہ حکومت ادھر توجہ کر کے ایسے قوانین بنا دے کہ وہ مجبور ہو جائیں تب تو چلے گی یہ بات ،محض وعظ ونصیحت سے نہیں چلے گی۔

---

① الصحيح للبخاري، كتاب احاديث الانبياء، باب ام كنتم شهداء ج:٣ ص:١٢٣٥ رقم:٣١٩٤.

حکومت کی ادنیٰ توجہ سے اونچی سوسائٹی کے لوگوں میں دین آسکتا ہے......س: حضرت جو طلبہ دینی مدارس سے نکلتے ہیں وہ نکلنے کے بعد متفرق ہو جاتے ہیں، متفرق ہو کر اپنی اپنی جگہ کام میں لگتے ہیں، بعض دینی کام میں لگ جاتے ہیں بعض دنیوی مشاغل میں مصروف ہو جاتے ہیں، جو دینی کام کرتے ہیں وہ بھی متفرق طور پر کرتے ہیں کیا کوئی ایسی صورت نہیں ہو سکتی کہ ہر مدرسہ سے جو طلبہ نکلیں وہ ایک خاص نظام کے تحت اجتماعی طور پر کام کریں؟ اور مدرسہ کی طرف سے انہیں وقتاً فوقتاً ہدایات ملتی رہیں، جو مختلف مسائل ملک میں پیش آتے رہیں، ان کے بارے میں مدرسہ کی جانب سے، مدرسہ کے اکابر کی جانب سے ان کو ہدایات جاری ہوتی رہیں اس طرح وہ سارا کا سارا نظام لگا بندھا ہوگا، اور اس سے یہ فائدہ بھی نظر آتا ہے کہ وہ طلبہ اپنے مستقبل سے بھی مایوس نہ ہوں گے جب وہ ایک نظام کے تحت ہوں گے تو ان کی مدد بھی کی جا سکتی ہے۔ انہیں مساجد و مدارس میں بھی کام میں لگایا جا سکتا ہے اور دوسرے کاموں میں بھی، اس تجویز کے بارے میں جناب کی رائے کیا ہے؟...

ج: یہ صحیح ہے ایسا ہونا بھی چاہیے مگر کس طرح سے ہو؟ دو ہی قوتیں ہیں جن سے کسی ایک مرکز پر جمع کیا جا سکتا ہے، ایک تو قوت قہری کہ اقتدار ہاتھ میں ہو اور آپ ملک بھر میں کسی کو نمٹنے نہ دیں، حکمرانی کی قوت ہو تو یہ قہری قوت ہے۔ ایک قوت ارادت ہے کہ عقیدت مندی کسی شخصیت سے اتنی ہو کہ وہ اشارہ کرے تو سب اس کے اشارے پر چل پڑیں، اس وقت دونوں چیزوں کی کمی ہے ایک کا تو فقدان ہے، قوت قہری تو ہے نہیں آپ کے ہاتھوں میں، اب رہ گئی قوت ارادت اور قوت عقیدت اس میں خال خال افراد ملتے ہیں، بعض تو وہ ہیں کہ مدارس سے تعلق نہیں، شخصی طور پر لوگ ان کے عقیدت مند ہیں اور مدارس میں بھی ہیں ایسے لوگ مگر خال خال......تو جب تک کہ کوئی قوت نہ ہو جو مرکز سے ہٹنے نہ دے، خواہ قوت معنوی ہو یا مادی، اس کے بغیر یہ کام نہیں چل سکتا۔ آپ کے یہاں (یعنی پاکستان میں) جو کام شروع کیا گیا وفاق المدارس میں اس کی کیا صورت ہے؟...

س: وہ تو تمام مدارس کا ایک مجتمع نظام ہے، میری مراد یہ ہے کہ ہر مدرسہ اپنے طرز پر ایک نظام بنا دے کہ اس کے مدرسہ سے جو طلبہ فارغ ہوں وہ لگے بندھے نظام کے تحت اپنے مدرسہ سے وابستہ ہوں۔

ج: یہ فی الجملہ آسان ہے...... بہ نسبت اس کے سارے مدارس ایک نقطہ پر آئیں، وہ تو مشکل ہے مگر سوائے اس کے کہ تحریک کی جائے اور کیا ہو سکتا ہے؟ اس کی طرف توجہ دی جائے، اور اس کے فوائد و منافع ہیں، انہیں قلمبند کر کے انہیں سامنے رکھا جائے، جو مضرتیں پہنچ رہی ہیں وہ دکھلائی جائیں......

اور اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ان کی خیر خواہی کر رہے ہیں، اپنی غرض پیش نہیں کر رہے ہے کہ اگر تم نے اس طرح طلبہ کو مربوط کر لیا تو تمہارا وقار اس میں بلند ہوگا، تمہاری ہی قوت اس میں زیادہ ہوگی...... یہ تجویز ٹھیک ہے، توجہ دلائی جائے اور ذمہ داروں کو متوجہ کیا جائے......اب آج کل یہ دستور ہو گیا ہے کہ جو تجویز ہو پہلے عوام کو متوجہ کیا جائے، خواص جن کے ہاتھ میں عوام ہیں انہیں توجہ دلائی جائے، عوام خود بخود آ جائیں گے، مدارس کے لوگ ہیں یا

با اثر شخصیتیں ہیں ان کو جمع کر کے تحریک کی جائے۔

اکابر کے خواب کی تعبیر......س: حضرت! یہ تو مدارس سے متعلق چند سوالات تھے، اب مسلمانوں سے متعلق دو سوال، ایک تو یہ کہ سرزمین پاکستان میں قادیانیوں سے متعلق قرارداد (اسمبلی میں) پاس کی گئی ہے، اس کے متعلق جناب کی کیا رائے ہے اور جناب کا کیا تبصرہ ہے؟

ج: ہم اس بارے میں بیان جاری کر چکے ہیں اور اس میں بہت زیادہ سراہا گیا وہاں کے علماء کو بھی اور حکومت کو بھی۔ یہ بہت بڑا جرأت مندانہ اقدام ہے، جو حکومت پاکستان نے کیا اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ تو ہمارے بزرگوں ہی کا خواب تھا جس کی تعبیر ملی ہے۔ یہی جذبہ رکھتے تھے حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کہ کسی طرح سے یہ التباس ختم ہو کہ یہ مسلم نام سے کام کر رہے ہیں، یہ تلبیس ہے، مگر انگریزوں کا زمانہ تھا، انہیں غیر مسلم کیسے قرار دیا جائے، تو اللہ نے اب آ کر یہ خواب پورا کیا۔ ادھر تو مڈل ایسٹ کی ۳۲، انجمنوں نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ داخل ہی نہیں ہو سکتے اور ادھر پاکستان نے اس کے اوپر مہر کر دی، تو یہ عالمگیر مسئلہ بن گیا اور وہ جو ایک تلبیس اور التباس تھا وہ ختم ہو گیا۔

اب رہیں قادیانی دنیا میں ہزاروں باطل فرقے ہوئے ہیں۔ لیکن اسلام کے نام پر کام نہیں کر سکتے، تو میں نے پاکستانی اسمبلی کی قرارداد کی تائید میں بیان دیا پھر کلکتہ اور متعدد جگہوں سے خطوط آئے کہ اس کا اثر یہ ہوا کہ بہت جگہوں میں لوگوں نے کہا کہ پھر یہ ہمارے قبرستانوں میں کیوں دفن ہوں، مسلم کو کافر سے کیا تعلق؟ تو مسلمانوں میں یہ چیز پیدا ہو رہی ہے کہ پھر قادیانی ہمارے قبرستانوں میں دفن نہیں ہو سکتے۔ مگر قبرستانوں کی تولیت ہے گورنمنٹ کے ہاتھ میں تو یہ روک نہیں سکتے، تو اب مسلمانوں میں یہ جذبہ ہے کہ ہم حکومت سے لڑیں گے، مطالبہ کریں گے اور فتاویٰ بھی دکھائیں گے کہ قبرستان میں حصے الگ الگ کر دو، ان کا خط الگ متعین کرو، ہم اپنے پاس دفن نہیں کریں گے ......اور بھی بہت سے مسائل سامنے آئے مثلاً پہلے قادیانی مسلمانوں کی مساجد میں آجاتے تھے، بہر حال اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی سو کے قریب قادیانی تائب ہو گئے ...... مجھے وہاں کے لوگوں نے لکھا تھا کہ ہم چاہتے ہیں کہ ایک سوسائٹی قائم کریں جس کے ذریعہ ان قادیانیوں کے شکوک وشبہات رفع کریں جو اسلام کی طرف مائل ہو رہے ہیں اور ادھر آنا چاہتے ہیں، تو میں نے انہیں لکھا تھا کہ سوسائٹی ضرور قائم کرو لیکن جماعتی طور پر یا مجمعوں میں رفع شکوک کا کوئی سلسلہ ہرگز نہ قائم کیا جائے، اس میں تلبیس ہے، وہ یہ چاہتے ہیں کہ جب مجمع ہوں گے، شکوک پیش کئے جائیں گے تو رد وکد میں اور بحث ومناظرہ میں انہیں رستہ نکل آئے گا پیر رکھنے کا...... ہاں انفرادی طور پر رفع شکوک کرو، لیکن مجالس عامہ منعقد ہوں رفع شکوک کرنے کے لیے تو یہ ہرگز نہ کیا جائے، اس بات کو انہوں نے مانا بہر حال اس کا (پاکستان اسمبلی کی قرارداد کا) بہت ہی اچھا اثر پڑا ہے۔ ہندوستان

پرلیا..... حضرت حکیم الاسلام قدس سرہٗ العزیز سے یہ انٹرویو محترم مولانا محمود اشرف عثمانی نے لیا، مرتب خطبات نے عنوانات کے اضافے اور ان کے شکریہ کے ساتھ خطبات کی زینت بنادیا۔

(از مرتب غفرلنا)

(بمقام مدینہ منورہ ۱۹۷۴)

صدیق حمیم

ورفیق قدیم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ

''البلاغ'' کا ''مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ نمبر'' ایک مدت تک حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے مضمون کے انتظار میں روکا رہا، خیال یہ تھا کہ آپ کی تحریر کے بغیر حضرت مفتیٔ اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ نہایت تشنہ و نا تمام رہے گا، بالآخر جب حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی غیر معمولی مصروفیات کی بناء پر مضمون ملنے سے ناامیدی ہوئی تو حضرت کی سابقہ تحریروں سے ایک مضمون مرتب کر کے نمبر میں شامل کر دیا گیا لیکن نمبر کی اشاعت کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مضمون موصول ہوا جو ذیل میں بصد افتخار شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

معیت و رفاقت...... مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی سامنے آتے ہی اپنے باہمی تعلقات کی وہ پوری تاریخ ایک دم سامنے آ گئی جس میں اس احقر اور مفتی صاحب نے ایک طویل عرصہ گزارا ہے۔

مفتی صاحب سے جیسی معیت احقر کو شروع سے حاصل رہی، ویسی کسی دوسرے ہم درس و ہم سبق کے ساتھ نہیں رہی، یہ رفاقت رسمی اور ظاہری نہ تھی بلکہ حقیقی اور معنوی تھی جس کی قدر و قیمت اس مخلصانہ تعلق سے بیش از بیش ترقی پذیر رہی جس کا تسلسل برس ہا برس قائم رہا۔ یہی وجہ ہے کہ مفتی صاحب کے انتقال مکانی سے احقر کو جتنا ملال اور رنج پہنچا شاید کسی اور کے جانے سے طبیعت اتنی متاثر نہیں ہوئی حتی کہ اپنے مکان میں بیٹھ کر بہت دیر تک آنسوؤں سے روتا رہا۔ گھر والوں نے گھبرا کر پوچھا کہ آج کیا کوئی حادثہ اہم پیش آ گیا ہے جو خلاف عادت اتنے گریہ و بکا کا سبب بن گیا ہے؟ تب مفتی صاحب کے فراق کا یہ سبب کھلا۔

رفاقت تعلیم...... ابتدائی تعلیم میں ہم دونوں ہم درس و رفیق رہے، آپ کے والد بزرگوار حضرت مولانا محمد یاسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ فارسی کے مسلمہ استاذ و قطب عالم حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے متوسلین میں سے تھے۔ ان کے یہاں فارسی کی تعلیم ایک ساتھ ہوئی، پھر اس سے اوپر کی عربی تعلیم شروع ہوئی تو اس میں بھی وہی میرے مستقل رفیق درس تھے، تعلیم جن اساتذہ سے پائی وہ بھی مشترک ہی تھے، اساتذہ کی غیر معمولی عنایات و توجہات میں بھی ہم دونوں شریک رہے...... عارف باللہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، عالم ربانی حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور محدث وقت حضرت الاستاذ الاکبر مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور استاذ المعقولات حضرت مولانا رسول خان صاحب، حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب اور حضرت علامہ

ابراہیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسے اساطین علم خوش بختی سے ہمیں ملے ، اس طرح آغاز تعلیم سے لے کر تکمیل تک حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تعلیمی اور تدریسی رفاقت مسلسل رہی ۔ یادنہیں پڑتا کہ اس رفاقت ومعیت میں کبھی کوئی فکری وذہنی انقطاع رونما ہوا ہو ..... اگر چہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علمی مصروفیات اور مشاغل علم میں مسابقت ، ان کے کسی ہم درس ورفیق کے بس کی بات نہ تھی ، وہ اس میدان میں سب سے آگے تھے ۔

رفاقت تدریس ..... تعلیمی دور ختم ہو جانے پر بھی یہ رفاقت اس شکل میں برقرار رہی کہ فراغت کے بعد دونوں ہی کو دارالعلوم کی خدمت انجام دینے کا ایک ساتھ ہی موقعہ ملا ، احقر کا اولاً تدریس سے اور ثانیاً انتظامی امور سے تعلق ہوا ، اور مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اولاً تدریس سے اور ثانیاً افتاء سے تعلق ہوا ۔

رفاقت سلوک ..... پھر یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ مسترشدانہ تعلق میں بھی یہ اشتراک وتوافق سامنے آیا کہ ہم ... خانقاہ امدادیہ کے حاضر باش اور فیوض اشرفیہ کے خوشہ چین بنے ۔ اور اس میں بھی معیت ورفاقت اس درجہ رہی کہ حضرت مرشد تھانوی نور اللہ مرقدہ' کی عنایات وافاضات ہم دونوں پر مسلسل مبذول رہیں ۔ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر مقامات طے کرتے چلے گئے ، احقر دارالعلوم کی انتظامی ذمہ داریوں کے سبب اس راہ سلوک میں اتنا تیز رو نہ بن سکا ، گو حضرت مرشد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ یہ فرما کر تسلی بھی فرمادیا کرتے تھے کہ ان مشاغل میں نیت مجاہدے کی کرلی جائے ۔ تو اس میں وہی ثمرات مرتب ہوں گے جو ذکر شغل پر ہوتے ہیں بلکہ اس سے زیادہ ، لیکن بہر حال وہ طبعی مشغلہ علمی ہمہ وقت بروئے کار نہ رہ سکا ۔ تاہم حضرت مفتی صاحب مرحوم سے باطنی رفاقت ہمہ وقت میسر رہی جو ایک طویل مدت پر مشتمل ہے ۔

رفاقت خدمت ..... جب احقر کو نیابت اہتمام کے بعد اہتمام کی مرکزی اور بنیادی ذمہ داری اکابر کی طرف سے تفویض فرمائی گئی تو مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنے رسوخ فی العلم اور تفقہ فی الدین کی بناء پر صدارت افتاء تک جا پہنچے جو دارالعلوم کے ممتاز مناصب اور اعلیٰ ترین اعزازات میں شمار کیا جاتا ہے ۔ اور ممدوح رحمۃ اللہ علیہ جب یہاں سے پاکستان تشریف لے گئے تو وہاں بیٹھ کر بھی افتاء وتفقہ پر جتنا کام تن تنہا انہوں نے کیا در حقیقت وہ ایک جماعت کا کام تھا جو تنہا ایک فرد نے انجام دیا ، حتی کہ اپنی ان خدمات کی بدولت رائے عامہ نے آپ کو ’’مفتی اعظم پاکستان‘‘ کا لقب عطا کیا جو یقیناً ان کے شایان شان تھا ۔

میری جب کبھی بھی پاکستان حاضری ہوتی تو مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ ملاقات میں پہل فرماتے ۔ اور اپنے قائم کردہ دارالعلوم شرافی گوٹھ کورنگی میں لے جانا اور علمی جلسے اور مجالس منعقد کرنا ایک لازمی بات تھی ، خود ان جلسوں میں شریک رہتے اور مجھ پر تقریر کا اصرار فرما کر تقریر سنتے اور غیر معمولی طور پر محظوظ محسوس ہوتے تھے ۔

یہ تو اپنے راست تعلق کی باتیں تھیں جو سینے میں محفوظ ہیں اور سینے سے سفینے پر قلم برداشتہ آگئیں ، لیکن حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقام بزرگوں کی نگاہ میں کیا تھا اس کی نوعیت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت مولانا

مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اخیر عمر کے فتاویٰ کی ایک خاصی تعداد ایسی تھی جن پر وہ نظر ثانی نہیں فرما سکے تھے، ان کی وفات کے بعد حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے فتاویٰ پر نظر ثانی کے لیے حضرت مفتی صاحب (مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ) ہی کا انتخاب کیا تھا، اس سے ان کی دقت نظر اور تفقہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی انہی خصوصیات نے ہم عمروں میں انہیں ایک ممتاز مقام عطا کیا تھا۔

ان کی زندگی کا آخری شاہکار "تفسیر معارف القرآن" ہے یہ ایک ایسی عظیم ورفیع قرآنی خدمت ہے، اگر مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ صرف یہی ایک خدمت انجام دیتے تو ان کی عظمت ورفعت اور عند اللہ مقبولیت کے لیے کافی تھا۔ لیکن اس کے علاوہ ان کی ہر علمی خدمت اپنی جگہ اتنی اہم اور نفع بخش ہے کہ عوام وخواص اس سے مستغنی نہیں رہ سکتے اور ہر اہل علم مفتی صاحب کی علمی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے پر مجبور ہے۔

غرض دار العلوم دیو بند کے مکمل ترجمان، علمائے حق کی سچی نشانی اور خانقاہ تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے قابل فخر نمائندے تھے، ان کی وفات سے نہ صرف پاکستان کے صف اول کے علمائے دیو بند میں ایک زبردست خلا پیدا ہوگیا بلکہ خود دار العلوم دیو بند کے لیے یہ ایک ایسا صدمہ ہے جسے وہ بالخصوص ایسے موقعہ پر شدت سے محسوس کرتا ہے جب کہ وہ اپنے اجلاس صد سالہ اور تقریب دستار بندی کے اہتمام میں مصروف ہے، جس میں مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسی شخصیت کی شرکت اجلاس کو چار چاند لگادیتی، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اس اجلاس کا بہت انتظار تھا اور بڑے شوق وجذبہ سے اس میں شرکت کے لیے آمادہ تھے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جدائی کا تعلق تو یقیناً مرتے دم تک رہے گا، البتہ جو بات قابل رشک اور لائق اطمینان ہے وہ یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لائق اخلاف چھوڑے ہیں۔ بلاشبہ مولانا محمد تقی عثمانی اور مولانا محمد رفیع عثمانی واخوانہم سلمہم اللہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زندہ کارنامے ہیں جو الولد سر لابیہ کے صحیح مصداق ہیں۔ جنہیں مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی نسبی جانشینی کے ساتھ علمی وراثت بھی بجا طور پر اس طرح منتقل فرمائی کہ ان شاء اللہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات کا شجر طوبیٰ زیادہ سے زیادہ برگ وبار لائے گا اور ارباب علم وفضل اس کی گھنی چھاؤں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔ احقر اس وقت بیرونی سفر کے لیے پابرکاب ہے، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت علم وفضل اور خدمات پر روشنی ڈالنے کا موقعہ نہیں۔ دفعۃً ذہن پر جو یاد کی پرچھائیں آئیں، وہ قلم بند کردیں، ورنہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ:

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم کا مصداق ہوتا!

رَحِمَهُ اللّٰهُ رَحْمَةً وَّاسِعَةً

والسلام: حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ (مہتمم دار العلوم دیو بند)

(۲۷ رجب ۱۳۹۹ھ)

حضرت لاہوریؒ کی علمی یادگار مدرسہ قاسم العلوم لاہور میں
حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب کی تشریف آوری

(ابن منظور کے قلم سے)

۲۴/اپریل ۷۴ء، پیر کا دن مدرسہ قاسم العلوم کے لیے ایک خوشگوار اور پر بہار دن تھا جو اپنے جلو میں مسرتوں اور خوشیوں کو سمیٹ لایا، راقم ایک کام کے سلسلہ میں مدیر خدام الدین کی معیت میں جب دفتر خدام الدین پہنچا تو پردۂ ساعت سے ایک خوش کن خبر ٹکرائی کہ آج خانوادہ قاسمی کے چشم و چراغ، علم وفضل کے روشن مینار ایشیا کی عظیم اسلامی یونیورسٹی کے سربراہ جناب قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند بلند بخت سے ملنے اور اس ادارہ کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازنے کے لیے پہنچ رہے ہیں، یہ سنتے ہی عقل وشعور کے پردوں میں مسرت وانبساط کی ایک لہر دوڑ گئی، افسردگی شگفتگی میں بدل گئی۔

ابھی آنے والے پرکیفیت لمحات کا تصور ہی کر رہا تھا کہ جناب قاری صاحب آ پہنچے، چہرے پر نظر پڑتے ہی بے تاب نگاہوں نے اپنی تشنگی سیرابی میں بدلتے دیکھی، دل حزیں نے اپنے پہلو میں شبنم کی سی ٹھنڈک محسوس کی، جانشین شیخ التفسیر حضرت مولانا عبید اللہ انور، مدیر خدام الدین اور سابق مدیر ''تبصرہ'' مرزا جانباز اور دیگر حضرات نے آپ کو خوش آمدید کہا، اس موقعہ پر حضرت انور نے آپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس پیرانہ سالی میں آپ کا ورود مسعود ہمارے لیے باعث افتخار ہے، اللہ تعالیٰ آپ کا سایۂ عاطفت تادیر ہمارے سروں پر رکھے۔

محفل میں شریک ہر چہرہ شاداں اور ہر دل فرحاں دکھائی دے رہا تھا۔ آخر کیوں نہ ہو جبکہ ان کی نگاہوں کے سامنے اکابر واسلاف کی آخری نشانی حضرت قاسم العلوم والخیرات کے کاروان حیات کا آخری راہی شہیدان بالاکوٹ کے لشکر کا ایک عظیم سپاہی جلوہ افروز تھا، جو حقائق و معارف کی تعبیر اور شرافت و بزرگی کی تصویر بنے بیٹھا تھا، ملفوظات طیبات سننے کے لیے ہر ایک ہمہ تن متوجہ تھا، نجانے یہ سعادت بے پایاں اور یہ ساعت درافشاں پھر نصیب ہو کہ نہ ہو۔

دوران گفتگو جب مرد مجاہد حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ عقیدت وانس کا تذکرہ ہوا تو حضرت انور نے اپنا ایک چشم دید واقعہ سنایا جو حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کا قاری صاحب سے محبت والفت کا مظہر اور خود حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی حق گوئی و بے باکی کا ایک بین ثبوت ہے۔ جانشین شیخ التفسیر یوں گویا ہوئے کہ

پہل پہل حکومت پاکستان نے سی آئی ڈی کی ضبط پورٹنگ کی وجہ سے قاری صاحب کو یہاں آنے کی اجازت نہ دی، صورت حال کا علم جب والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ہوا تو باوجودیکہ والد صاحب جو کبھی حاکموں کی رہگذر کے قریب بھی جانا گوارا نہیں کرتے تھے۔ فوراً حاکم پنجاب فیروز خان نون کے پاس پہنچے، ملاقات ہوئی مقصد کا اظہار کیا، فیروز خان لیت ولعل کرنے لے۔ تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ قاری صاحب کی آمد سے کوئی گڑ بڑ نہ ہوگی، بفرض محال ایسا ہوا بھی تو احمد علی جیل کی صعوبت جھیلنے کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دے گا، چنانچہ اجازت دے دی گئی اور دوسرے روز قاری صاحب ہمارے مہمان تھے۔

مولانا کہنے لگے کہ اس دوران ایک پریشان کن واقعہ ہوا، ہوا یوں کہ فیروز خان نون کی ایک بیوی انگریز تھی جو اسلامی طرز معاشرت سے ناواقف تھی، فیروز خان نون نے جب تعارف کرایا تو اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہاتھ روکے رکھا تو وہ سخت چیں بچیں ہوئی۔ لیکن فیروز خان نون نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ہدایت پر اسے انگریزی میں سمجھایا تو وہ کہنے لگی مجھے غصہ تو بہت آیا مگر یہ جان کر کہ یہ اسلام کے پاکیزہ اصولوں میں سے ایک اصول ہے بہت خوشی ہوئی اور آپ کی احسان مند ہوں وگرنہ اس سے قبل کسی مسلمان نے میری رہنمائی نہیں کی،

کتنے عظیم تھے وہ لوگ جن کی وجہ سے حق وصداقت کے چراغ روشن رہے، جو شاہ وگدائی کی تمیز سے ناواقف اظہار حق میں کوئی باک اور کسی مصلحت کا شکار نہ ہوتے تھے، الغرض تقریباً ایک گھنٹے کی یہ پروقار اور سدا بہار تقریب سعید چائے کے گرم گرم گھونٹوں اور مٹھائی کے شیریں لقموں پر ختم ہوئی اور وہ محفل جو کچھ دیر پہلے ابرار وانوار سے معمور اور علم وحکمت کے موتیوں سے لبریز تھی پل کی پل میں سونی ہوگئی۔

تم کیا گئے رونق بہار گئی

دارالعلوم رحیمیہ ملتان کے بارے میں

حضرت محترم صدر دارالعلوم کراچی کے تاثرات وارشادات

نَحۡمَدُهٗ وَنُصَلِّيۡ عَلٰى رَسُوۡلِهِ الۡكَرِيۡمِ .

مدرسہ دارالعلوم رحیمیہ ملتان، (پیر کالونی ا) میں آج حاضری تو پہلی بار ہوئی۔اور یہاں ایک عظیم اجتماع سے جو مدرسہ کے احاطے میں منعقد کیا گیا تھا خطاب کا بھی موقع ملا، لیکن اس بابرکت مدرسہ سے ناچیز بہت پہلے سے غائبانہ واقفیت رکھتا ہے کیوں کہ اس دارالعلوم کے بانی و مہتمم جناب قاری محمد ادریس ہیں جو میرے استاذ محترم شیخ القراء حضرت مولانا قاری رحیم بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید ہونے کے علاوہ میرے بہت ہی کرم فرما بزرگ حضرت مولانا محمد شفیع صاحب (ہوشیار پوری) رحمۃ اللہ علیہ کے ہونہار صاحبزادے ہیں جو دارالعلوم کراچی میں ناچیز کے ساتھ تقریباً بیس سال تک درس نظامی کے درجہ عالیہ کے استاذ رہے ہیں۔

مدرسہ دارالعلوم رحیمیہ کے ہونہار بانی و مہتمم جناب قاری محمد ادریس صاحب (ہوشیار پوری) اوران کا گھرانہ خاص طور پر خدمت قرآن کا ایک والہانہ انداز رکھتا ہے۔ان کی ہمشیرہ نے دارالعلوم کراچی میں برس ہابرس کی محنت وخدمت سے حافظات وقاریات کی ایک بڑی کھیپ ایسی تیار کردی ہے کہ کراچی میں جگہ جگہ انہوں نے مکاتب قرآنیہ اپنے گھروں میں قائم کرلیے ہیں۔اور دارالعلوم کراچی کے مدرسۃ البنات میں بھی ایسی کئی حافظات وقاریات تدریس کی باقاعدہ خدمت انجام دے رہی ہیں۔

مدرسہ دارالعلوم رحیمیہ ماشاء اللہ اب تقریباً دو برس سے ایک بہت بڑے رقبۂ زمین میں منتقل ہوگیا ہے جو بارہ کنال سے زیادہ ہے یہاں طلبہ وطالبات کی الگ الگ تعلیم قرآن کریم حفظ وناظرہ کا نہایت معیاری کام شیخ القراء حضرت قاری رحیم بخش صاحب رحمۃ اللہ کے طرز پر ہورہا ہے تقریباً ۵۸۰ طلبہ وطالبات حفظ قرآن باتجوید کی تکمیل کرکے فارغ ہوچکے ہیں (۸ھ میں تکمیل کرنے والے ۱۰۷ طلباء کرام کو شامل کرنے کے بعد کل تعداد بفضلہٖ تعالیٰ ۶۸۷) ہوجاتی ہے اس وقت اس مدرسے اوراس کی شاخوں میں تقریباً ۶۷۵ طلباء وطالبات قرآن کریم ناظرہ وحفظ کی تعلیم سے فیضیاب ہورہے ہیں جن میں سے ۲۱۵ طلبہ مدرسہ دارالعلوم رحیمیہ کے دارالطلبہ میں مقیم ہیں ان کے قیام وطعام کا مفت انتظام اہل خیر کے مالی تعاون سے اللہ تعالیٰ کرارہے ہیں۔

دوسال سے اس دارالعلوم میں درس نظامی کے ابتدائی درجات کی تعلیم بھی بحمد اللہ شروع ہوگئی ہے جس میں

اس وقت ساٹھ طلبہ زیر تعلیم ہیں اور ان سب کے قیام وطعام کا انتظام بھی احاطہ مدرسہ میں موجود ہے۔ اساتذہ اور معلمات کی تعداد سترہ ہے۔ ماہانہ خرچ کا اوسط تعمیرات کے علاوہ تقریباً ایک لاکھ پچیس ہزار روپے ہے جو زکوٰۃ وصدقات اور عطیات سے ہوتا ہے۔ تعمیرات کا سلسلہ بھی جاری ہے جس میں ابھی بہت کام کرنا ہے۔

ضرورت ہے کہ اس عظیم مدرسے کے ساتھ اہل خیر دل کھول کر اتنے بڑے پیمانے پر تعاون فرمائیں کہ اس دارالعلوم کی تعمیرات کی ضروریات بھی تیز رفتاری سے پوری ہوسکیں اور طلبہ وطالبات کی تعداد میں بھی اضافہ برابر جاری رکھا جاسکے۔

ترسیل زر کے لیے: قاری محمد ادریس ہوشیار پوری غفرلہٗ

مدیر دارالعلوم رحیمیہ پیر کالونی نمبر ا سورج کنڈ روڈ۔ ک شاہ عباس ملتان

نیشنل بنک ٹمبر مارکیٹ اکاؤنٹ نمبر ۵/۷/۱۵۲ املتان شہر۔

محمد رفیع عثمانی

۱۴۱۸/۶/۶ھ

کلام

از حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

نبی اکرم ﷺ، شفیع اعظم ﷺ دکھے دلوں کا پیام لے لو
تمام دنیا کے ہم ستائے کھڑے ہوئے ہیں سلام لے لو
قدم قدم پر ہے خوف رہزن زمین میں بھی دشمن، فلک بھی دشمن
زمانہ ہم سے ہوا ہے بدظن، تمہیں محبت سے کام لے لو
شکستہ کشتی ہے تیز دھارا، نظر سے روپوش ہے کنارا
نہیں کوئی ناخدا ہمارا خبر تو عالی مقام ﷺ لے لو
کبھی تقاضا وفا کا ہم سے کبھی مذاق جفا ہے ہم سے
تمام دنیا خفا ہے ہم سے خبر تو خیر الانام ﷺ لے لو
یہ کیسی منزل پہ آگئے ہیں نہ کوئی اپنا نہ ہم کسی کے
تم اپنے دامن میں آج آقا ﷺ امام اپنے غلام لے لو
یہ دل میں ارماں ہے اپنے طیبؔ مزار اقدس پہ جا کے ایک دن سناؤں
ان ﷺ کو میں حال دل کا، کہوں میں ان سے سلام لے لو

حضرت حکیم الاسلام کی یہ وہ نعت پاک ہے جو انہوں نے اپنی وفات سے چند روز پیشتر کہی اور ان کے تکیہ کے نیچے سے ملی۔